بلوچی زبان وادب
کی تاریخ
(ایک جائزہ)
سیّد ہاشمی

بلوچی زبان و ادب کی تاریخ

(ایک جائزہ)

سید ظہور شاہ ہاشمی

ناشر
سید ہاشمی اکیڈمی
لیاری کراچی

نام کتاب ــــــــــ بلوچی زبان و ادب کی تاریخ
مصنّف ــــــــــ سید ظہور شاہ ہاشمی
صفحات ــــــــــ ۳۶۸
بارِ اول ــــــــــ ۱۹۸۶ء
تعداد ــــــــــ ایک ہزار ۱۰۰۰
مطبع ــــــــــ المخزن پرنٹرز کراچی
ناشر ــــــــــ سید ھاشمی اکیڈمی کراچی
قیمت ــــــــــ ۶۵/ روپے

ڈیجیٹل ورژن کا منصف ـــ ایم۔ وائے۔ ایم۔ بی

سرورق:۔ سید احمد شاہ سندھی

فہرست عنوانات

تعارف

سید ظہور شاہ ہاشمی کا شمار بلوچی کے صفِ اول کے شعراء اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی بلوچی زبان و ادب کی نذر کی۔ انہیں اپنی صحت سے زیادہ بلوچی زبان کا خیال رہتا۔

سید ظہور شاہ بلوچستانی ساحل کی مشہور بندرگاہ گوادر میں ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد شاہ ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی کیونکہ ان کے والد خود باسواد اور علم دوست تھے۔ ان کی وجہ سے سید ہاشمی نے فارسی پڑھی اور انہیں فارسی ادبیات سے لگاؤ پیدا ہوا۔ ازاں بعد انہوں نے گوادر کے سعدیہ اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اُن دنوں گوادر سلطان مسقط کی عملداری میں تھا اسکول میں عربی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی، اس لئے سید ظہور شاہ کو فارسی کے ساتھ عربی زبان پر بھی دسترس حاصل ہوئی۔

سید ظہور شاہ لکھتے ہیں کہ انہیں ان کے والد کی وجہ سے حافظ، سعدی اور اقبال کو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس ذوق کی وجہ سے سید ادبیات کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء یعنی تیرہ چودہ سال کی عمر میں اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی۔

سید بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے اور ذہانت نے انہیں ادیب بنایا۔ سید نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔

گوادر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ظہور شاہ کراچی گئے تاکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ وہاں انہوں نے مزید تعلیم کے لئے کوشش بھی کی۔

انگریزی پڑھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔ انہوں نے انگریزی بھی سیکھ لی مگر مالی مشکلات کی بناء پر روزگار کے لیئے وہ ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی نے بلوچی زبان میں نشریات کا آغاز کیا تو سید ظہور شاہ ہاشمی اس ادارہ سے منسلک ہو گئے۔ اس ادارہ کے بلوچی شعبہ میں کام کرنے سے سید کا ادبی ذوق دوچند ہوا۔ انہی دنوں بلوچ ادیبوں نے ایک ادبی حلقہ ترتیب دیا۔ یہ حلقہ بلوچی مشاعروں کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ یہ سنہ ۱۹۵۰ء کا زمانہ تھا۔ سید ظہور شاہ ہاشمی نے کسی بلوچی مشاعرہ کے لیئے اپنی پہلی بلوچی نظم لکھدی۔ اپنی پہلی ہی نظم پر سیّد نے کہنہ مشق بلوچ شعراء سے داد لی۔ اور یوں وہ بحیثیت شاعر کے مسلّم ہو گئے۔ اس مشاعرے کے بعد انہیں بلوچی شاعری سے کچھ ایسی محبّت ہو گئی کہ انہوں نے کسی اور زبان میں شعر کہنے کو بلوچی سے بے انصافی جانا۔ ساتھ ہی انہوں نے کلاسیکل بلوچی شاعری کا مطالعہ کیا اور بلوچی زبان و ادب کی ترقی کے لیئے جدّ و جہد کا آغاز کیا۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں دیگر بلوچ شعراء اور ادیبوں کے ہمراہ سید ظہور شاہ نے "بلوچی زبان ءِ سرچمگ" (بلوچی زبان کا سرچشمہ) کے نام سے ایک ادبی انجمن کو منظم کیا۔ سید ہاشمی اس انجمن کے کام میں نہایت انہماک سے مصروف ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں وہ اور بلوچی کے ایک اور مقتدر ادیب عبدالصمد امیری انجمن کو متعارف کرانے اور ترقی دینے کے لیئے بلوچستان کے دورے پر نکلے۔ انہوں نے انجمن کے لئے فنڈ جمع کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس دورے میں اگرچہ زیادہ فنڈ جمع نہ ہوا، مگر ان حضرات کو بلوچی زبان و ادب کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں اور بلوچستان کے طول و عرض میں بلوچ ادیبوں اور شعراء سے شناسائی حاصل ہوئی۔ کراچی

لوٹ جانے کے بعد بدقسمتی سے انجمن کے کارکنوں میں شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ ان اختلافات سے سیّد صاحب بددل ہوئے اور انہوں نے کراچی کو ترک کرکے خلیج کے ممالک کا رُخ کیا۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں سیّد ظہور شاہ ہاشمی دق کے نامراد مرض میں مبتلا ہوئے اور بحرین میں ان کے کئی اپریشن ہوئے۔ لیکن بلوچی ادب سے انہیں کچھ ایسا عشق ہوگیا تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی وہ ہمہ وقت بلوچی کی خدمت میں لگے رہے۔

سید ظہور شاہ نے اپنی عمر کا خاصا حصہ خلیج کے ممالک میں گزارا، جہاں انہیں عربی، فارسی اور انگریزی ادب کے مطالعہ کا مزید موقع ملا۔ سیّد نے عربی زبان میں مہارت حاصل کی۔ سیّد دن رات مطالعہ کرتے اور بلوچی ادب پر کام کرتے۔ انہی ایام میں سیّد نے ایرانی بلوچستان کا بھی دورہ کیا۔ ایرانی بلوچستان کے شعراء اور شاعری کے بارے میں انہیں زیادہ معلومات حاصل ہوئیں۔ ان معلومات کا اظہار سیّد نے زیر نظر کتاب میں جا بجا کیا ہے ۱۹۵۶ء سے سیّد کی وفات تک دق اور جگر کی بیماریوں نے ظہور شاہ ہاشمی کو صحت مند ہونے نہیں دیا۔ سیّد دائم المرض ہوگئے۔ لیکن اس تکلیف کے باوجود سیّد ایک لمحہ کے لئے بھی بلوچی کی خدمت سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس سیّد کی نگارشات اور تخلیقات میں وافر اضافہ ہوا۔ اور سید کی ادبی تحقیق و جستجو روز بروز بڑھتی گئیں۔

سیّد ظہور شاہ ہاشمی نے زندگی کے ہر موقعہ سے استفادہ کیا اور بلوچی زبان وادب کی ترقی اور اپنے علمی ذخیرہ کو مالامال کرنے کے لئے بے حد کوشش کی۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے دوران انہوں نے برّصغیر کی کلاسیکی موسیقی کا بہ غور مطالعہ کیا۔

سید صاحب اپنی ذات میں خود انجمن تھے، ایک علمی ادارہ تھے اور آخر کار انہوں نے اپنی تخلیقات کو کتابی شکل دینے اور انہیں بلوچ ادیبوں اور عوام کے آگے پیش کرنا شروع کیا۔ وہ کام جو "بلوچی سرچمگ" کے ادیب ملکر نہ کرسکے، سید ظہور شاہ ہاشمی نے نہایت ہی عمدگی اور اعلیٰ پیمانہ پر کر دکھایا۔

"سستگیں دستونک" سید ظہور شاہ ہاشمی کی پہلی کتاب ہے، جو سب سے پہلے شائع ہوئی۔ یہ سید کی پروز پوئیٹری (PROSE POETRY) یعنی نثری شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ سید نے پہلی مرتبہ اس جدید فن کو بلوچی ادب میں روشناس کرایا۔ ازاں بعد سید نے اپنے اشعار کے تین مجموعے یکے بعد دیگرے چھپوائے۔ یہ مجموعے "انگرو ترونگل"، "ترا پچکیں ترمپ" اور "بزنگلیں ہیر" ہیں۔

سید ظہور شاہ نے بلوچی کے گراں مایہ کلاسیکل ذخیروں کو ابتداء ہی سے سمیٹنا شروع کیا تھا۔ انہوں نے قدیم شاعروں کا اچھا خاصا سرمایہ جمع کیا تھا۔ اس کے علاوہ سید نے بلوچی الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر کے بلوچی کی ایک ضخیم ڈکشنری ترتیب دی ہے جو "سید گنج" کے نام سے کراچی کی "سید ہاشمی اکیڈمی" کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔ بلوچی زبان کی یہ ایک اور بے مثال خدمت ہے جسے سید نے اکیلے سرانجام دی ہے۔ تنہا یہی کام سید کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں ایک جرمن ڈاکٹر جاہن سٹراسر جو آسٹریلیا کے رہنے والے تھے، بلوچی پر کام کرنے کے لئے پاکستان آئے، انہوں نے اس تمام علاقے کا کئی مرتبہ دورہ کیا جہاں بلوچی بولی جاتی ہے۔ پاکستان کے علاوہ ڈاکٹر سٹراسر نے ایران اور افغانستان کا بھی دورہ کیا۔ اور تقریباً تمام

بلوچ ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ بلوچوں میں بہت مقبول ہوئے اور بلوچستان میں وہ "جوان خان" کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ سید سے کئی مرتبہ ملے۔ میری بھی اس جرمن ڈاکٹر سے کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ اور وہ ایک ماہ ہمارے گاؤں میں بھی رہے۔ وہ بلوچی پر بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر جاہن سٹراسر ہندوستان کے مشہور تعلیمی وتحقیقی مرکز دکن کالج گئے۔ یہ کالج پونا میں واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے وہاں بلایا تاکہ مل کر بلوچی پر کام کیا جاسکے۔ میں نہیں جاسکا تو انہوں نے خلیج سے سید ظہور شاہ ہاشمی کو بلا بھیجا۔ سید تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر این، ایس شکلا سے ہوئی۔ سید ظہور شاہ ہاشمی نے زیر نظر کتاب میں اس ہندوستانی ماہر لسانیات کی تعریف کی ہے، جن سے انہوں نے اوستائی زبانوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل کیں۔ بدقسمتی سے سید شدید بیمار ہوئے اور ان کی بیماری کی وجہ سے ان کے کام میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

سید ظہور شاہ ہاشمی پندرہ برس کے بعد ۱۹۷۰ء کو دوبارہ وارد کراچی ہوئے۔ کراچی آکر انہوں نے شادی کر لی۔ کراچی میں انہوں نے بدستور انہماک سے بلوچی پر کام جاری رکھا۔ جو سرمایہ انہوں نے تحریری صورت میں اور ذہن میں جمع کیا ہوا تھا ترتیب دینا شروع کیا۔ بلوچی میں پہلا ناولٹ "نازک" کے نام سے شائع کیا۔ "سید گنج" کو ترتیب دیا اور کئی اور کتابوں کے مسودوں کو تیار کیا، جن میں زیر نظر کتاب بھی شامل تھی۔ لیکن اس دوران ان کی بیماری نے بھی شدت اختیار کر لی تھی۔ مگر سید اس سے گھبرائے نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی ان سے بے وفائی کرنے لگی تھی۔ لہذا انہوں نے اور تیزی سے کام

کرنا شروع کر دیا۔ زیرِ نظر کتاب " بلوچی زبان و ادب کی تاریخ "
ان کی انہی ایام کی تالیف ہے

بالآخر وہ منحوس لمحہ بھی آن پہنچا۔ جب سید ۳، مارچ ۱۹۷۸ء
کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ انہیں کراچی کے میوہ شاہ قبرستان
میں دفن کیا گیا۔

" بلوچی زبان و ادب کی تاریخ " بلوچی زبان و ادب کا ایک مختصر جائزہ
ہے۔ اسے بلوچی زبان و ادب کی تاریخ کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا
سید ظہور شاہ ہاشمی ہر لحاظ سے اس قابل تھے کہ وہ بلوچی زبان و ادب
کی تاریخ لکھتے۔ درحقیقت یہ کام انہی کے بس کا تھا۔ مگر انہوں نے یہ کام
اس وقت شروع کیا تھا جب ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ زیرِ نظر کتاب
انہوں نے مختلف اوقات میں لکھی ہے اس لئے اس میں تسلسل اور ربط نہیں
اور تکرار زیادہ ہے۔ بیماری کی وجہ سے سید کی طبیعت میں تلون زیادہ تھی
جو اس صبر طلب کام کے لئے موزوں نہیں تھی۔ کتاب میں سید نے جا بجا
وعدۂ فرداکر کے موضوع کو ٹال دیا ہے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے
اس پر جا بجا وہ بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں، ان کی اس بے اطمینانی
کے اظہار پر دکھ ہوتا ہے۔ کاش! سید ظہور شاہ ہاشمی زندہ ہوتے، صحتمند
ہوتے اور بلوچی زبان و ادب کی مفصل تاریخ لکھ دیتے!

زیرِ نظر کتاب میں سید ظہور شاہ نے بلوچی زبان و ادب کے تقریباً
تمام مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے کی بڑی اہمیت ہے اور
اکثر قابلِ قبول بھی۔ تاہم بعض جگہ سید صاحب کا اپروچ (APPROACH) موضوعی
ہے۔ وہ اپنی اس موضوعی رائے کو بڑی شدت سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس کے

خلاف رائے رکھنے والے کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ بلوچی زبان کی تاریخ ابتداء اور قدامت کے بارے میں سید کا مطالعہ وافر و وسیع ہے۔ بلوچی زبان سے بے پناہ محبت نے انہیں موضوعیت پسند بنا دیا ہے۔ چنانچہ ان کی یہ رائے کہ ہخامنشی شہنشاہ بلوچ تھے اور نقش رستم اور بیہستون کے کتبے بلوچی زبان میں ہیں ناقص معلوم ہوتی ہے۔ آج علمی اور سائنسی دور میں ایسی رائے کا اظہار کرنا مناسب نہیں۔ بلوچی زبان کی قدامت اور عظمت کو اس طرح ثابت کرنا غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تاہم بلوچی کی اوستا اور پہلوی سے مماثلت اور قربت تسلیم شدہ ہے۔ نقش رستم اور بیہستون کی تحریروں میں بلوچی الفاظ کی دریافت بلوچ محققین کو ان تحریروں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اوستا، فارسی قدیم اور پہلوی کے مطالعہ کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ بلوچ اسکالروں میں سید ظہور شاہ ہاشمی پہلے محقق ہیں جنہوں نے بلوچی اور اوستا کے رشتہ کو اس طرح واضح کیا ہے۔ انہوں نے ہماری بڑی رہنمائی کی ہے۔ سید صاحب کی بلوچی کی قدامت اور ایرانی زبانوں سے قربت پر بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر بلوچی زبان، ادب اور خود بلوچ عوام کی تاریخ کے بارے میں حقائق تلاش کرنا مطلوب ہو تو ایسے محققین کو ایرانی عوام اور ایرانی زبانوں کی تاریخ کے مطالعہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ایران ہی وہ سرزمین ہے جہاں بلوچ اور بلوچی کے بارے میں بہتر حقائق معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اس بارے میں سید صاحب نے یوں لکھا ہے :-

"جس طرح برصغیر اور اس کے مجاور سرزمینوں کی متعدد اقوام کی زبانوں کا مصدر و منبع سنسکرت ہے، ٹھیک اسی طرح موجودہ ایران اور اس کی ہم حدود کئی ممالک و اقوام کی زبانوں کا منبع و مصدر اوستائی ہے اور جتنی زبانیں اوستائی سے نکلی ہوئی ہیں، ان میں سے نزدیک ترین مقام

بلوچی اور پہلوی کا ہے ۔ جن کی قدامت صرف اوستائی زبان کے مقابلے میں ثانوی ہے ۔"

بلوچی کی قدیم شاعری کے بارے میں سیّد ہاشمی صاحب کی معلومات اور ان کا مطالعہ بے مثال ہے ۔ انہوں نے اس قدیم شاعری کی خصوصیات کو بہتر پیرایہ میں بیان کیا ہے ۔ اس بارہ میں ان کی رائے مستند ہے ۔ سیّد ظہور شاہ کو بلوچی کی قدیم شاعری کی اہمیت کا بہت احساس تھا ۔ انہوں نے اس اہمیت کا اظہار یوں کیا ہے :۔

" یہ میرا ایمان ہے کہ بلوچی جدید شاعری کے ارتقاء اور نمو کیلئے بلوچی قدیم شاعری ہی واحد لابدی ہے ۔ اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ موجودہ جدید شاعری میں کامیاب ترین شعراء وہ ہیں جنہوں نے بلوچی قدیم شاعری سے پورا فائدہ اٹھایا اور جن شعراء نے اس سے اجتناب کیا وہ آج تک ہاتھ پاؤں مارتے نظر آئیں گے ۔"

زیر نظر کتاب کے مطالعے سے سیّد صاحب کی بلوچی لوک شاعری سے دلچسپی اور اس کا بغور مطالعہ کرنے کا پتہ چلتا ہے ۔ سیّد صاحب نے بلوچی لوک گیتوں کا نہایت انہماک سے مطالعہ کیا ہے ۔ بلوچی زہیریگ، موتک، نازینک، سپت وغیرہ کے بارے میں سیّد صاحب نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور ان اصنافِ سخن کی بہتر طریقہ سے وضاحت کی ہے ۔ کتاب میں ان کے بہترین نمونے دئے گئے ہیں اور ان کے جو ترجمے کئے گئے ہیں وہ بہترین ہیں اور ایسے ترجمے سیّد صاحب ہی کر سکتے ہیں ۔

کراچی کے چند قدردان بلوچ شعراء اور ادباء نے سیّد ظہور شاہ ہاشمی کی جو قدردانی کی ہے، اس سے ان کی پختگیٔ شعور اور بلوچی زبان و ادب سے

دلی محبّت کا پتہ چلتا ہے۔ ان حضرات نے سیّد صاحب کی وفات کے فوراً بعد سیّد ہاشمی اکیڈمی قائم کی اور سیّد ظہور شاہ ہاشمی کے ان تمام نگارشات، مخطوطات، مسودات اور مواد کو حاصل کر لیا جو اب تک شائع نہیں ہو سکے تھے۔ اکیڈمی نے قائم ہوتے ہی سیّد ظہور شاہ ہاشمی کی تصنیفات کو چھاپنے کا کام سنبھال لیا ہے۔ "برمش" (آہٹ) کے نام سے ایک سوئنیئر شائع کیا ہے جو بلوچی ادب کی تاریخ میں یادگار رہے۔ اسی طرح کا دوسرا سوئنیئر "سنج" (قوس قزح) کے نام سے شائع کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ "سید گنج" (بلوچی ڈکشنری) اور سیّد صاحب کی دیگر تخلیقات کی اشاعت کا کام بھی جاری ہے

سیّد ہاشمی اکیڈمی کے منتظمین جو علم دوست اور پختہ کار بلوچ شاعر وادیب ہیں، کی خدمات کی جس قدر تعریف کی جائے اور ان کی جس قدر حوصلہ افزائی کی جائے وہ اس کے لائق ہیں۔ یقیناً یہ خدمات بلوچی زبان وادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

عبداللہ جان جمالدینی
صدر شعبۂ بلوچی
بلوچستان یونیورسٹی۔ کوئٹہ

۱۷/ ۱۲/ ۱۹۸۴

تمہید

کسی حقیقت پسند نے کیا دل نشین بات کہی ہے کہ زبان
انسان کے لئے اتنی ہی ضروری بلکہ لابدّ منہا چیز ہے جتنا کہ زندگی کے لئے سانس
لینا، البتہ سانس لینے کو اوّلیت ضرور حاصل ہے۔ انسان کیا بلکہ ہر ذی رُوح کو
سانس لینے کے لئے ہوا کی جتنی ضرورت ہوتی ہے بالتّالی اس کو اپنے احساسات و جذبات
کے اظہار کے لئے آواز کی اتنی ہی اشد ضرورت ہے۔ اس لاکھوں یا کروڑوں بار کہی ہوئی
حقیقت کو بار بار دُہرانا اگرچہ مُضحک یا غیر ضروری سا لگتا ہے مگر کہنا ہی پڑتا ہے کہ
"انسان حیوانِ ناطق کہلاتا ہے۔" اور یہ نام بھی اس جنس حیوان نے اپنے لئے خود
منتخب کیا ہے" یعنی انسان بھی حیوان ہے۔" اور انسانی زندگی کی ابتدا بھی حیوانی زندگی
سی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک درندہ، چرندہ یا پرندہ پیدا ہونے کے بعد صرف چند مخصوص
آوازوں کی مدد سے اپنی خوشی اور دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح ایک
انسانی بچّہ بھی کسی غیر انسانی بچّے سے مختلف نہیں ہوتا۔ انسان کا بچّہ ٹھیک اُسی طرح
اپنے احساسات کا اظہار رونے اور ہنسنے سے کرتا ہے جس طرح ایک بلّی کا بچّہ بھوک یا کسی
اور ضرورت کا اظہار دردناک آواز یا خوشی کا اظہار نرم اور مترنّم آوازوں سے کرتا ہے
جس طرح آئندہ چل کر بلّی کا بچہ ان تمام مختلف سُر کی آوازیں سیکھ جاتا ہے جو یقیناً قدرت
کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں نہ کہ صرف اپنی ماں کی آواز سُن کر اُن کو دُہرانا شروع کر دیتا ہے
اُسی طرح انسان کا بچہ آگے چل کر قدرت کی طرف سے انعام شدہ اُسی انجانی طاقت کے
بل بوتے پر آہستہ آہستہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انسانی بچے کو بات

کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں خود انسان یعنی بچے کی ماں باپ کی خواہش اور محنت کو دخل ہے لیکن میں قطعی طور پر اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ البتہ ابوالکلام آزاد کے بقول یہ شان ربوبیت ہے کہ انسانی یا حیوانی بچّہ پیدا ہوتے ہی جس طرح سانس لینا جانتا ہے اسی طرح ماں کے تھن کو چوسنا بھی اس کو آتا ہے۔ ورنہ ماں تو صرف یہ کر سکتی ہے کہ تھن کو بچے کے منہ میں زبردستی ٹھونس دے۔ لیکن بچے کو اس کے چوسنے کی تعلیم کیسے اور کون دے سکتا ہے۔ حیوان کے بچے کو تو ماں کے تھن ڈھونڈنے پر بھی ایک غیر مرئی طاقت مجبور یا ہدایت کرتی ہے۔ اسطرح اگر کسی انسانی بچے کو الگ تھلگ رکھا جاتے تب بھی وہ جتنا بڑا ہوتا جاتے گا اُس کو گھٹنے چلنا اور پھر اُٹھ کھڑے ہو کر چلنے میں وہی قدرتی طاقت ہدایت کرتی ہے۔ اُسی طرح اگر اُس بچے کو کوئی بات کرنا بھی نہ سکھاتے تب بھی قدرت کی طرف سے ودیعت شدہ طاقت، کے حسب ہدایت اپنے اظہارِ جذبات کے لئے کسی نہ کسی طرح آوازیں نکالنا شروع کر دیتا ہی ہے۔

دو تین مہینے کی عمر میں بچے کے منہ سے "اگو، غوں، غاؤں، گاؤں" کی آوازیں بہت صاف نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ اور اس قسم کی دوسری آوازیں کسی جانور کے بچے کے منہ سے نہیں سُنی جا سکتی ہیں۔ انسان اور جانوروں کے منہ کی ساخت اور ان کی زبان قطع و برید کے لحاظ سے مختلف ہیں ہی۔ بندر کے منہ کی ساخت و برید ذرا انسانی منہ سے ملتی ہے اور اُس کے منہ سے "خوخو" یا "کوکو" جیسی آوازیں سُنی جا سکتی ہیں۔ پھر چھ ایک مہینے کے بعد بچے کے منہ سے خود بخود لاشعوری طور پر اماں، ابا اور اس قسم کی دوسری آوازیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ خود اکیلا ایک طویل موضوعِ بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ——

زبان کی ابتداء اور نمو

زبان کی ابتداء اور نمو کے بارے میں اگرچہ لوگ اِس سے قبل مختلف تقالید و عقائد پر مبنی مفروضوں کے قائل تھے۔

لیکن یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ زبان کو انسان سے وہی تعلق، وہی رابطہ اور وہی علاقہ ہے جو اس کی باقی ضروریات زندگی کو ہے۔ جب تک انسان ان مخصوص انفرادی زندگی بسر کرنے والے چند ایک حیوانوں کی طرح رہتا تھا (حیوانوں میں انفرادیت پسند کم اور اجتماع پسند زیادہ ہیں) تو اس وقت حیوانوں ہی کی طرح چند آوازیں ضرورت کے مطابق نکالتا تھا لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اس اکیلے پن کے معنے یہ تو ہرگز نہیں کہ ہر فرد قطعی طور پر اکیلا رہتا تھا۔ کیونکہ جوڑے ہونا تو ہر حالت میں ضروری ہے۔ چونکہ انسان میں ہر قسم کی آواز نکالنے کی استعداد موجود ہے اس لئے اس جوڑے نے بھی اسی استعداد سے کام لے کر ایک دوسرے کو سمجھانے یا کچھ بتانے کے لئے مخصوص آوازیں نکالنا شروع کیں چونکہ انسان ذی عقل ہے اس لئے اس محدود اجتماعی یا جوڑے والی انفرادی زندگی میں بھی اپنے مافی الضمیر کو آوازوں سے ادا کرتا ہی تھا اس لئے اس نے ہر چیز کا ایک نام اور ہر کام کے لئے ایک لفظ کی ایجاد شروع کی جو ابتداء میں اکثر فطری آوازوں کی صحیح ترجمانی کرتے تھے۔ ابتدائی اور فطری ناموں میں اکثر فطرت کی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً انگریزی کا "RAIN" عربی کا "مطر" بلوچی کا "ھور" فارسی کا باریدن، بارش "ہندی کا "ورش" برسات" پشتو کا "باران" ان سب الفاظ میں "ر" موجود ہے اور اس "ر" کی آواز بوندوں کے گرنے کی آواز کی فطری نمائندگی کرتی ہے۔ ایک اور لفظ "جاؤ" "گو" (go)، زاؤ، برو، روح، بو" مختلف زبانوں میں وہی "جاؤ" کے معنوں میں ہیں۔ ان میں "و" یا "او" فطری آواز کی سب الفاظ میں نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ نہیں کرنا ہے کہ انسان کی زبانوں کے سارے الفاظ ایسے ہی ہوں گے۔ اگرچہ کچھ علماء زبان اس حقیقت سے بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آوازیں جن کو ہم فطرت کی نقل کہتے ہیں سراسر واہمہ ہے لیکن ہم اس کی مخالفت پر مجبور ہیں کیونکہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی کئی نئے الفاظ بنانے میں ہم یا تو فطری یا لغوی اور معنوی لحاظ سے مستفید ہوتے ہیں۔ آج کی

۷۔ سائنسی دُنیا میں جس طرح ہم ایک نیا نام بنانے سے پہلے اس شے کی اصلیت، ماہیت عمل اور رنگت بلکہ تصویر اور حالت پر بھی نظر رکھ کر ایک بامعنی نام رکھ دیتے ہیں اسی طرح اس وقت کے انسان نے اشیاء کی رنگت آواز یا عمل کے پیشِ نظر نام رکھ لئے تھے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر چیز کا نام اُس کی آواز یا رنگت پر رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی غیر قابلِ انکار ہے کہ زبان کا ایک بہت ہی بڑا حصہ رنگ و بو، آواز و ہیئت یا حالت والے ناموں سے بھرا پڑا ہے۔ جانی ہوئی تاریخ سے لے کر آج تک تو ہم یہی دیکھتے آرہے ہیں کہ ہر نئی چیز کا نام اس کی آواز، رنگت، ڈھانچہ، ھیئت اور صفت پر محمول ہے آج کل سائنسی ایجادات کے نام ایسے رکھے ہوئے ہیں مثلاً راکٹ، ریڈیو، بائیسکل، موٹر سائیکل، ایروپلین، جیٹ اور ٹیلیویژن۔ ان میں سے کوئی ایسا نام نہیں جو کسی دوسری چیز کے نام سے مستعار یا مرکب نہ ہو۔ ان میں وہی صفات موجود ہیں جو ان ناموں والی چیزوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہی بات ہمیں ان ناموں میں ملے گی جو درخت، گھاس، جانور یا دوسری ایسی چیزوں سے انجانے وقت سے منسوب ہیں۔ حتیٰ کہ خود انسان نے اپنے نام بھی نباتات، جمادات اور حیوانات کے ناموں پر رکھے ہوئے ہیں۔

۸ جب انسانی جوڑے ترقی کر کے خاندانی شکل اختیار کر گئے تو خاندان کا تحفظ ضروری سمجھا گیا اور ضروریات کے مطابق الفاظ گڑھ لئے گئے۔ خاندانوں کے تحفظ کے سلسلے میں ایکدوسرے کی اعانت کی ضرورت پیدا ہوگئی تو دو مختلف خاندانوں کے اتحاد نے دونوں خاندانوں کے ذخیرۂ الفاظ کو وسیع تر کر دیا یعنی جب تک یہ دونوں خاندان علیحدہ تھے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ انفرادی صورت میں اشیاء و افعال کے لئے جو جو الفاظ ایجاد کئے تھے وہ انہوں نے ایکدوسرے کو سمجھادئے۔ ان الفاظ میں کچھ ایسی فطری آوازیں تھیں جو باوجود اس کے کہ یہ دونوں خاندان علیحدہ تھے لیکن الفاظ تشابہہ رکھتے تھے مثلاً بابا، ابا، ابو، بابی، باپ، بپا، پپا، اور ماما، اماں، امی، مامی، ممی (اس میں

فطرت کا وہ کرشمہ عیاں ہے جو جانوروں میں عام ہے، افریقہ کے شیر کی دھاڑنے کی آواز وہی ہے جو ہندوستان کے جنگل میں رہنے والے شیر کی ہے۔ دوسرے وہ الفاظ میں جن میں ہم صدا فطری آواز موجود ہے لیکن متضاد اور مختلف دکھائی یا سنائی دیتے ہیں۔ ان خاندانوں کے ملاپ نے ان ایک ہی معنوں کے مختلف الفاظ کو ایکدوسرے روشناس کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فصیح و بلیغ زبان میں ایک چیز کے کئی نام ہونگے مثلاً عربی کے "ہیثر" اذھب، روح، اِمش۔ سب ایک ہی "جاؤ" کے معنی رکھتے ہیں۔ "جدار، حائط، سور" تینوں کے معنی "دیوار" کے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک ہی لفظ کے مختلف معانی بھی ہوں گے۔ اس کا بھی سبب یہی ہے کہ اگر ایک خاندان نے ایک چیز کے لئے ایک لفظ ایجاد کیا تھا تو دوسرا خاندان جو اس سے منقطع تھا اُس نے بھی اُسی لفظ کو کسی دوسری چیز کے لئے ایجاد کیا تھا اور جب یہ خاندان آپس میں مل گئے تو اس فرق یا اختلاف کے علم کے باوجود ہر ایک نے اپنے لفظ کو محفوظ رکھا اور ساتھ ساتھ دوسرے خاندان کے اُسی لفظ کے دوسرے معنے کو بھی قبول کر لیا مثلاً عربی کا لفظ "قدر" کے معانی ملاحظہ ہو۔ "کسی چیز کا مبلغ، اندازہ، طاقت، قوۃ، حُرمت، وقار، غنی، شانوں کا بالائی حصہ وغیرہ وغیرہ۔ دو خاندانی ملاپ کے بعد متعدد خاندانوں کے اتحاد کی ضرورت ہو گئی جس کے نتیجے پر باھمی ازدواجی رابطوں سے قبیلہ کی بنیاد رکھ دی گئی — لیکن اس کے باوجود ان مختلف افراد اور خاندانوں کی ایجاد و اختراع شدہ الفاظ کی حقیقت کھو نہ سکی۔ اور اسی بنیاد پر ہم ایک قوم کے مختلف قبائل اور ایک ہی قبیلے کے مختلف کنبوں اور خاندانوں میں آج تک یہ اختلاف الفاظ و معانی دیکھ سکتے ہیں جن کو ہم نے لہجوں یا ڈائیالکٹس کا نام دیا ہے۔ ہم بذات خود ہر اس زبان کو وسیع و فصیح و بلیغ سمجھتے ہیں جس میں یہ صفت ہو۔ اگرچہ ایک مکتب فکر کا نظریہ یہ ہے کہ اگر کسی زبان میں ایک ہی لفظ کے مختلف معانی ہوں تو

یہ اُس زبان کی تنگ دامنی ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس کے پاس اتنے الفاظ نہیں جو ہر ایک چیز یا کام کے لئے علیحدہ علیحدہ ایک ایک لفظ استعمال کرے لیکن ہم اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور اس صفت کو اس زبان کی فصاحت و بلاغت کہتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس تنگیٔ داماں کا شکوہ اس مکتبِ فکر کے لوگ کرتے ہیں اس کے برعکس جس ایک لفظ کے مختلف معانی ہونگے انہی معانی میں مختلف الفاظ بھی ان زبانوں میں موجود ہی تو ہیں۔ پھر دوسری طرف یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ان زبانوں میں ایک ایک چیز کے کتنے نام اور ایک کام کے لئے کتنے مختلف الفاظ بھی موجود ہیں۔ اور پھر جس ایک لفظ کے مختلف معانی ہوتے تو ان معانی کی حالتی، کرداری، موقعی، لغوی اور دیگر ایسی خصوصیات کو اگر دیکھا جاتے تو یہ سب اسی لفظ میں موجود ہوں گے۔ مثلاً عربی کا ایک لفظ "رجْع" ہے۔ اس کے معانی: خط کا جواب۔ برسات کے بعد پھر برسات۔ نفع۔ بہار کا سبزہ۔ گھوڑے کی لید۔ سیلاب سے متاثرہ علاقہ۔ کندھے کا نچلا حصہ اور گونج وغیرہ ہیں۔ ان معانی کو اگر غور سے دیکھا جاتے تو سب کے سب میں اُس لفظ "رجْع" کی اصلیت بھی پائی جاتی ہے یعنی "واپسی" اور "دوبارہ" جیسے معانی موجود ہیں۔

۵ زبان کی یہ نشو و نمو کب تکمیل تک پہنچ گئی ہے۔ یہ ہم کہہ نہیں سکتے لیکن اس کے نشو و نمو میں عمداً اور خصوصاً زبان ہی کی خدمت کے نظریہ کے مطابق کسی کا ہاتھ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کی ابتدا سے آج کے سائنسی زمانے کے آغاز تک زبان بالکل کسی شخصی یا اجتماعی سعی عمد کی منت پذیر کبھی نہ ہوئی تھی بلکہ خود بخود غیر محسوس صورت میں تکمیل پاتی رہی۔ ×

۶ جس زبان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ با معانی اور ہم معانی الفاظ کی کثرت کے علاوہ محاورات اور استعارات کی جتنی زیادہ بہتات ہوگی یہ اس کی قدامت اور فصاحت و بلاغت کی دلیل ہوگی۔

تو انسان کی زبان اپنی ضروریات کے پیشِ نظر خود انسان کی زندگی کے پہلو بہ پہلو

نشو و نمو پاتی رہی ۔ بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک انسان کی زبان نے کمال کی بلندی کو نہیں چھوا یعنی من حیث اللغۃ اس کی تکمیل نہ ہوتی اُس وقت تک وہ اپنے مالک یا قوم کو بھی بامِ عروج تک پہنچانے میں مخل رہی ۔ ×

زبان کی اہمیت

یہ صحیح ہے کہ جب تک انسان میں تاریخ ایسی چیز اور قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں سوچ وبچار کرنے کا احساس پیدا نہ ہوا اُس کو زبان کے بارے میں سوچنے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوتی ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو زبان کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں فکر لاحق نہیں ہوتی ۔ پھر اک دور ایسا آیا کہ ضروریات زندگی میں سے ایک ضرورت زبان کو رشتۂ تحریر میں پرونے کی ہوتی ۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام بول چال کی زبان سے ہٹ کر علمی اور ادبی زبانوں کی بنیاد قواعد و ضوابط کے تحت رکارڈ کی صورت میں احجار و الواح و الیاف یا قلوب میں محفوظ رکھنے کا سہرا اُن قادۃ الفکر کے سر ہے جن کو لادینی نظریہ کے مطابق مجذوبین و عباقرہ مگر مذھبی نکتہ نظر سے انبیاء و مرسلین کہا جاتا ہے جو دونوں صورتوں میں پھر وہی قدرت کی طرف سے ودیعت شدہ غیر محسوس اور غیر منظور یا غیر مرئی ہدایت کے رہین ہیں ۔ اس کا ثبوت انسانی تاریخ کے وہ بےمثال اور لازوال بلکہ کسی تصحیح و اصلاح سے بے نیاز مذہبی یا مذہب نما ٹھوس نظریات کے اصول و احکام و قوانین و براہین کے مجموعے ہیں جن کو ہم الہامی کتب مقدسہ کے نام سے جانتے ہیں ۔ اور پھر ہر ایسی کتاب یا مجموعہ زبان کی نکتۂ نظر سے اتنا مکمل اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہے کہ آج کا ستاروں پر کمند ڈالنے والے انسان کی ہر زبان طوعاً و کرہاً اُن ہی السنہ کے اصول و فصول میں مقید و محصور ہے ۔

الہامی کتب کے دوش بدوش انسانی ہر جذبے کی صحیح و مکمل و مشقی بلکہ بلیغ صورت میں ترجمانی کرنے والے غنی زبانوں کے عباقرہ، شعراء، ادباء، اور خطباء نے شعری، خطابتی یا کتابتی ادب کی صورت میں عمداً یا صدفتہً اپنی جداگانہ طرحِ فکر و نظر کے مطابق مضادۃً یا

ردو فارسی زبان میں ضخیم و قابلِ فخر ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے جن کی قدر و قیمت صحتِ زبان و فنِ سخن مکمل اور مستند اصول کے مطابق آج تک مسلّم ہے۔

پھر اک ایسا دَور آیا کہ حکمرانی اور انتظامِ مملکت میں سیف کی طرح قلم کی بھی اسی درجہ ضرورت محسوس ہوتی مگر سوائے معدودے چند فلاسفر و علماء کے کسی نے زبان کی حیثیت کو یہ درجہ نہ دیا کہ وہ کسی قوم یا مملکت کا بنیادی جواز بن سکے مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی تک دنیا کی مقتدر اور عالمگیر بادشاہتیں اور جہانگیر حکومتیں کسی غیر قوم کی زبان کو اپنانے میں فخر محسوس کرتی تھیں اور کئی ایک ایسی مملکتیں آج تک غیر اقوام کی زبان کی منّت پذیر ہیں۔

تسلّطِ زبان اور نتائج

یہاں یہ بات قابلِ تذکرہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ بات مشکل ہی سے ملتی ہے کہ کسی فاتح قوم نے مفتوح اقوام پر اپنی زبان جائز و ناجائز طور مسلط کرنے کی کوشش کی ہو۔ اگر ایسے ہوتا تو براعظم ایشیاء خصوصاً وسطی ایشیاء اور برصغیر میں فارسی زبان کے سوا کوئی اور زبان بولنے والا باقی نہ رہتا کیونکہ یہ علاقے پہلے ایرانی تاجداروں کے زیر نگیں رہے اور پھر مغلوں اور افغانوں نے انگریز کی آمد تک اس تمام علاقے پر کلّی یا جزوی طور پر اپنا تسلط جمائے رکھا۔ اگرچہ مغل یا دیگر فارسی زبان کے حکمرانوں کی درباری زبان ہر جگہ فارسی ہی رہی لیکن انہوں نے اپنے محکوم یا مفتوح علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کے خلاف کبھی بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا البتہ وہ خود چونکہ مقامی زبانوں سے نابلد تھے اس لئے ان کو اپنی زبان استعمال کرنا ہی پڑتی تھی اور لوگ اپنی مادی، معاشرتی اور دیگر ضروریات کے پیشِ نظر حاکم کی زبان کو سیکھنے اور اپنانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔

علاوہ ازیں مذہبی نکتہ اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف اور توجہ ہے جس کی بہترین مثال اسلام کی فتوحات اور زبانوں کے ساتھ سلوک ہے۔ اگر زبان ہی کسی مذہب یا ملت کی بنیاد ہوتی تو رسولِ اکرم لوگوں کو یہ درس ضرور دیتے کہ عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو مت

اسلامیہ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی ذمہ دار ہے اور اس سے روگردانی ملت اسلام سے روگردانی ہے اور چونکہ قرآن کریم بھی عربی زبان میں ہے اس لئے تمام اقوام مسلمہ کو اپنی اپنی زبانیں ترک کرکے صرف عربی سیکھنی چاہیئے لیکن رسول اکرم نے اس کے برعکس بجائے اس کے کہ عربی زبان کو دوسرو ںکے سر تھوپ دے الٹا عربوں کو یہ تلقین کی کہ دوسروں کی زبانیں سیکھ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں صرف عربستان ہی ایک علاقہ ہے جہاں عرب خود رہتے ہیں اور عربی زبان پر اپنی قومیت کی سالمیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

البتہ بعد میں جب یورپ والوں نے ساری دنیا پر یلغار کیا تو ان پر مذہبی جنون بھی سوار تھا یہی وجہ ہے کہ ان اقوام سے لوگ آج تک ناراض ہیں۔ یورپ والے اپنے سیاسی تسلط کے ساتھ اپنے مذہب کو بھی مشرقی اقوام پر مسلط کرنا چاہتے تھے حتیٰ کہ وہ اس سلسلے میں بدترین طرق کار استعمال کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ اس کی بدترین مثال پرتگالی حملہ آوروں کی تھی۔ جن کی ناکامی کا واحد سبب بھی یہی تھا۔ انگریزوں اور ولندیزی حکمرانوں نے پرتگال کی اس غلطی کو بھانپ کر ان سے بہتر اور بہت نرم اور بالواسطہ طریقہ استعمال کیا جو کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ جابر اقوام کے نقش قدم پر چلنے کی مذموم کوشش میں چند نازیبا اقوام ابھی تک مشغول ہیں جو بزعم خود اپنی زبان کے بل پر دوسری اقوام پر تسلط جمانے کی سعی میں منہمک ہیں جو یقیناً قابل صد نفرین ہے۔

ایسی ہی غیر فطری اور غیر انسانی نظریات پر عمل پیرا لوگوں کی وجہ سے اچھی خاصی اور مستحکم حکومتوں کے عوامی اعتماد کی صفوں میں انتشار پھیلنا شروع ہوگیا اور ہر ایسی مظلوم قوم اپنے اور اپنی زبان کے صحیح مقام کو برقرار رکھنے کے لئے کمر باندھ کر اجتہاد کے میدان میں کود پڑی۔

زبان نے تدریجاً اپنے بولنے والوں اور اپنی سرزمین پر اپنا جائز حق جتانے کی صلاحیت پیدا کرلی۔ اور زندگی کی اقدار و منازل مختلف پر اپنی قدر و منزلت کو اعلیٰ و ارفع ثابت

کرنے کے لئے مثبت قدم اُٹھانے کی جرآت کی۔ یہی وجہ ہے کہ علماء تاریخ و زبان کے علاوہ شہریاران و پیشوایانِ مملکت تک کو زبانِ عاجل کے آئینے میں ادوارِ آجلہ کی وہ دھندلی تصویر نظر آنے لگی جس کی واضح حقیقت، صاف و شفاف بلور کی طرح آلودگی سے منزہ دَورِ حاضر کی کئی ایک اقوام و ملل کی عہد آفریں اور تاریخ ساز زندۂ جاوید صورت میں ثابت ہوتی جا رہی ہے۔

اسی پیش بینی نے انسانی زندگی میں زبان کی اہمیت کو پہچان کر اُس کے غیر قابلِ گیرودار، سیلِ عزم کی قدرت بے پایاں کی حقیقت کے آگے سرِ تسلیم کرنے کی تیاری میں زبان کے علم و تاریخ اور احیاء و اجراء کے لئے کمر کس کر اجتہاد کا آغاز کیا تاکہ اچانک سدِ مارب کی سی کیفیت تک نہ پہنچیں۔

اس اجتہاد کے غیر منتقد مگر لامناص منہا ثانوی تائج اور لامعدی عنہا فرعی عواقب کے نتیجے پر اقوام و السنہ کی غیر مقہور لازم و ملزومیت کی تلخ حقیقت سے انکار کے تمام طُرق مسدود ہو کر رہ گئے اور بالآخر ہر قوم کے حقیقی مصدر اور ہر زبان کے صحیح منبع کی معرفت و درایت کے لئے ان اقوام و السنہ کے صحیح اور جائز مقام سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی جو گزشتہ کئی صدیوں سے خود ساختہ عالقہ کی مصنوعی زور و نیرو کے تحت جبراً و کرھاً غیر فطری گمنامی کے عمیق گڑھے میں مدفون تھیں۔

ان اقوام و السنۂ مظلومہ میں "بلوچ" قوم اور اس کی زبان "بلوچی" بھی ہیں جن کی حقیقت صدیوں سے غیر حقیقی اور غیر فطری اور بے بنیاد کذب و افتراء کے دبیز پردوں کی تاریک سلوٹوں میں چھپائی جاتی رہی ہے۔ اگر ان دبیز اور مصنوعی گھناؤنے پردوں کو چاک کر دیا جائے تو بلوچی زبان کے بارے میں ایسی حیرت انگیز حقائق سامنے آئیں گی جن کو دیکھ کر یا سُن کر بڑے بڑے ماہر لسانیات کو بھی تعجب ہوگا۔

بلوچی زبان کے الف با

بلوچی زبان کے الف با شاید دُنیا کی موجودہ زندہ

زبانوں میں سب سے کم ہیں البتہ فارسی ایک ایسی زبان ہے جس کے الفبا کی تعداد بلوچی سے بھی کم ہے یعنی صرف ۲۳ ہیں، جبکہ بلوچی کے ۲۵ ہیں۔ لیکن فارسی میں ایک "و" "ء" کو ایک حرف نہیں گنتے جبکہ بلوچی میں "ء" ایک حرف محسوب ہے۔ دوسری بات یہ کہ "ے" یا ی مجہول یا بڑی یا ء کے بجائے وہی معروف یا چھوٹی یائے مستعمل ہے۔ اگرچہ فارسی کتابوں میں ایسے کلمات کی بہتات ہے جن میں "ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق" کے حروف موجود ہیں لیکن غلط فہمی میں نہ پڑیئے گا کیونکہ ایسے تمام الفاظ غیر فارسی ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یہ تمام الفاظ عربی کے ہوں گے۔ البتہ "ق" کا حرف کچھ ترکی الاصل الفاظ میں اب بھی فارسی میں مستعمل ہے۔

اگرچہ رومن رسم الخط والی زبانوں میں ایسی بھی ہیں جن کے حروف زیادہ نہیں مگر پھر ان میں ضرورت کے مطابق نشان لگا کر یا مزید ایک حرف بڑھا کر ایک اور آواز کا حرف بنا دیتے ہیں مثلاً انگریزی CH - SH وغیرہ۔

رومن شدہ ترکی زبان کے اسی رومن رسم الخط کے حروف سے اگر ہم نشان زدہ حروف کو نکال دیں تو باقی صرف ۲۳ حروف رہ جائیں گے کیونکہ باقی چھ حروف انہی ۲۳ میں سے ہیں جن کے اوپر یا نیچے نشان لگا کر دوسرے حروف بنا دیتے گئے ہیں جیسے "o، u، i، c، g، s" کو نشان لگا کر "ç، ğ، ş، ö، ü، ı" بنا دیا گیا ہے۔ اگر اس بنیاد پر ہم اس عمل کو عربی رسم الخط والی زبانوں کے الفبا سے کریں تو حیرت انگیز کمی واقع ہو جائے گی۔ عربی رسم الخط کے اکثر حروف گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ہر ایک گروہ میں دو یا اس سے زیادہ حرف ہیں۔ ہر ایک گروہ کے تمام حروف کی بنیادی شکل بالکل ایک ہے اور ان کا فرق صرف نقطوں کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "ب" کے گروہ کی بنیادی شکل "ٮ" ہے اور اس شکل کو ہم نقطے لگا کر مختلف نام دیکر مختلف آوازوں کا نمائندہ کہیں گے۔ مثلاً "ب پ ٹ ت ث" اگر یہی عمل تمام الفبا پر بھی کیا جائے تو باقی صرف پندرہ حروف بلوچی کے رہ جائیں گے۔ بلوچی کے کل حروف یہ ہیں۔ "ا ب پ ت ٹ۔ ج چ۔ د ڈ۔ ر ڑ ز ژ

س ش ۔ ک گ ۔ ل م ن و ھ ۶ ی ے ۔"

اس سلسلے میں اس بات کی نشاندھی شاید دلچسپ ہوگی کہ پہلوی زبان کے الفبا کی تعداد صرف سولہ (۱۶) ہے۔ لیکن اس میں بڑا نقص یہ ہے ایک تو حروف علت کافی نہیں ہیں اور اکثر عربی رسم الخط کی طرح صرف حرف صحیح لکھ کر ہی اعراب لگے ہوئے الفاظ کی طرح پڑھے جائیں گے۔ مثلاً پہلوی کا لفظ ا 6 (تم) حرف "ا+6" یعنی "ن+م" ہے۔ اسی طرح راو (بند) جو "ر+ا-و" یعنی ب + ن + د سے مرکب ہے۔ یعنی عربی ہی کی طرح ماسوای "ا و ی" کے زبر زیر پیش نہیں لگتے۔ دوسرا بڑا نقص یہ ہے۔ پہلوی کا ایک ہی حرف دو سے چار مختلف آوازوں کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ مثلاً "لہ ا" کو ہم "رجن" اور "لجن" دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اوستائی زبان کے صرف حرف علت (دَاوِل) ۱۴ چودہ ہیں۔ اور دوسرے ۳۵ حروف صحیح یعنی کل تعداد ۴۹ ہے۔ (مسعودی جیسے مورخین نے وان کی تعداد ۶۰ ساٹھ تک بتادی ہے۔)

✓ دوسری خوبی بلوچی زبان کی یہ ہے کہ یہ زبان تذکیر و تانیث و تخنث، اور تنکیر و تعریف کے مخمصہ سے پاک ہے۔ (یہ صفت فارسی زبان میں بھی ہے۔) اس طرح بلوچی زبان میں "خ غ ق ع" جیسے مشکل مخارج والی آوازیں بھی نہیں ہیں۔ بلوچی کی تمام آوازیں ہونٹوں اور سر زبان سے ادا کی جاتی ہیں۔ علاوہ "ک، گ" کے جن کا مخرج وسط زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچی زبان کے نوآموز کو ابتدا ہی سے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

✓ آمدِ اسلام کے بعد عرب، اور عجم مورخین نے بلوچ قوم، اُس کی زبان اور تاریخ پر جو تحقیقات کی ہیں اور ان کے بعد انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے بعد یورپی مستشرقین نے اسی سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں، انکا بیشتر حصہ صداقت سے دور اور قابل اعتراض ہے البتہ ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ انھوں نے قابل قدر کام بھی کئے ہیں — پاکستان بن جانے کے بعد بھی کئی ایک ملکی صاحبانِ علم و دانش نے اس میدان میں اُتر کر شہسوار بننے کی کوشش کی ہے۔ لطف یہ ہے

کہ ان ملکی شہسواروں میں اکثر غیر بلوچ ہیں اور مزید برآں ان حضرات کو پاکستان میں رہتے ہوئے بھی بلوچی زبان کا ایک جملہ تک صحیح بولنا اور لکھنا نہیں آتا حالانکہ کئی ایک نے دس دس سال یا اس سے زائد بلوچستان میں گزارے ہیں اور یہی حضرات آج بلوچی زبان و ادب اور تاریخ پر سند ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں حالانکہ ان کی معلومات صرف سنی سنائی من گھڑت چیزوں پر منحصر ہیں جن کا پول بہ دیر یا زود کھل ہی جانے والا ہے۔ اس لئے چند ایک باتیں ضروری سمجھ کر یہاں لکھ دیتا ہوں۔

بلوچ

لفظ "بلوچ" پر کئی مشرقی اور مغربی علماء نے تحقیق کی کوشش کی ہے اور تقریباً ہر ایک نے لفظی مشابہت و مماثلت اور صوتی موافقت و مطابقت کی بنا پر اپنی اپنی علمیت، دانست اور جانکاری کے مطابق مختلف تاویلات و تشریحات کی ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں نے اس کو بابلی "بلیوس" یا "بل اوس" کہا ہے اور کسی نے "بلوص" کہا "بل اوس، بعل اوس، بعلوس" وغیرہ کو "بلوچ" کہنا تو محض احساس کمتری کا نتیجہ ہے یہ وہی احساس کمتری ہے جس نے عقیدت کا رنگ لے کر پھر بلوچوں کو عرب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (اس کے بارے اگلے صفحوں میں بحث ہوگی۔)

"بلوص" جو کہ خود لفظ "بلوچ" کا معرب ہے اس کو پھر "بلوچ" کے نام کا اصل ٹھہرانا کتنا بڑا ظلم ہوگا؟ عربوں میں "چ" کی آواز موجود نہیں اور جس لفظ میں یہ حرف ہوگا، عرب اس کو "ص"، "ش" یا "تش" سے تبدیل کرتے ہیں مثلاً چین، دارچینی، چک CHEQUE چائے، کراچی، چرچل، کے الفاظ کو وہ "صین، دارصین، صک، شای، کراتشی اور تشرشل" لکھتے اور کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے "بلوچ" کے لفظ کو سانسکرت کا "بل + اوچھا" یعنی بڑا طاقتور لکھا ہے۔ ایک اور صاحب نے اس کو "بلو + اوچ" یعنی "بڑا اونٹ" تحریر کیا ہے۔ مضحک بات یہ ہے کہ یہ حضرات "بلوچی" تاریخ، ادب، کلچر مزید برآں قوم سے متعلقہ تمام چیزوں کو چھوڑ صرف

اس لفظ کی صوتی ہم آہنگی کو موضوعِ تحقیق بناتے ہوتے ہیں۔ اگر اسطرح اس لفظ کو محض اس صوتی
ہم آہنگی کی بنا پر دنیا کی کسی بھی غیر بلوچی زبان کا حرف قرار دیا جانا ہی مقصد ہے تو لیجئے "بلوچ"
کا لفظ بنگلہ زبان کا "بھالو چھیہ" (اچھا ہے۔)، فارسی کا "بھاروس" فرانسیسی کا "بالیوس"
(پولٹیکل نمائندہ) انگریزی کا "بالس" Balas (بدخشاں لال) یا "بالسٹر"
Baluster (چھوٹا ستون) یا پھر فارسی کا "بالوس" یا "بالوش" یعنی کافور مغشوش، یا
"بالیوس" یعنی قندھار کا پرانا نام، "یا بلوس" یعنی چرب زبان وغیرہ۔ اس قسم کے بیسوں الفاظ
آریائی اور غیر آریائی زبانوں میں ملیں گے تو کیا یہ سب الفاظ اسی لفظ "بلوچ" کے مصادر و
منابع ہوں گے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ کسی صاحب خرد نے خود بلوچی زبان میں اس لفظ کو ڈھونڈنے
کی زحمت تک گوارہ نہ کی اور ان کی تلاش و تحقیق کی جگہ ہمیشہ غیر بلوچی زبان کی ڈکشنریاں رہیں۔

ایک اور صاحب نے اسی صوتی ہم آہنگی کی بنا پر حسب دستور اس دفعہ عبرانی کا لفظ بتایا
ہے اور عبرانی رسم الخط میں اس کو کچھ اس طرح "D731" لکھ کر عبرانی زبان کا "بلوچ" کہا
ہے۔ آگے جاکر وہ عبرانی ان القبا کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "عبرانی کا حرف "D" عربی کے
"ص" کے برابر ہے۔ اب یہاں یہ بات قابل اعتراض ہے۔ کیونکہ عربی "ص" کے برابر عبرانی کا
" Y " یا " Y " دونوں صحیح ہیں۔ جبکہ "عبرانی" D " عربی کے "س" کے ہم مانند ہے
البتہ وہ اور بات ہے کہ عربی کے "ث" کی آواز کے لئے بھی مستعمل ہو یا ممکن ہے کہ صاحب رائے
نے عبرانی " D " (س) کو عربی "ص" کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہی لفظ جو عبرانی
میں بلوچ بتایا گیا ہے اس کے الفبا میں بھی فرق ہے۔ عبرانی "ب ل وچ"، " Y7ל7 "
(بلوص) یا " D7ל7 " (بلوس) ہونا چاہیئے۔ جبکہ محترم نگارندہ نے اس لفظ کو
" D731 " لکھا ہے۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ممکن ہے کتابت ہی
کی خرابی یا کاتب خط کی غلطی سے حروف کی صورت بگڑ گئی ہو۔ لیکن ایسے مسائل کو حل کرنے کے
سلسلے میں زیادہ احتیاط برتنا ضروری ہے۔ کیونکہ انہی دو چار حروف پر ہی سارے مسئلہ کا دارومدار

ہوتا ہے جو سب سے بڑی دلیل کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر یہی حروف یا الفاظ خود ہی صحیح نہ لکھے جائیں تو مسئلہ کیسے حل ہو سکے گا۔ آگے چل کر اس مضمون میں دوسری جگہ اسی "بَلُوچ" کے لفظ کا عبرانی پھر روپ " D 3 7 J " اور تشریحات کے طور پر اس کے آگے یوں ب ل ص۔ ب ل خ " لکھا ہے۔ لیکن یہاں پھر بات نکلتی ہے کہ عبرانی میں لکھے ہوئے اس لفظ میں چار حروف ہیں جبکہ "ب ل ص" یا "ب ل خ" کے تین حروف ہیں۔ آگے چل کر پیغمبر سلیمان کے صحیفے سے ایک نشید عبرانی رسم الخط میں لکھا ہے۔ لیکن یہ اتنا گندہ لکھا ہوا ہے کہ کوئی ایک حرف بھی قابلِ خواندن نہیں ہے۔ جب تک رسم الخط کے حروف صاف نہ ہوں وہ کس طرح دلیل و برھان کی طرح استعمال ہو سکیں گے۔ مطلب یہ کہ یہ بھی اُسی صوتی ہم آہنگی کی بنیاد پر لفظ "بَلُوچ" کو کسی غیر بلوچی زبان اور رسم الخط میں ثابت کرنے کی کوشش ہے۔

جن جن معاجم و قوامیس میں اس لفظ کی تلاش کی گئی ہے ان میں زیادہ مستند لوگ "بُرھانِ قاطع" کو مانتے ہیں کیونکہ اس میں فارسی کے نہایت پرانے الفاظ کے علاوہ پازند، پہلوی اور اکاد کا اوستائی بھی موجود ہے جن میں بلوچی قدیم الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے چند ایک محققین نے بُرھان قاطع سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن متأسفانہ وہ شاید اسی ڈکشنری کی تشریحات کو نہ سمجھ سکے کیونکہ باوجودیکہ انہوں نے بُرھان قاطع کا حوالہ دیا ہے لیکن پھر بھی اسی لفظِ "بَلُوچ" کے معانی غلط لکھے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ " بُرھان قاطع میں بلوچ کے لفظ کے معنی تاجِ خروس کے ہیں ـــــ" اب ہم بھی "بُرھان قاطع" چاپ تہران (۱۳۴۱ ہجری شمسی) کا صفحہ ۴۱۷ کھول کر اسی لفظ "بَلُوچ" کے معانی دیکھتے ہیں۔ یہاں ہم "بُرھان قاطع" ہی کے الفاظ لکھتے ہیں اور قوسین میں اپنی طرف سے تشریحی کلمات لکھتے ہیں۔

" بلوچ = بضمّ اوّل و ثانی و سکون ثالث و جیم فارسی (یعنی: بُلُوچ) قومی باشند صحرائی دکم عقل و شجاع و علامتی را نیز گویند کہ بر تیزی طاق ایوان

نسب کُنند و نام ولایتی هم هست از ایران و تاجِ خروس را نیز گفته اند و آن گوشتی باشد که بر سر او رُسته است و پارچه گوشتی که بر ختنه گاہ زنان میباشد که بُریدن آن سُنت است ــــ"

ہمارا سب سے پہلا اعتراض خود" برُھان قاطع" پر ہے کیونکہ اُس نے لفظ" بلُوَچ" کے سامنے معنی بھی لکھے ہیں مگر اس میں کسی حد تک ہم اُن کو معاف کر سکتے ہیں کیونکہ یہ دونوں لفظ شکل و صورت اور ظاہری املا کے اعتبار سے ایک ہی جیسے ہیں اور صرف اعراب ان کے تلفظ میں فرق پیدا کر سکتا ہے۔ چونکہ عربی رسم الخط میں زبر زیر پیش لفظ میں باقی حروف کی طرح نہیں لکھے جاتے اس لئے جب تک کسی لفظ کی حقیقت، اصلیت اور معانی سے آگاہی نہ ہو وہ غلط پڑھا اور غلط لکھا جائے گا۔ اور جب ایک لفظ کو اس کی حقیقت سے لاعلمی کے باوجود اگر ڈکشنری، قاموس یا معجم میں لایا جائے تو اُس کے معانی بھی یقیناً غلط لکھے جائیں گے۔ صورتِ لفظی نے صاحبِ "برُھان قاطع" محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ بُرھان کو دھوکہ دیا ہے اور اس نے "بلُوچ" بھی "بَلُوَح" کے معنوں میں لیا ہے کیونکہ بغیر اعراب کے دونوں لفظ" بلوچ" ہی لکھے جاتے ہیں۔

"بلُوَچ قوم" کے معنوں کے علاوہ دوسرے معانی جو برُھان قاطع والے نے دیئے ہیں۔ وہ بالکل صحیح ہیں کیونکہ یہ لفظ" بلُوچ" بھی خود بلوچی زبان کا پُرانا لفظ ہے جس کا صحیح تلفظ "بُلّوچ" ہے جس کو فارسی والے "بُلوَچ" کہتے ہیں۔ بلوچی زبان میں آج تک اس کو "بلوچ بُلّگ، بُلّ" کہتے ہیں۔

مطلب یہ کہ یہاں" بُلوُچ" کے معنی صحیح دیئے گئے ہیں لیکن اس کو" بَلوَچ" (قوم) کے معنی دینا غلط ہے۔ تاجِ خروس وہی "بُلّوُچ" یا "بُلّوَچ" کے معنی ہیں۔ اور "برُھان قاطع" والے نے اپنی طرف سے صورت لفظی کے دھوکے میں آکر اس کو "بَلوَچ" (قوم) کے معنی بھی دیتے ہیں۔ البتہ تبریزی صاحب نے اس لفظ کی اعرابی تشریح لکھ کر کسی حد

تک اپنی دانست کے ساتھ اپنی لاعلمی کا بھی اعتراف نادانستہ طور پر ریکارڈ کرلیا ہے لیکن اس کے باوجود صاحبِ بُرھانِ قاطع بحیثیت ایک ڈکشنری کے مؤلف کے قابلِ مواخذہ ہے۔ مثلاً اگر اردو کی ڈکشنری کی تیاری میں "دِل" کے کلیدی لفظ کو باقاعدہ اعرابی تشریح کے ساتھ لکھنے کے باوجود اس کے سامنے "دُل" کے معانی بھی لکھ دیئے جائیں تو کیا اس کو محض اس لئے مان لیا جائے کہ ڈکشنری میں ایسا لکھا ہے؟

اسی طرح اس "برُھان قاطع" کے صفحہ ۹۶۲ پر ایک بار پھر "کوچ و بلوچ" کا لفظ ہم دیکھتے ہیں۔ صاحبِ برُھان قاطع نے یہاں دوبارہ اس لفظ کے تلفظ میں وہی غلطی کی ہے مگر یہاں معنی صحیح دئے ہیں کیونکہ یہاں یہ لفظ "کوچ" کے ساتھ آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اور معانی اس سے منسلک یا منسوب نہیں کئے جا سکتے۔ (کوچ کے بارے میں چند جملے آئندہ صفحات میں لکھے جائیں گے)

"بلوچ" قوم کے نام لفظِ "بلوُچ" کے بارے میں اتنی قیاس آرائیوں کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اگر بالفرض ہم ان مذکورہ موضوعہ اسماء مختلفہ میں سے کسی ایک نام کو "بلوُچ" قوم کا اصلی نام مان بھی جائیں تو کیا وہ اتنا مستند اور بامعنی ہو سکے گا کہ اس کے بعد کوئی شک وشبہ یا بے اطمینانی باقی نہیں رہے گی۔ یہ تمام مجوّزہ اسماء یا تو کسی دو لفظوں کا بامعنی مجموعہ ہیں اور یا کسی ایک شخصیت کا نام۔ اگر ان بے بنیاد قیاس آرائیوں کے ساتھ ہم ایک قیاسی رائے اور شامل کر کے یہ کہیں کہ "بلوُچ" قوم کے جدِامجد کا نام ہی "بلوُچ" تھا تو اس میں کونسی برائی ہو سکتی ہے یا کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے ویسے بھی آج تک بلوچوں میں یہ نام "بلوُچ" رائج ہے جن میں سے برصغیر میں انگریزی حکمرانوں کی آخری لڑائی میں مکران کے جنگِ گوک پروش کے شہید ہیرو میر بلوچ خان نوشیروانی سے کون واقف نہیں ہے۔ رہے اس لفظ کے معنی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل "بلوُچ" تھا جو کثرتِ استعمال سے عوامی

لہجوں میں یا ایرانی بولنے والوں کے لہجوں میں "بلوچ" بن گیا۔ بلوچی زبان کے کئی ایسے قدیم الفاظ ہیں جو اسطرح نقصی تلفظ کے ساتھ فارسی میں بھی متداول ہیں۔ مثلاً بلوچی کا "اُشتر، اِسپُر، اَبرشیم، اِسپیت، اِشتاپ" فارسی میں "شُتر، سِپر، برشیم، سپید اور شتاب" بن گئے ہیں۔

اسی طرح "ابلوچ" کا لفظ بھی ایرانیوں نے "بلوچ" تلفظ کرنا شروع کر دیا اور اسی مناسبت سے آج تک "بلوچ" رہ گیا ہے۔ چونکہ فارسی متعدد کتب قدیمہ میں یہ لفظ اسی شکل میں ملفوظ و مذکور ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ بلوچوں نے بھی اس کو اسی تلفظ میں اپنانا شروع کیا۔ (اسی طرح کی ایک اور تلخ حقیقت "بلوچی" کا لفظ ہے جس کے متعلق آئندہ سطور میں بات ہوگی۔) کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہی "ابلوچ" وہ لفظ ہے جس کے لئے اتنی تگ ودو جاری ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ لفظ "ابلوچ" ہی "بلوچ" کا اصلی نام ہے تو اس کے معنی کیا ہوں گے۔ اگرچہ ہماری نظر میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی خاص اسم کے کوئی معنی ضرور ہوں بہرحال اس سلسلے میں ہم کوشش کرکے دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اسی "برھان قاطع" ہی کی ورق گردانی کریں گے اور ہمیں یہ لفظ صفحہ ۵۷ پر ذیل کے معانی کے ساتھ اس طرح ملتا ہے۔

ابلوج ۔ بروزنِ مخلوج، قندِ سفید ابلوچ گویند بعضی شکر سفید و قند سودہ را گفتہ اند و با جیم فارسی (یعنی ابلوچ) ہم درست است۔

فرہنگ عمیدی (چاپ تہران سال ۱۳۴۲ خورشیدی) میں یہ لفظ صفحہ ۳۹ پر "آبلوج" اور "آبلوچ" لکھا ہے اور انہی معنوں میں مذکور ہے۔ میرے خیال میں یہ نام زیادہ قرین قیاس ہے۔ حتیٰ اس کے معانی میں بھی دو دیگر نام ابھی تک بلوچوں میں موجود ہیں۔ مثلاً "شکّل، شکر، نبات" بلوچی نام ہیں۔ ہاں یہ بھی یقینی ہے کہ بلوچوں کے جدِ امجد کا نام ہی "بلوج" یا "ابلوچ" تھا۔

اس سلسلے میں ہم دو باتیں اور بھی کہنا چاہتے ہیں جو اسی لفظ سے متعلق ہیں۔
کوئی شخص چاہے کتنا ہی لکھا پڑھا ہو لیکن جب تک وہ علم تدریس Teaching
اِلقا ۶ الکلام DICTION، فن الالفاظ یا علم اللغات LEXICOLOGY
سے واقف نہ ہو وہ کسی لفظ کے صحیح تلفظ کے بارے میں ہمیشہ غلطی کر سکتا ہے۔ خصوصاً
وہ لفظ جس کے مأخذ، منبع اور زبان کے بارے میں عدم علمیت یا محض قیاس آرائی
شامل ہو۔

۱ اگرچہ "بلوچ" قوم پیدائش ہی سے ایرانی اقوام کی ہمراہ ہے لیکن ایرانی اقوام کبھی
بھی بلوچی زبان پر حاوی نہ ہو سکیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال اکٹھا رہنے کے باوجود
آج تک وہ لفظِ "بلوچ" کے صحیح تلفظ ادا نہ کر سکیں۔ اور اس لفظِ "بلوّچ" کو ہمیشہ غلط
تلفظ کے ساتھ "بلُوچ" یا "بلوّچ" کہتی رہیں۔ اور آج تک یہی حال ہے۔ یہی حال افغانوں کا
ہے۔ اس کے بعد ہندوستان اور پاکستانی اقوام کی باری آتی ہے۔ یہ قابلِ افسوس حقیقت
ہے کہ پاک و ہند کے لوگ ابھی تک اس لفظ کا صحیح تلفظ نہیں جانتے۔ مثلاً پاکستان
میں رہنے والے اردو دان اور پنجابی اس لفظ کو ہمیشہ "بلَوچ" یا "بلّوچ" یا "بلوّچ"
کہتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔ اس لفظ کا صحیح تلفظ "بلوٗچ" ہے۔ یعنی اس کے حرفِ اوّل "ب"
پر زَبَر یا فتحہ ہے۔ تیسرا حرف واو مجہول ہے اور چوتھا حرف "چ" ساکن ہے۔ لیکن
دوسرا حرف "ل" کا تلفظ بلوچی اعراب پر مبنی ہے۔ اس "ل" پر زبر، زیر، پیش میں سے
کوئی اعراب نہیں۔ اگر زَبر ہوتا تو "لَو" زیر ہوتا تو "لِو" اور اگر پیش ہوتا تو "لُو" پڑھا
جاتا۔ اور اسی طرح اگر صرف واو مجہول سے مربوط ہوتا تو "لو" بروزن اردو "کو" پڑھا
جاتا۔ مگر یہ ان چاروں سے مختلف ہے اور اس پر بلوچی کا خاص اعرابی نشان "ٗ"
"معکوس پیش" لگتا ہے۔ اس نشان کے لگنے سے اس کی آواز انگریزی لفظ SOUP میں
"OU" جیسی ہوگی مگر "SOOP" میں "OO" جیسی بالکل نہیں۔ اردو میں اس کا

تلفظ کچھ یوں ہوگا "لُو+اُ" لیکن شرط یہ ہے کہ "لُو" جلدی سے "اُ" کے ساتھ ملاکر پڑھنا چاہیئے۔ اس کا رومن (BALŌCH) BALŌČ ہوگا۔ اس لفظ کو رومن میں ـــــ BALUCH، BALOCH اور BALOOCH لکھنا اور پڑھنا غلط ہے اس طرح "B" کے بعد "A" کی جگہ پر "E" لکھنا بھی سراسر غلط ہوگا۔ اوِستائی رسم الخط میں یہ بالکل صحیح یوں لکھا جائے گا۔ ۲ 3 1 (البتہ اوستائی رسم الخط میں "ل" کا حرف نہیں ہے۔ اور لام کے لئے "1" میری اختراع ہے۔ اگر کہیں اوِستا میں "ل" کی آواز کی ضرورت ہوتی ہے تو "ر" کا حرف اس کی جگہ پر استعمال ہوا ہے۔ یہی حال پہلوی کا ہے۔ اور اس حرف "ر" کی شکل بھی موجودہ عربی رسم الخط کے حرف "ر" اور "ل" دونوں سے ملتی ہے۔ مثلاً "۹"

اس سلسلے میں ہم ایک اور لفظ کی بھی تصحیح کرانا چاہتے ہیں۔ ہمارے غیر بلوچ بھائی، "بلوچ" قوم کے ایک فرد کو ہمیشہ "بلوچی" لکھتے اور کہتے ہیں جو قطعی غلط ہے ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ سندھی، پنجابی، ہندی، بنگالی زبانوں کے ناموں کے نہج پر "بلوچ" کو بھی "بلوچی" کہتے ہیں۔ مگر بلوچ کا مسئلہ ان سے مختلف ہے پنجابی، سندھی، ہندی یا بنگالی وغیرہ اقوام کو ان کے ملک کی نسبت سے ایسا کہتے ہیں۔ یعنی ملک کے نام کے ساتھ "ی" نسبتی لگاکر پنجاب سے پنجابی، سندھ سے سندھی اور بنگال سے بنگالی قوم کا نام بنادیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسے لگتا ہے کہ ان اقوام کی قومیت کا بنفسہ کوئی نام نہیں یہی وجہ ہے کہ جس سرزمین میں جو لوگ بس گئے اسی سرزمین کی حیثیت سے ان کی قوم کا نام رکھا گیا ہے لیکن "بلوچ" کا مسئلہ برعکس ہے۔ کیونکہ بلوچوں کی آمد سے پہلے اس خطۂ ارض کا نام بلوچستان نہیں تھا۔ بلکہ "بلوچ" قوم جہاں جاکر آباد ہوتی اس سرزمین کا نام ہی "بلوچ" کے نام کی نسبت سے "بلوچستان" ہو گیا۔ اس لئے "بلوچ" کو "بلوچی" کہنا سراسر غلط ہے۔

کیونکہ یہ لفظ "بلوچی" بلوچوں کی زبان کا نام ہے ۔

اس لفظ کو غلط پڑھنے، لکھنے اور بولنے کا جرم انگریزی دان طبقہ کے سر ہے کیونکہ شروع شروع میں مستشرقین نے بَلُوچ قوم کے متعلق علمی تحقیقات شروع کی تو انھوں نے بَلُوچ قوم کا نام اپنی کتابوں میں رومن تلفظ میں " BALOOCH BALOUCH ، BALUCH وغیرہ ضرور لکھا اس لفظ کو "بلوچی" کبھی نہیں لکھا۔ کیونکہ اس طرح پھر اس کے آخر میں انگریزی کا " ا " آجانا چاہیئے ۔ یہ انگریز مستشرقین "بَلُوچ" کو ایک فرد کے معنوں میں لے کر اس کی جمع لکھنے کی صورت میں اس کے آخر میں "ES" بڑھا کر " BALŌCHES " لکھدیتے تھے جو قاعدۃً از روی نحو (گرامر) بالکل صحیح ہے کیونکہ انگریزی کا ہر وہ لفظ جس کے آخر میں " CH " آتا ہے تو جمع کی صورت میں اسکے آخر میں " es " بڑھایا جاتا ہے مثلاً انگریزی کے LAUNCHES ، BENCHES COACHES ، MATCHES وغیرہ ۔ چنانچہ مسٹر ڈیمس نے اپنی کتاب ..... THE POPULAR POETRY OF BALOCHES کے نام میں جمع کی صورت میں ' BALOCHES ' لکھا ہے ۔ لیکن پڑھنے والوں نے اس کے بالکل صحیح نحوی ترکیب (GRAMMATICAL FORM) کو غلط تلفظ سے پڑھ کر " BALOCHIS " پڑھنا شروع کر دیا ۔ اور بعد میں انگریزوں کے صحیح تلفظ اور املا میں لکھے ہوئے لفظ کے تلفظ کے ساتھ اس کی املا تک کو غلط لکھنا شروع کر دیا۔ باوجود اعلیٰ تعلیم کے وہ اپنی اس غلطی کا آج تک احساس نہ کر سکے غیر بلوچوں کو چھوڑ دیتے خود انگریزی دان بَلُوچوں نے اس لفظ کو بغیر کسی احساس کے غلط لکھنا شروع کر دیا اور آج تک غلط لکھتے چلے آرہے ہیں ۔ یہی غلطی اس لفظ "بَلُوْچ" کو "بلوچی" لکھنے اور کہنے کی ذمہ دار ہے ۔ اس لئے یہ بات نوٹ کرنا اشد ضروری ہے کہ اس قوم کا نام صرف "بَلُوْچ" (BALOCH) ہے ۔ اس کو "بَلُوْچ" ، "بِلُوْچ" ، "بَلُوْچ" ، "بَلُوچ" ، "بِلُوْچ" ، لکھنا ، پڑھنا یا کہنا سراسر غلط ہے ۔ اسی طرح اس قوم کو یا اس کے کسی فرد کو "بلوچی" کہنا بھی غلط ہے ۔

"بلوچی" تو اس قوم کی زبان کا نام ہے۔ یعنی اس قوم کا نام بَلُوچ BALOCH
اس کی زبان کا نام "بَلُوچی" (BALŌCHI) اور ملک کا نام بَلُوچستان (BALŌCHESTAN) ہے۔

مکرانی

ایک اور مسئلہ "مکرانی" (MAKRĀNI) کا لفظ ہے۔ برصغیر میں ویسے تو بَلُوچ آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ مگران کی سب سے بڑی آبادی سندھ اور پنجاب میں ہے (ویسے مہاراشٹرا، یوپی، سی پی، کلکتہ، بنگلہ دیش وغیرہ جگہوں میں بھی کافی بلوچ آباد ہیں۔) جن میں اکثر اپنی زبان تک کھو چکے ہیں مگر سندھ میں ان بلوچوں کی آبادی قابلِ ذکر ہے جو ابھی تک اپنی زبان محفوظ رکھے ہوتے ہیں۔ ان میں وہ بلوچ بھی ہیں جو صدیوں سے یہاں آباد ہیں اور وہ بھی جو مری، بگٹی، لسبیلہ اور کوئٹہ سے آکر یہاں آباد ہوتے ہیں۔ جن میں سے بھاری اکثریت چاکری زمانے کے ہجرتی، استعماری، استشماری یا پھر ہمایونی واپسی کے عمل کا نتیجہ ہے۔ مگر انگریزی دور میں بلوچوں کے چند اور ہجرتی ریلوں کا بھی وہی نتیجہ نکلا۔ سب سے پہلے ہم سندھ کی بڑی بندرگاہ کراچی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے بقول یہ مسلّم ہے کہ یہ کراچی بھی بلوچستان ہی کا ایک حصہ تھا اور خوانین قلات تک کا اس پر اثر رہ چکا تھا یا ان کے زیر اقتدار۔ البتہ اس بات کی قبلاً تصدیق ہو چکی ہے کہ اس شہر کراچی کا نام دراصل "کلاچی" تھا جو ایک متمول بلوچ عورت مائی کلاچی سے منسوب ہے۔ مائی کلاچی اپنے زمانے کی مشہور و معروف و مالدار عورت تھی۔ جو میرجا کریا گوہرام کے قبیلوں یا صحیح الفاظ میں گھرانوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس مالدار عورت کے ہاں بھیڑ، بکریاں، گائے، بھینس اور اونٹ کے ریوڑ تھے۔ مائی کلاچی ان شیرزال عورتوں میں سے تھی جن کے نام آج تک بلوچی شعری ادب کا حصہ ہیں۔ جن کی وجہ سے بلوچی شعری ادب میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً سمّی، گوھر، بانڑی وغیرہ اگرچہ ان کی زندگی کے صرف وہی حصے ہمارے شعری

ادب میں مذکور ہیں جو قبائلی اختلاف کا باعث بنے۔

ایسی ہی شہزادیوں میں سے ایک مائی کُلاچی تھی جس کے نام کی نسبت سے اس شہر کراچی کا نام پہلے کُلاچی، پھر کُراچی اور کَراچی ہو کر آخر میں "کراچی" بن گیا۔ کراچی چونکہ سندھ کی ایک بندرگاہ تھی اس لئے سندھی زبان ہی کی وجہ سے "کُلاچی" کا لام (ل) تبدیل ہو کر "ر" بن گیا۔ اس کی مثال سندھی ادب میں واقعہ بیّنہ ہے۔ سندھی ادب کی پونجی شاہ لطیف کی شاعری ہے اور اس میں بَلوچ کا لفظ ہر جگہ "بروچ" لکھا گیا ہے۔ سندھی آج تک "بلوچ" "کو بروچ" کہتے ہیں۔ اسی طرح "کُلاچی" کا لفظ بھی پہلے کراچی اور پھر کراچی بن گیا۔ یہاں ہمارا مقصد اس پر بحث کرنا نہیں ہے بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہی کراچی ہی ایسی بندرگاہ تھی جہاں جہاز رانی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ یہاں پہلے کشتی اور بعد میں جہازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح بلوچستان کے ساحلی علاقوں سے کراچی کا باقاعدہ رابطہ قائم ہو گیا۔ خصوصاً گوادر اور چھبار کے ساتھ۔

1857ء کے بعد جب انگریز برصغیر پر پوری طرح مسلّط ہو گئے تو اس وقت وہ کوئٹہ اور قلات کے علاقوں میں پہلے ہی سے موجود تھے کیونکہ 1839ء میں انھوں نے قلات پر حملہ کیا تھا اور اس کے بعد بلوچستان کے جنوب مغربی علاقوں میں سرایت کر گئے۔ جس کا سب سے بڑا مقصد ہندوستان کو پرشین گلف کے علاقوں سے ٹیلیفون اور ٹیلیگراف لائنوں کے ذریعے منسلک کرنا تھا۔ جہاں گلف کی کتنی ایک ریاستیں انکے زیر تسلط تھیں اور ترکی سلطنت کی بربادی کا پروگرام بھی بنایا جا رہا تھا۔ اسی دوران بلوچستان کا وہ علاقہ جو اب ایرانی بلوچستان کہلاتا ہے انگریزوں سے روشناس ہوا۔ اس زمانے میں بھی اگرچہ ایرانی حکمران، بلوچستان کے اس سارے علاقے کو اپنی حکومت میں شمار کرتے تھے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ ان علاقوں پر کبھی بھی تسلّط نہ

جا سکے تھے اور اُس مغربی بلوچستان میں ہر جگہ چھوٹی بڑی خود مختار ریاستیں یا سرداریاں قائم تھیں۔ لیکن ان سرداروں نے کبھی اپنے مُلک یا اپنی رعایا کی بہبودی کی خاطر کوئی کام نہیں کیا تھا بلکہ آپس کی لڑائیوں ہی میں سارا وقت گنوا دیتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ رعایا پر ناقابلِ برداشت اور غیرانسانی ظلم وستم روا رکھتے تھے اگر ان بلوچ سرداروں کے ظلم کی داستانیں دہرائی جائیں تو تاریخِ عالم میں ان کی مثال مشکل ہی سے ملے۔

اور انہی ظلم وستم سے تنگ آکر لوگ جوق در جوق جلاوطنی پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ ایک طرف تو پرشین گلف کی ریاستوں اور مسقط عمان کی سلطنت کی طرف ہجرت کرتے تھے۔ جہاں صدیوں سے ان کی جالیات پہلے ہی سے آباد تھیں۔ اور دوسری طرف چھبار اور گوادر کے راستے کراچی کا رخ کرتے اور وہاں سے اندرونِ سندھ، راجواڑوں اور گجرات اور مہاراشٹر میں بمبئی تک پھیل جاتے۔ آج بھی پرشین گلف ریاستوں میں لاکھوں بلوچ آباد ہیں اور اسی طرح بمبئی میں ان کی آبادی ایک لاکھ سے اوپر پہنچ چکی ہے۔ ویسے تو کلکتہ میں بھی بلوچوں کی کافی آبادی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان بننے کے کافی سال بعد جس زمانے میں راجہ غضنفر علی ہندوستان میں پاکستان کے سفیر تھے تو جب، وہ کلکتہ گئے تو وہاں تقریباً ایک سو معزز بلوچوں نے ان کو استقبالیہ دیا تھا جس کا ذکر باقاعدہ کراچی کے روزناموں میں بھی شائع ہوا تھا۔

ان بلوچ مہاجروں کی ایک بڑی تعداد کراچی اور گرد ونواح کے علاقوں میں آکر آباد ہو گئی اور پھر جب پہلی جنگ عظیم کے بعد رضا شاہ پہلوی نے ایران کے شہنشاہ احمد شاہ قاچار کو معزول کر کے 1924-25 میں اپنی شہنشاھی کا اعلان کیا تو دوسرا نوشیروان بن کر بلوچستان پر ٹوٹ پڑا جس کی وجہ سے کچھ سردار تسلیم اور کچھ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ پہلے تو عوام نے آرام کا سانس لیا کہ ان جابر سرداروں

سے نجات مل گئی مگر سنگِ زرد برادرِ شغال، رضا شاہی حکومت نے بھی سرداروں کے جرم کے بدلے میں عوام پر مکافات کی صورت میں اور زیادہ ظلم و ستم روا رکھا جس سے بیزار اور پریشان ہو کر اس بدبخت قوم کی ایک بڑی تعداد پھر ایک اور اجتماعی ہجرت پر مجبور ہو گئی۔

چونکہ یہ ساری ہجرت بلوچستان کے ساحلی علاقوں کے راستے عمل میں آئی اور بلوچستان کا ساحلی علاقہ (جس میں پاکستانی اور ایرانی دونوں بلوچستان شامل ہیں) پر مکران کا وسیع و عریض علاقہ واقع ہے۔ پاکستانی بلوچستان کا مکران تو ہمارے پڑھنے والوں کے لئے نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن ایرانی بلوچستان کا ساحلی علاقہ بھی "مکران" ہی کہلاتا ہے۔ جس طرح دونوں بلوچستان کسی بھی نکتہ نظر سے دو مختلف چیزیں نہیں ہیں اسی طرح دونوں "مکران" بھی۔ اور مکران کا نام تو خود "بلوچستان" سے بھی پہلے کیا بلکہ ازمنۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔

جب یہ مظلوم بلوچ مہاجر کراچی پہنچتے تھے تو ان سے پوچھا جاتا تھا کہ کہاں سے آرہے ہیں؟ تو وہ صحیح جواب دیتے کہ "مکران" سے۔ علاوہ ازیں سندھ کی ادب کیچ مکران کے ذکر سے لبریز ہے۔ اس لئے سندھیوں نے ان بلوچوں اور ان کی زبان کو مکرانی کہنا شروع کیا حالانکہ قومیت کے لحاظ سے یہ سب بلوچ ہیں اور اُن کی زبان بھی "بلوچی" ہے۔ "مکرانی" نہ تو کوئی قوم ہے نہ کوئی قبیلہ اور نہ ہی کوئی زبان۔ البتہ مکران بلوچستان کا ایک ضلع ضرور ہے۔ جس میں باقی بلوچستان کی طرح بلوچ رہتے ہیں۔ البتہ زبان کے مسئلہ پر یہ عرض کرنا نہایت ضروری ہے کہ وہ سب بلوچی زبان ہی بولتے ہیں۔ حتیٰ کہ مکرانی "بلوچی زبان کا کوئی خاص ایک لہجہ بھی تو نہیں البتہ دوسری زبانوں کی طرح سارے بلوچستان میں بلوچی زبان مختلف مقامی لہجوں میں بولی جاتی ہے جو دنیا میں ہر زبان کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگر آپ سندھ کے ہر کسی ضلع سے آتے ہوئے شخص کو ایک علیحدہ قومیت یا علیحدہ زبان سے متعلق کرتے ہیں تو کتنی بڑی غلطی ہو گی۔ بالکل یہی

مصداق "مکرانی" کے بارے میں صحیح ہے۔ کراچی میں جن لوگوں کو آج "مکرانی" کہا جاتا ہے وہ حقیقت میں سب مکران کے لوگ بھی نہیں ہیں البتہ جو لوگ خاص مکران سے آتے ہوتے ہیں اُن کو آپ یقیناً دہلوی، لکھنوی، مرادآبادی وغیرہ کی طرح "مکرانی" کہہ سکتے ہیں۔

"مکرانی" ہی کے متعلق ایک اور بڑی غلط فہمی بھی عام ہے۔ اکثر لوگ کراچی میں سیاہ فام افریقی نسل سے متعلق بلوچوں کو "مکرانی" کہتے ہیں اور باقی لوگوں کو "بلوچ"۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے کراچی میں مہاجر کی صورت میں یہی سیاہ فام بلوچ آکر آباد ہو گئے۔ ویسے متحدہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس سیاہ فام نسل کے علاوہ دوسری خالص بلوچ قومیتوں کے لوگ بھی تلاش معاش یا کسی کے قتل کے بعد فرار، یا اپنوں سے غصہ کی صورت میں آکر پہلے سے آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔

پرانے دستور اور روایات کے مطابق یہ نسل بھی افریقہ ہی سے ساری دنیا میں جس طرح پھیل گئی تھی اسی طرح بلوچستان میں بھی بردہ فروشی کے سلسلے میں لائی گئی اور غلاموں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ بلوچستان میں جبکہ عام لوگوں پر ناقابل برداشت سختیاں وہاں کے سرداروں کی طرف سے روا رکھی گئی تھیں کہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے تو ظاہر ہے کہ ان پر بحیثیت غلام کے کیا کیا مصیبتیں نہ آئی ہوں گی۔ اور بعد میں جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ برطانوی راج میں وہ کراچی میں آزاد زندگی بسر کر سکتے ہیں تو وہ اپنے آقاؤں کے ہاں سے بھاگ بھاگ کر یہاں آباد ہوتے گئے اور ایرانی بلوچستان سے سب سے پہلے انہی سیاہ فام لوگوں کی ہجرت عمل میں آئی اور اس طرح شاید سب سے پہلے لیاری کوارٹر کی موجودہ بستی بغدادی انہوں نے بسائی۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ جنھیں "مکرانی" کہا جاتا ہے سب کے سب ایک ہی قوم "بلوچ" سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو قوم یا زبان کے نکتہ نظر سے "مکرانی" کہنا غلط ہے اور اسی طرح ان کی زبان کو بھی

"مکرانی" کہنا غلط ہوگا۔ ان کی زبان بھی "بلوچی" سے نکلی جو عام بلوچوں کی ہے۔

لہجے

اگرچہ بنیادی طور پر ایک لغۃ الامّ سے ایک زبانیں مصدر سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنے نئے ماحول میں ایسی شکل وصورت کی تبدیلیاں قبول کر گئیں کہ کبھی کبھی یہ پہچاننا تک مشکل ہوجاتا ہے کہ کیا یہ واقعی اپنی اصل مصدری زبان سے کوئی تعلق رکھتی ہیں۔ مگر دوسری طرف یہی مختلف شکل وصورت اختیار کی ہوئی زبانیں آپس میں ایکدوسرے پر کسی نہ کسی طرح اثرانداز بھی ہیں۔ اثرانداز ہونے کے بارے میں ہم دو مختلف طریقوں پر غور کرتے ہیں۔ اوّل تو وہی زبانیں جن کا منبع ومصدر ایک ہی ہے یا جو ایک ہی مصدر کے مشتقات ہیں۔ مثلاً اس سلسلے میں بلوچی زبان کا اصل مصدر ومنبع "اَوِستا" ہے۔ جب بلوچی زبان اپنی لغۃ الامّ سے بُعد اختیار کرتی گئی اور نئی نئی سرزمینوں میں نئے نئے ماحول بساتی ہوئی دھرتی کی پہناوری میں پھیلتی گئی تو وہ فاصلے فاصلے پر اپنا معسکر یا کیمپ ڈالتی چلی گئی تھی جو رفتہ رفتہ مستقل صورت اختیار کر گئے۔ ان میں جو جو گروہ جہاں جہاں رہ گیا وہ دوسرے گروہوں سے کسی حد تک الگ تھلگ تو واقعی تھا مگر قطعی طور پر منقطع نہ ہونے کی وجہ سے آمدورفت اور ملنا جلنا اگرچہ کم لیکن ہمیشہ رہتا تھا۔ ایسے ہر گروہ کی زبان اپنے مرکز میں اپنی نئی تبدیل شدہ یا آرائش یافتہ شکل وصورت میں ہوتی ہے۔ مگر وہ گروہ جو مرکز سے دُور ہوتے ہوتے کسی دوسری زبان کی سرحد تک پہنچ جاتے جن کو ہم مرز یا سرحدات کہتے ہیں وہاں آپ آسانی سے یہ دیکھ پاتے ہیں کہ ان دونوں علاقوں کی زبانیں ایکدوسرے کے اثرات کو کس آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ یہی مثال بلوچی لہجوں کی ہے۔ بلوچی زبان بولنے والے جہاں تک پھیلتے چلے گئے اور جہاں جہاں تک انہوں نے نئی سرزمین آباد کی اور نئی آبادیاں بسانی شروع کیں تو وہ ایک دوسرے سے کافی حد تک الگ تھلگ رہنے لگے۔ (آج ہم اگرچہ الگ تھلگ یا دُور کا لفظ استعمال

کرتے ہوئے ذرا جھجک محسوس کرتے ہیں کیونکہ آج کی سائنسی دنیا میں زمین کی تنابیں اتنی کھنچ گئی ہیں کہ لفظ دور کا سوال پیدا نہیں ہوتا مگر اُس زمانے میں ایک میل کی مسافت بھی ایک بہت بڑی چیز ہوتی تھی۔) اور اس الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ہر گروہ اپنے کیمپ میں علیحدہ اور منفرد رنگ میں رہتا تھا اور آہستہ آہستہ اس نئے ماحول، آب و ہوا یا دوسرے اسباب و علل سے زبان کے الفاظ اور بولنے کے لہجے میں ذرا ذرا فرق پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ علاوہ ازیں کچھ ایسی چیزیں بھی اس کے مقابلے میں آتی گئیں جن کے لئے نئے الفاظ، نئے نام، نئی اصطلاحات کی ضرورت پڑی۔ یہ ہر ایک گروہ کے کیمپ یا مرکز میں واقع ہوتا رہا اور ایکدوسرے سے کم ملنے کی وجہ سے کئی ایسے الفاظ، محاورے اور نام پیدا ہو گئے جن کے بارے میں ایکدوسرے گروہ یا مرکز کے لوگ انجان ہوتے تھے۔ لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئیں اور ہر ایک گروہ کو اپنے مجاور علاقے میں بسنے والے دوسرے گروہ کے پاس ضرورت نے مجبوراً پہنچا ہی دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز یا کیمپ سے لے کر سرحدات تک بتدریج پانی کے دھارے کی طرح اتصال ہو گیا یعنی ایک مخروطی شکل کی آبادی سیلاب کی موٹی اور چوڑی بہاؤ کی طرح پھیلاؤ کے بعد پتلی اور باریک حالت اختیار کر کے دونوں علاقوں میں ایک قسم کا ارتباط و اتصال پیدا کر گئی اس اتصال کی وجہ سے دونوں گروہوں کے ایجاد، اختراع یا تبدیل و تغیر شدہ الفاظ اور محاورے دوسرے گروہ تک پہنچ گئے اور جو لوگ سرحدات میں رہنے لگے وہ دونوں لہجوں اور ان سے متعلق دوسری چیزوں پر معاً قابو پا گئے لیکن جو مرکز میں رہے ان سے کم واقف رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کا لہجہ دوسرے علاقے میں پہنچتے پہنچتے اس میں مدغم ہوتا ہوا ملے گا۔

عظیم بلوچستان کے ساحل میں بندر عباس سے لے کر کراچی تک آپ کو بلوچی

زبان کے لہجوں میں یہی چیز ملے گی جہاں تک عظیم یا متحد بلوچستان کا تعلق ہے وہاں علاقائی لہجوں کا ہونا تو ضروری ہے لیکن صرف لہجوں کا اختلاف افہام وتفہیم یا ابلاغ وتبلیغ میں کسی قسم کی رکاوٹ بن نہیں سکتا ۔ صرف بلوچی زبان نہیں بلکہ یہ چیز دنیا کی ہر بڑی اور پھیلی ہوئی زبان میں ملے گی ۔

دوسری چیز ایک زبان پر دوسری زبان کا نفوذ و اثر اور اس کے اسباب ہیں ۔ ہمسائیگی کے لحاظ سے دو مختلف زبانوں والے مجاور ملک کے مرز آپس میں ملتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر انداز ہوں گی اس سلسلے میں وہ زبان جو تعلیمی، تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی صورت میں زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور ہو گی لامحالہ اپنے سے کمزور زبان پر اثر انداز ہو گی ۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کی وہ سرحدیں جو ایران، افغان، سندھ، پنجاب، پختون اور عرب کے ان علاقوں سے ملی ہوتی ہیں جہاں یہ زبانیں بڑی طاقتور صورت میں راج کر رہی ہیں تو بلوچی زبان ان کے اثر سے دامن نہ بچا سکی ہے ۔ علاوہ ازیں آج تک بلوچی زبان کہیں بھی مدارس، مکاتب یا کسی ایسی علمی معہد میں نہیں پڑھائی جا رہی ہے اور تمام بلوچ آج تک غیر بلوچی زبانوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں ۔ یہ بات غیر قابلِ تردید ہے کہ جس زبان کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے اس کا نفوذ محصّل کی زبان پر لابدی ہے ۔ چنانچہ یہی معاملہ بلوچی زبان بولنے والوں کے ساتھ بھی ہوا ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی بلوچستان (ایرانی بلوچستان) کے وہ علاقے جو ایرانی بولنے والوں سے ملتے ہیں ۔ وہاں کے بسنے والوں کی زبان پر فارسی نے گہرا نفوذ حاصل کیا ہے اور دوسری طرف فارسی زبان کے بلوچ تعلیم یافتہ لوگ ہیں جن پر فارسی نے بڑا اثر چھوڑا ہے اور یہ باسواد لوگ اپنی گفتگو اور لکھائی میں فارسی کے الفاظ

اور محاورے آزادی سے استعمال کرتے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ فارسی زبان خود عربی کے سیلاب میں بہہ رہی ہے۔) مثلاً اگر آپ کو ریڈیو زاہدان کے سننے کا اتفاق ہو تو اس کی بلوچی کچھ یوں ہو گی۔ "تقریباً ماں سی کیلومتری زاھدان ماں راہِ بین زاھدان ءُ میرجاوہ یاراھے کہ چہ ھیئت ءِ تقاضا بدست گروھان ھندسی تیپ زاھدان جوڑ بوتگ چہ نیمگ ءِ کچہ تاب وارت ــ" اب اس جملے کی اصل فارسی ملاحظہ ہو۔ "تقریباً درسی کیلومتری زاھدان در راہ بین زاھدان و میرجاوہ جادہ ای کہ بہ تقاضای ھیئت بدست گروھان ھندسی تیپ زاہدان ساختہ شدہ لطف کچہ منحرف میشود ــ"

اسی طرح عربستان میں مستقل رہنے والا یا عربی تعلیم یافتہ بلوچ کی زبان سے آپ بلوچی کا یہ جملہ سُن کر حیران ہوں گے۔ "ضربہ کُت یک، قیتی چَم قلع کُت ــ" یعنی ایسی ایک لاٹھی ماری کہ اُس کی آنکھ نکل پڑی۔ اس کی اصل بلوچی یوں ہو گی۔ "اِنچیں لٹے جت کہ چَم ئے در آتک ــ" پختون علاقوں کے ساتھ ملے جلے اور رہنے والے بلوچوں کی زبان پر بھی پشتو کے الفاظ چڑھ چکے ہیں اور اسی طرح سندھ، ملتان، اور پنجاب کی زبانوں نے اپنے قرب وجوار کے بلوچوں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ مشرقی بلوچستان (پاکستانی صوبہ) کے انتہائی مشرق میں آپ کو یہ اثر حیرت انگیز حد تک ملے گا جو بالکل اسی انداز تک ہو گا جو زاہدان جیسے شہر اور عربستان کے کئی علاقوں میں نمایاں ہے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ

البتہ عربستان، افریقہ یا بلوچستان سے باہر دوسرے کچھ علاقوں میں ایک بات قابل ذکر پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جہاں کہیں بلوچوں کی خالص منعزل کالونیاں ہیں وہاں کے لوگوں کی زبان پر کوئی خارجی زبان اثر انداز نہ ہو سکی اور آج تک ان کالونیوں کے بلوچ اپنی بلوچی خالص رنگ میں بولتے ہیں یعنی کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہاں کی ہر

"ناموا" تھا جس کے معنی "سوجاؤ" کے ہیں۔ لیکن بحرین کے یہ مریض اگر ان کو سمجھ نہ پائے تو ان کا کوئی قصور نہیں کیونکہ بحرین میں چارپائی کے لئے دو لفظ "کُرنایہ" یا "شِبریۃ" اور "سوجاؤ" کے لئے "ارقد" (مقامی لہجے میں "اِرگُد") ہوتا ہے۔

نام نہاد مشرقی اور مغربی بلوچی

بولی یا لہجوں کے بارے میں اس قسم کی غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ شروع شروع میں جب انگریز مستشرقین نے بلوچی زبان پر کام کرنا شروع کیا تو اُن کا سامنا ان علاقے کے لوگوں سے ہوا جو مری بگٹی کہلاتے ہیں۔ انہی لوگوں سے انہوں نے بلوچی سیکھی اور اس پر کام کیا۔ ان انگریزوں نے مری بگٹی علاقوں کے جائے وقوع کے لحاظ سے جو کہ بلوچستان کے آخری مشرقی حصے میں ہیں، اپنی اور دوسرے ہم عصروں کی سہولت کی خاطر اپنی کتابوں یا دیگر نوشتوں میں یہ لکھا کہ انہوں نے مشرقی علاقوں میں کام کیا ہے اور بلوچستان کے باقی علاقوں میں کام کی ضرورت ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہم نے اسی مشرقی علاقے کے لہجے کے شعری ادب کو اکٹھا کر لیا ہے

لیکن بعد کے محققین اور خصوصاً پاکستانی محققین نے سابق کوئٹہ ڈویژن کو مشرقی بلوچستان کا نام دیکر بلوچستان کو لسانی بنیاد پر دو حصّوں میں بانٹ کر زبان کے بارے میں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سوچنا چاہیئے کہ جس ڈایالیکٹ، بولی یا لہجے کو یہ لوگ مشرقی بولی کہتے ہیں اس تمام نام نہاد علاقے میں کہاں کہاں بولی جاتی ہے یہ بات تو واضح ہے کہ اس بولی یا لہجے کی اصل جگہ مری بگٹی علاقے ہیں۔

اگرچہ ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل یا سندھ میں کئی جگہ یہی بولی معمولی فرق کے ساتھ گبول، لُنڈ بلوچ وغیرہ بھی بولتے ہیں۔ لیکن کوئٹہ ڈویژن کے باقی علاقوں کا لہجہ تو بالکل اور ہی ہے۔ اور ان علاقوں میں بُراھوئی، پختون، دِھوار اقوام کی بھاری آبادی ہے۔ اور دوسرا حصّہ یا بقول ان کے مغربی بلوچی کا حصّہ پورا سابق قلات ڈویژن

ہے جس میں سراوان، جھالاوان علاقوں کے علاوہ خاران، مکران اور لسبیلہ کی ریاستیں بھی شامل ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ، نہ تو خود محقق ہیں اور نہ ہی تحقیق کی زحمت کرتے ہیں اور سالوں سے ان کا وطیرہ یہی رہا ہے کہ انگریزوں کی کہی ہوئی باتیں دہرا دہرا کر اپنی علمیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی احساسِ کمتری اور سہل نگاری کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی بیگانہ شخص کچھ سال یہاں رہ کر کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی ہر بات صحیح ہو۔ دوسری طرف ہمارے چند ایک نگارندوں یا نویسندوں نے میجر موکلر اور اس کے ہمنواؤں کی پیروی میں بلوچی کے ایک لہجے کا نام ہی "مکرانی" لہجہ رکھ دیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی سوا کچھ لوگ مری بگٹی بولی کے علاوہ عام رائج بلوچی زبان ہی کو "مکرانی" بولی کہتے ہیں۔

حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے فیصلے دینے میں ان کا مقام و موقف کہاں ہے۔ کیونکہ جب ہم بلوچی زبان پر کچھ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تو ہم کو سیاسی حدبندیاں تک روک نہیں سکتیں اور ہر حالت میں ہم پاک بلوچستان اور ایرانی بلوچستان دونوں کو سامنے رکھ کر زبان کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں۔ اس حساب سے ٹرابلنڈر یہ ہے کہ کوئٹہ ڈویژن کا حصہ مری بگٹی علاقے کے لہجے کو مشرقی بولی کہہ کر پھر سارے قلات ڈویژن اور پورے ایرانی بلوچستان کو ملا کر ان کو مغربی بولی کا نام دے کر زبان کو صرف دو بولیوں میں تقسیم کر کے نہایت بھونڈے طریقے سے حدبندی کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے غلط ہے۔

اگر ہم بلوچی زبان کی بولیوں یا لہجوں کی اس طرح حدبندی کریں گے تو پورے اور متحدہ بلوچستان میں صرف مشرقی اور مغربی دو بولیاں متعین کرنا تو نہایت مضحک ہو گا کیونکہ ہر ضلع کیا بلکہ ہر نیابت اور زیادہ صحیح معنوں میں ہر تحصیل کے ہر شہر کی اپنی علیحدہ بولی یا لہجہ ہے۔ اگر ہم بولی یا لہجوں کے نام لکھنا چاہیں تو ان کی تعداد حیرت انگیز ہو گی۔

اگر ہم مری لہجہ کو ایک بولی کہیں گے تو قلاتی بولی، کیچی بولی، پنجگوری بولی، سراوانی بولی
جھالاوانی بولی، کوئٹہ بولی، ڈیرہ جاتی بولی، رندبلوچی، گبولی بولی، دشتی بولی، کے علاوہ
کتنی اور بولیاں صرف پاکستانی صوبہ بلوچستان میں بولی جاتی ہیں جو عام بول چال میں
نمایاں فرق رکھتے ہیں اور انہی علاقوں میں اور جُدا جُدا بولیاں بھی موجود ہیں۔

مثلاً نام نہاد "مکرانی بولی" یا "مکرانی لہجہ" ہی کو لیجیے۔ کیونکہ موکلر اور الفاسٹن جیسے مستشرقین نے اس کو یہ نام دیدیا ہے اور حسب دستور ہمارے محققین ان کی تائید کرنا فخر سمجھتے ہیں جو واقعی قابل افسوس ہے۔ اگر کسی انگریز نے کوئی بات کہی ہے تو ہم اس کی کورانہ تقلید محض اس بات پر نہ کریں کہ انگریز کی کہی ہوتی ہے۔ اگر ہم بالفرض اس بولی کو مکرانی لہجے کا نام دیں گے تو کیچ، مند، دشت، زامران، پنجگور، جیونی، گنز، گوادر، پسنی وغیرہ سب علاقوں کی بولیاں ایک دوسرے سے شناخت کی حد تک نمایاں اختلاف رکھتی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کے سب علاقے مکران ہی میں ہیں۔ اب کوئی بتادے کہ ان میں سے مکرانی بولی کہاں ہے اور کونسی ہے؟ ہم اگر صرف پاکستانی مکران کے ساحلی علاقے پر نظر ڈالیں تو ہر چھوٹی بڑی بندر یا ساحلی گاؤں یا شہر کی بولی دوسری سے مختلف ہوگی۔

مثلاً جیونی، گنز، پشیکان، گوادر، سُر، کپّر، پسنی، اور ماڑہ ہر ایک ساحلی علاقے کا لہجہ نمایاں طور پر دوسرے سے مختلف ہے۔

یہ تو صرف پاکستانی بلوچستان کی بات ہوئی، ایرانی بلوچستان جو اتنا ہی وسیع اور عریض علاقہ ہے وہاں بھی یہی حال ہے۔ ہاں جہاں کہیں بولیوں میں معمولی اختلاف ہو گا ان کو ہم ایک علاقے کا لہجہ کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم مری لہجہ کو بھی بلوچی زبان کے مختلف لہجوں میں سے ایک لہجہ یا بولی کہتے ہیں لیکن اس کو مشرقی بولی کہہ کر سارے باقی متحد بلوچستان کو مغربی بولی کا نام دیکر اس قسم کی غلط حد بندی یا

تقسیم زبان کریں گے تو یہ سراسر غلطی ہو گی۔ یہ بات اس وقت ہو سکتی تھی کہ بلوچستان میں صرف دو ہی لہجے ہوتے اور یا پھر مری لہجے بولنے والوں کی تعداد کے ساتھ ان کا علاقہ بھی اس قدر وسیع ہوتا کہ متحدہ بلوچستان کے نصف کے برابر ہوتا۔ اگر محض دو ایک آوازوں کی بنا پر اس تقسیم کو روا رکھا گیا ہے تو یہ بھی غلط ثابت ہو گا کیونکہ ایرانی بلوچستان کے مغربی علاقوں میں دو ایک ایسے وسیع علاقے موجود ہیں جہاں کے لوگوں کی بولی وہی ہے جو مری بگٹی کی بولی ہے۔ یہ علاقے جاشک، میناب اور گیابان پر مشتمل ہے جو پھیل کر بندر عباس تک پہنچ جاتا ہے۔ اب ان کی بولی کو ہم مغربی کہیں کہ مشرقی؟

مری بولی اور اس بولی میں صرف یہ فرق ہے کہ مری بولی میں غیر بلوچی الفاظ سندھی، پنجابی، سرائیکی، اور پشتو کی بہتات ہے جبکہ گیابانی یا مینابی لہجے میں فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں۔

مطلب یہ کہ بلوچستان کا اس طرح غلط لسانی تقسیم کرنا، بالکل غیر حقیقی، غیر منطقی اور غیر قابل قبول فعل ہے۔ البتہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے اور ہر بولی اور ہر لہجے کے لوگوں کو اپنی بولی یا لہجے کے بارے میں تحقیق کرنا اور اس کے حقائق سے باقی لہجوں کے لوگوں کو روشناس کرانا ضروری ہے۔ کئی لوگ یہ لکھ کر بلوچوں کو اشتعال دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ ہماری ہی بولی صحیح بلوچی اور دوسری بولیاں بالکل غلط ہیں۔ حالانکہ حقائق سے کوئی منہ نہیں موڑ سکتا اور نہ ہی ایک بولی کے بولنے والے بزور قلم یا بزور شمشیر کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کو اپنی بولی اپنانے میں مجبور کر سکتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1955ء میں بلوچی زبان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کراچی میں مگسی ہاؤس میں " بلوچی کنونشن " منعقد ہوا تو کوئٹہ اور قلات کی نمائندگی

آغا عبدالکریم، میر گل خان نصیر اور محمد حسین عنقا کر رہے تھے۔ گل خان نصیر نے یہی تجویز پیش کی کہ ہم اپنی ادبی زبان کے لئے ایک علاقے کا لہجہ اپنائیں تو ہمارا ادب یکساں طور پر آگے بڑھے گا اور بولیوں اور لہجوں کا مخمصہ بیچ سے اٹھ جائے گا۔ اگرچہ شروع میں اکثر حاضرین نے حسب عادت بن سمجھے بوجھے اس کی تائید شروع کی لیکن میں نے اس کی کڑی مخالفت کرتے ہوئے ان کو ذہن نشین کرایا کہ کسی زبان وادب کی تاریخ میں یہ چیز نہیں ملتی اور نہ ہی یہ قابلِ عمل چیز ہے بلکہ اس کے برعکس یہ بالکل ناممکن ہے کیونکہ وسیع بلوچستان میں بیسیوں مختلف لہجے اور بولیاں ہیں، اور ہر بولی یا لہجہ بولنے والا طبقہ اپنی بولی کو دوسروں کے لہجوں سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے۔ اور کبھی اس بات سے متفق نہیں ہوگا کہ وہ اپنی بولی کسی دوسری بولی کی خاطر قربان کردے۔ اس کی مثال فرانس کی زبان سے لیجئے۔ موجودہ فرانسیسی ادبی زبان خودبخود یہ مقام پا گئی حالانکہ حکومت ایک خاص شہر شاید پیرس ہی کی بولی کو ادبی زبان بنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں سب کاوشیں بیکار ثابت ہوئیں اور موجودہ ادبی زبان بالکل فطری صورت میں ادبی دنیا پر حاوی ہوگئی۔ اس لئے سب سے بہترین طریقہ کار یہی ہے کہ ہر شخص کو لہجوں اور بولیوں کے استعمال کی مکمل آزادی ہونی چاہئے اور جس بولی میں وہ صلاحیت ہوگی جو ادب پر چھا سکے وہ بولی خودبخود لوگوں کو اپنے استعمال پر غیرارادی طور پر مجبور کرے گی۔

ویسے زبان کی مثال ایک سیلاب کی سی ہے جو اپنا راستہ خود صاف کرتی آگے بڑھتی جاتی ہے گی۔ البتہ ہمیں جس چیز کی طرف مکمل توجہ دینی چاہئے وہ صحیح املا ہے۔ لفظ چاہے کسی بھی بولی یا لہجے کا ہو مگر اس کی املا غلط نہ ہو۔ یعنی "گنگ" کو ہم "گوتاگ" مت لکھیں یا اردو کے لفظ کی مثال میں ہم "گھر" کو "گھار" مت" لکھیں۔ چنانچہ یہی تجویز متفقہ طور پر مان لی گئی۔ اور آج اس تاریخی کانفرس کو پورے بیس سال گذر چکے

ہیں اور میری اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے۔ کیونکہ آج وہ بلوچی زبان جو علمی، ادبی کاموں میں استعمال ہو رہی ہے وہ کسی ایک گاؤں، شہر، ضلع یا علاقے کی مخصوص زبان یا لہجہ اور بولی بالکل نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کے ہر لہجے ہر بولی کے الفاظ اس میں موجود ہیں اور یہی بلوچی کی ادبی زبان بن چکی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بلوچی کی موجودہ ادبی زبان اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ متحدہ بلوچستان کے علاوہ سندھ، پنجاب، ہندوستان، عربستان اور افریقہ تک کے بلوچوں نے اس کو خوشی خوشی اپنائی ہے اور کبھی بھولے سے بھی اس کی مخالفت میں ایک لفظ بھی آج تک زبان پر نہیں لایا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج تک بلوچی زبان میں جتنی کتابیں، رسائل، پمفلٹ اور جرائد وغیرہ چھپ چکے ہیں ان میں ننانوے فیصد کی زبان یہی مقبول عام بلوچی زبان ہے اور مختلف علاقوں کے بولیوں کے اتحاد کی وجہ سے بلوچی زبان کا لغاتی سرمایہ ایک بحر بیکراں بن گیا ہے۔ اس لئے غیر بلوچی لکھنے والوں سے میری استدعا ہے کہ وہ اس مغربی اور مشرقی بلوچی کے مفروضہ کو ترک کریں تاکہ ہم اُن کو بلوچی صفوں میں انتشار پھیلانے والے فرقوں میں محسوب نہ کر پائیں۔ اور بلوچ نویسندوں، ادباء اور شعراء سے التماس ہے کہ وہ اس غیر فطری اور افتراق انگیز نظریہ کو خود ترک کریں اور دوسروں کو بھی یہی ہدایت دیں کہ اس مذموم طریقہ عمل سے پرہیز کریں۔

صلۃ القرابۃ محققین کے اجتہاد اور ہماری ناتمام کوشش کا ماحصل بلوچی زبان کی لسانی صلہ القرابۃ کے بارے میں یہ ہے کہ اس کا مصدر و منبع بلاشبہ "اوستائی" زبان ہے جس کا شمار "آریائی" گروپ کی قدیم ترین اور اہم ترین زبانوں میں سے ہوتا

ہے۔ جیسے کہ علوم الالسنہ کے تلامذۃ کے علم میں ہے کہ آریائی "اُن زبانوں کے گروپ کا نام ہے
جس کو اینگلو امریکن "آرین" کہتے ہیں۔ فرانساوی ان کو "انڈو یورپین" اور جرمن "انڈو
جرمن" کا نام دیتے ہیں۔ کچھ صاحبانِ علم نے ان زبانوں کی جغرافیائی فراگیری کی حدود
کا تعین غرب یورپ کے سلتی CELTIC حدود سے لے کر ایشیائی توخاری
TOKHARIAN تک ترکستان کے مشرق تک پہنچا دیا ہے۔ اس تحدید میں
احتیاطی محدودیت کا امکان تو ہو سکتا ہے مگر مبالغہ کا شائبہ تک نہیں۔

ہم اس حقیقت کے ماننے پر مجبور ہیں کہ کسی زمانے میں ان تمام آریائی زبانوں کی
ایک ہی بنیادی زبان تھی جو ایک خاص مجتمع (معاشرہ) سے متعلق تھی جو امتداد زمانہ
سے تتر بتر اور بکھر جانے کے بعد اپنی بنیادی زبان اور قبائل سے وہ رابطہ قائم نہ کر سکا
جو ابتدائی مرکز میں باقی تھا۔ اور بالآخر ہر نئے ماحول میں اس کی بٹی ہوتی ٹولیوں پر اور
معاً ان کی زبان پر مختلف ماحول کے زیر اثر مختلف رنگ چڑھتے گئے جن کو اپنانے سے انکار
اُن کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

چنانچہ دقیق مطالعہ اور تمام تر مشاہدے کے بعد یہ حقیقت بہ آسانی سامنے آجاتی ہے
کہ ان زبانوں کے الفاظ کی لفظی اور معنوی غیر قابل انکار مماثلت سے اس بات کا اور
پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی مصدر کے مشتقات ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں لکھتے ہیں
"آریاؤں نے ہندوستان کی طرف جو سفر کیا اس کا سبب غالباً یہی تھا کہ وہ اس وقت
نیم خانہ بدوش قوم کی حیثیت رکھتے تھے اور نئی جگہ اور نئے وطن کی تلاش میں نکلے
تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مشرقی ایران ان کی کثرت آبادی اور کثرت رسوم والسنہ کا
متحمل نہ ہو سکا ہو۔ جو قبیلے اپنے خاص خاص رسوم و رواج کے ساتھ ہندوستان میں آئے
انہیں کے سر ہندی تہذیب و تمدن کے آغاز کا سہرا باندھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے

یقیناً ان قوموں کا اثر بھی قبول کر لیا ہوگا۔ جو اس ملک میں پہلے ہی سے آباد تھیں۔ جو آریا ایران میں رہ گئے ان میں سے بعض سامی، بابلی اور آشوری عناصر سے متاثر ہو کر اپنا ایک عالیشان تمدن بنا سکے جو آج قدیم ایرانی تمدن کہلاتا ہے۔ اور ان کے جو قبیلے ان اثروں میں نہ آ سکے وہ اپنا کوئی جدا تمدن نہ بنا سکے۔ وہ آج بلوچی اور افغانی کہلاتے ہیں۔

آرین ویج

اگرچہ مغربی علما۔ اور محققین ابھی تک یہ قطعی فیصلہ نہ کر پاتے کہ قدیم اصل آریائیوں کا مرز و بوم خاص کہاں تھا۔ البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ قوم جنوب روس یا ایرانی سہل مرتفع میں کہیں رہتی تھی، جس کا اس سے زیادہ تنگ تعینِ مکان مشکل ہے۔ البتہ اکثر کی رائے میں خوارزم ہی "ایران ویج" ہے۔

پیغمبر ایران حضرت زردشت کی مقدس کتاب "اَوِستا" جس کی قدامت قابلِ رشک ہے، میں "ایران ویج" کا ذکر موجود ہے اسی طرح پہلوی کتب میں بھی یہ نام مذکور ہے۔ اَوِستائی متن میں یہ نام، اَوِستائی حروف میں یوں لکھا ہے" [illegible] (ائرین وَئجَہ یا ایرین دجہ) علاوہ ازیں اس کے متعلق کئی اور جگہوں کے نام بھی مذکور ہیں جن کی مدد سے آریائیوں کے مرز و بوم کا تعین کسی حد تک آسان ہو سکتا ہے۔

جناب جلیل دوستخواہ کا ترجمہ کردہ اَوِستا کے صفحہ ۱۱۶ پر یسنا ۹-۱۴ کا یوں ترجمہ ہے جس میں "ایران ویج" کا نام آیا ہے۔

"ای زرتشت اِی ایران ویج نام آور ــــ تو نخستیں بار [نیایشں] اَھوَن وئیریَہ ..... را چہار بار با درنگی کہ باید، بسرودی و نیمۂ دوم را بلند [آھنگ] تر برخواندی ــ"

معتبر ترین اَوِستا شناس ابراہیم پور داود نے مختلف مورخین کا گہرا مطالعہ کیا

کیا ہے اور ان کا حوالہ دیتے ہوتے لکھتے ہیں۔

"تیل ایران ویج را در مشرق شمالی دانستہ می نویسند " ایران ویج بہ ترتیبی کہ فرگرد اوّل وندیداد آمدہ نخستین اقامت گاہ ایرانیاں است کہ از آنجا رفتہ رفتہ بہ سغد و مرو و بلخ و نیسایہ NĪSĀYA و ھرات و کابل و ھلمند دست انداز می کردند۔ بنا بتقریر دانشمند ھلاندی ایران ویج را باید سرزمین خوارزم یا خیوہ حالیہ بدانیم ۔"

جیسے کہ پہلے بتایا گیا ہے اکثر مورخین " ایران ویج " کی جگہ کو " خوارزم " تعین کرتے ہیں۔ کتی ایک مورخ تو توران (اَوِستاتی توئیریہ = س) کو بھی خوارزم کا حصہ سمجھتے ہیں۔ جن کی رو سے ایران ویج کا علاقہ اور وسیع ہو گیا۔

" اَوِستا " سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایران ویج (ائرین ویجہ) وہی خوارزم ہے۔ اس کے بارے میں " اَوِستا " کے حصّہ " وندیداد " کے پہلے " فرگرد " کے تین فقروں کے بعد سولہ[14] مملکت یا جگہوں کے جو نام دیتے گئے ہیں ان میں یہ نام بھی ہے۔ ابتدائی دو فقروں میں تو " ایران ویج " کا نام ہے ہی لیکن ان فقروں کے بعد " سغد ، مرو بلخ ، نیسایہ ، ھرات ، کابل کا نام تو آتا ہے مگر خوارزم کا نہیں ہے جس سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ خوارزم ہی وہی ایران ویج کا نام ہے۔ کیونکہ یہ سب علاقے خوارزم ہی کے آس پاس ہیں اور خوارزم تاریخی اعتبار سے بھی ان سب علاقوں سے زیادہ پرانا ہے۔ اس لئے لامحالہ اسی خوارزم کا نام " ایران ویج " ہے۔ خوارزم کا نام اَوِستا میں " خوائرِزَم " ہے

اسی طرح " اَوِستا " کے حصے " مہر یشت " کے ۱۳ ویں اور ۱۴ ویں فقروں میں خوارزم مرو ، اور سغد کو ایرانیوں کی اقامت گاہ کہا گیا ہے : ایرانیوں کی اقامت گاہ " کے متن کے

لفظ "اَیریُوشَیَنَ " کا ترجمہ ہے۔

اسی "مہریشت" کے "کردہ چہارم" کے ۱۳ویں اور چودھویں فقرے کو آقای جلیل دوستخواہ نے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔

"[اوست] نخستین ایزد مینوی کہ پیش از [سر برآوردن] خورشید جاودانہ تیز اسب بر فراز کوہ "ھرا" برآید ؛ نخستین کسی کہ بازیورھای زرین آراستہ از فراز [کوہ] زیبا [ی "ھرا"] سر بدر آورد و ھمہ خانمانہای آریائی را از آنجا بنگرد۔"

" آنجا کہ شہریاران دلیر [رزم آوران] بسیار بسیج کنندہ آنجا کہ کوھھا بلند و چراگاھھای بسیار برای ستوران ھست، آنجا کہ دریاھای فراخ و ژرف ھست، آنجا کہ رودھای پھناور درخور کشتیرانی باانبوہ خیز آبھای خروشان بہ سنگ خارہ و کوہ خورد بہ سوی "مرو" (درھرات) و "سغد" و "خوارزم" شتابد۔"

اسی خوارزم کا نام ھخامنشی حکمرانوں سے بھی پہلے تاریخ میں موجود ہے۔ پورداود اسی کی قدامت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " تمدن خوارزم بہ ھزار سہ صد دہ (۱۳۱۰) سال پیش از مسیح می رود۔" اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یونان اور روم کے قدیم ترین مورخوں میں سے خانتوس XANTUS کے مطابق زرتشت کا زمانہ قابل اعتماد طور پر ایک ھزار استی (۱۰۸۰) قبل مسیح ہے۔

اب ہم آرین گروپ کی اس سرزمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ایران کی مغربی سرحد سے شروع ہو کر ہندوستان کو پار کر کے مشرق میں چین کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے گلاویز ہو جاتی ہے۔ یہ پہناور علاقہ دو قدیم ترین آریائی زبانوں کے عظیم ترین شاخوں کا مرکز نمو ہے اور ان علاقوں کی تقریباً تمام زبانیں انہی دو لغات الامّ MOTHER LANGUAGES

کے مشتقات ہیں۔ یہ دو زبانیں "اَوِستائی" اور "سانسکرت" ہی ہیں جو ایران اور برصغیر کی (دراوڑی کے علاوہ) تمام زبانوں کے منبع و مصدر ہیں۔

اوستائی اور سانسکرت

اوستائی اور سانسکرت میں کیا قرابت ہے؟

حقیقت میں یہ دونوں زبانیں دو علیحدہ چیزیں نہ تھیں بلکہ یہ دراصل ایک اور صرف ایک ہی زبان تھی جو ایک خاص مجتمع، ملّت یا جالیہ سے متعلق تھی۔ زندگی کی ضروریات اور دیگر مجبوریوں نے یا ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم اور لوط کی مفارقت کے اسباب کی کارفرمائیوں کے نتیجے پر یہ ملّت بھی دو زمروں میں بٹ کر مختلف سمتوں کو چلدتے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کی باہمی عدم مراسلہ و مرابطہ کے نتیجے پر ان کی وحدت زبان پر نئے ماحول و کوائف و احوال کے اثرات کی بناء پر لامناص منہا تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں اور آخر کار دو مختلف ناموں سے موسوم ہو کر پہلے تو وہ دو مختلف لہجے اور بعد میں مختلف و مستقل ایسی زبانوں کی شکل اختیار کر گئیں جو اپنی اپنی جگہ بالذات دو علیحدہ بنیادی لغات الاُمّ کی حیثیت اختیار کر کے کئی دوسری فرعی زبانوں کے مصدر و منبع بن گئیں۔

آلاف سنین کے عقدِ اوّل کے کم از کم ثلث یعنی تین ہزار سالوں سے زائد کی منقطع و منعزل زندگی کے باوجود ان دونوں کے اکثر کلیدی الفاظ کو ان زبانوں کے ماہر لغوی اور معنوی اعتبار سے بنیادی طور پر ایک منوا سکتے ہیں۔ مثلاً اَوِستائی زبان کے یہ الفاظ "یَشنَ، رَتُوم، نَرَ، اَزِم، اَستِی، اَئِمَ، نَمو اور تْوام" سانسکرت کے الفاظ "یَجنْ، رِتْ، نرٗ، آھَمٗ، اَسْتی، اَیِمْ، نَمْ اور تْوام" بالکل ایک ہی معانی یعنی بالترتیب "ستایش، موسم، ذکر، مَیں، ہَڈّی، یہ، نمسکار اور تُم" کے حامل ہیں۔

یہ بات خاص طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان چند الفاظ کا ہم صدا ہونے کے ساتھ ساتھ

ہم معنی ہونا کوئی صدفہ (تصادف یا اتفاقیہ) نہیں ہے بلکہ ان دونوں زبانوں کے تقریباً ہر کلیدی لفظ اس امتحان پر پورا اترے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ "اَوِستا" کے متبرک نوشتوں کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو ایسے کلمات بہت ہی کم ملیں گے جو مندرجہ بالا امثلہ کی طرح مترادف سانسکرت الفاظ سے مطابقت نہ کرتے ہوں۔ البتہ اس سلسلے میں محقق کا دونوں زبانوں پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ اس لئے جدید تحقیقات کی رو سے اَوِستا اور سانسکرت کے بارے میں اب "مقاربت" اور "نزدیکی" کے کلمات استعمال کرنا ان کی حق تلفی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ماہرین کو ان دو زبانوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہو رہا ہے۔

جس طرح برصغیر اور اس کے مجاور سرزمینوں کی متعدد اقوام کی زبانوں کا مصدر و منبع سانسکرت ہے ٹھیک اسی طرح موجودہ ایران اور اس کی ہم حدود کئی ممالک و اقوام کی زبانوں کا منبع و مصدر اَوِستائی زبان ہے اور جتنی زبانیں اَوِستائی سے نکلی ہوتی ہیں ان میں سے نزدیک ترین مقام بلوچی اور پہلوی کا ہے جن کی قدامت صرف اَوِستائی زبان کے مقابلے میں ثانوی ہے۔

اوستائی کی قدامت

اَوِستائی زبان کی قدامت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خود اس کے نام سے بھی تاریخ ناآشنا ہے اور موجودہ نام پیغمبر ایران حضرت زرتشت کی کتاب مقدس "اوستا" کی نسبت سے "اوستائی" رکھا گیا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی سمجھیں جیسے کہ اگر عربی زبان کے نام کے بارے میں تاریخ لاعلمی ظاہر کر دیتی تو آج عربی زبان قرآن کی نسبت سے "قرآنی زبان" کہلاتی۔ جس زبان اور رسم الخط میں زرتشت کی یہ کتاب "اَوِستا" لکھی ہوتی ملی ہے وہ ایک بالکل منفرد اور مستقل زبان اور رسم الخط میں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ دست بُرد زمانہ سے بچ نہ سکا اس کا باقی بچا کچا حصہ پھر بھی کافی

حد تک بڑا ہے۔

زرتشت کے بعد انقلابات زمانہ نے اس کیش و آئین اور اس کی دستوری کتاب کے ساتھ وہ کھیل کھیلے کہ اُوِستائی زبان بولنے والی قوم یا تو نیست و نابود ہو گئی اور یا پھر اپنی زبان سے اس کو ہاتھ دھونے پڑے۔ البتہ اس حقیقت واقعہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ زبان ایک خاص تسویہ و تدابیر اور محتاط منہاج کے تحت زرتشتی دستور، مغ اور موبد یا دوسرے الفاظ میں دینی فقیہہ، پیشوا۔ اور علما کے ہاں محفوظ ہو کر اُن کے نقل و تحویل کی منظم اور بطریق احسن اہتمام و انتظام ہوتی رہی اور یہ امر معجز بھی لائق ذکر ہے کہ ان موبدوں کی کتب، تفاسیر و تراجم یا کسی اور متعلقہ تصانیف و تالیف میں اس زبان کے اصل نام کا کہیں ذکر نہیں آتا یہی سب سے بڑی غیر منکر اور غیر مندحض دلیل اس کی قدامت کی ہے اور یہی سبب ہے اس کے "اُوِستا" کی نسبت "اوستائی زبان" کہلانے کا:-

محققین حضرت زردشت کے زمانہ کا تعین ابھی تک بالضبط نہیں کر پائے ہیں۔ ہر محقق نے اس کی تحقیق و تدقیق اپنے علم و دانش کی روشنی میں کرتے ہوتے زمان کے تعین کی کوشش کی ہے۔ ایک نے اگر زردشت کا زمانہ ایک ہزار اسی سال (۱۰۸۰) قبل مسیح بتایا ہے تو دوسرے نے صرف چھ سو ساٹھ (۶۶۰) سال قبل مسیح۔

اگرچہ یہ نزدیک ترین یعنی ۶۶۰ سال والی تاریخ کے بارے میں خود زردشتی مذہب کے دینی پیشواؤں نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اسی پر اعتبار کرنے لگے ہیں لیکن یونان و روم کے معتبر ترین مورخوں میں سے قابل مورخ خانتوس KANTUS نے زردشت کے زمانے کا تعین قابل اعتماد دلائل کے ساتھ ایک ہزار اسی سال (۱۰۸۰) قبل مسیح کیا ہے۔ کیسے بھی ہو مگر یہ زبان صرف خود زردشت کی زبان تو نہ تھی یعنی جس سرزمین میں زردشت کی ولادت ہوتی ہے اس سرزمین

لوگ تو صدیوں تے یا شاید ہزاروں سال سے یہی زبان بولتے چلے آرہے ہوں گے اور نہ جانے اس زبان کو بولنے والی قوم نے کتنی صدیوں یا ہزاریوں کے بعد زردشت کو جنم دیا تھا۔

بلوچی اور پہلوی

قدامت میں اوستائی زبان کے بعد فوراً بلوچی اور پہلوی کا نمبر آتا ہے۔ اگرچہ "اوستا" کی مقدس کتاب کا پہلوی زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے تو بلوچی میں کیوں نہیں ہوا۔ ویسے دو نام اور بھی پہلوی کے ساتھ آتے ہیں جن میں اَوِستا کے تراجم اسی زمانے میں ہوتے رہیں۔ وہ ہیں "زند و پازند"۔ لیکن مسلّم یہ ہے کہ "زند اَوِستا" اوستا کی پہلوی تفسیر کا نام ہے اور پازند اُسی زند اَوِستا کی تفسیر کے حاشیہ کو کہتے ہیں۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی بھی پہلوی زبان کی ہم عصر ہوگی۔ البتہ پہلوی بولنے والے اس وقت و زمان کے نظریہ و حالات کے مطابق شہری لوگ تھے جبکہ بلوچی زبان کے بولنے والے دیہاتی، پہاڑی اور صحرانشین ــــ دوسری بات یہ کہ پہلوی بولنے والے ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ایک منظم بادشاہت یا اس کے مترادف طرز حکومت سے مستفید و مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ جو ان کے لئے ایک مرکزیت بن چکی تھی اور بلوچ قوم اپنی پوری تاریخ میں کبھی بھی ایسی مرکزیت قائم نہ کر سکی اور نہ ہی اس قوم نے کوئی ایسی بلوچی بادشاہت یا اس سے ملتی جلتی طرز حکومت قائم کی۔ بلکہ یہ قوم ہمیشہ جُنود مُرتزقہ MERCENARIES کی طرح دوسری اقوام کی افواج میں شامل ہو کر ان کے لئے لڑ مرتے تھے۔ اور کامیابی کی صورت میں ملک فتح کرکے ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ فردوسی کا شاہنامہ جہاں رستم کا ذکر آتا ہے وہاں یہ بھی کہتا ہے کہ وہ سیستانی ہے۔ اور یہ سیستان بھی بلوچوں کے ماقبل تاریخ کے مراکز میں سے ایک ہے مقدس اَوِستا میں جہاں آریائیوں کی اپنے مرکز اصلی "ایران ویج" سے جس ہجرت کا ذکر

ہے وہاں ان مقامات کا بھی ذکر ہے جہاں یہ آریائی قوم اپنی ابتدائی ہجرت کے نتیجے پر پھیل گئی۔ "اوستا" میں "آبان یشت" کے "کردہ دہم" میں جس دریاچہ کا نام "پیشنگہ" ہے وہ گویا "سیستان" ہی میں تھا۔ دوبارہ اسی "آبان یشت" کے "کردہ بیست پنجم" [25] میں ایک اور دریاچہ کا نام "فرزدان" لکھا ہے۔ یہ بھی سیستان ہی کا دریاچہ تھا۔ اس کے علاوہ "زامیاد یشت" کے کردہ نہم میں رودخانہ "ھیرمند" اور دریاچہ "کیانسی" (دریاچہ ھامون موجودہ) کا ذکر ہے اور اسکے بعد کے فقروں میں کئی ایک ندی وغیروں کا ذکر ہے جو سب کے سب آکر دریاچہ کیانسی" میں گرتی ہیں۔

یہ فقرہ ملاحظہ ہو۔

"خواسترا" و "ھوسپا" و "فرذتا" و "خوارننگھیتی" زیبا و "اوشتوئیتی توانا" و "اوروذا" دارندہ چراگاھای بسیار" و "ارزی" و "زرنومیتی" و "ھیرمند" باشکوہ و فرھمند کہ خیزابہای سپید برانگیزد و سرکشی کند [بہ سوی دریاچہ "کیانسی"] روان میشوند و بدان فرد میریزند۔

اور جہاں ابتدائی ہجرت یا پھیلاؤ کی خاطر یہ آریائی ایران ویج سے نکل کر باقی علاقوں میں پھیل گئے ان کے نام بھی اوستا کے حصّہ "وندیداد" میں مذکور ہیں۔

اسی سیستان والے رستم کے بارے میں شاہنامے میں یہ عام ذکر ہے کہ کئی ایک ایرانی شہنشاہوں نے رستم کو وہ بادشاہتیں بھی پیش کیں جو خود رستم نے ان کے لئے فتح کی تھیں۔ لیکن رستم نے یہ کہہ کر ان کو ٹھکرا دیا کہ "منم رستم تاج بخش" یعنی میں تخت و تاج بخشنے والا رستم ہوں، بادشاہتیں چاہنے والا نہیں۔" اور بلوچوں میں یہ صفت کسی نہ کسی صورت میں آج تک موجود ہے۔

تیسری بات جو بلوچ قوم کے لئے سب سے بڑا فاجعہ ہے وہ یہ ہے کہ بلوچ قوم کا وہ مرزوبوم یا مرکز اصلی جو موجودہ ایران کے شمال میں دریائے مازندراں یا کیسپین سی کی

شرقی، جنوبی اور غربی ملحقہ جوانب و اطراف میں تھا۔ جب پہلوی یا دوسری ایرانی زبان بولنے والوں کی ایک مرکزیت قائم ہوگئی تو وہ آہستہ آہستہ اپنی حکومت کی حدود بڑھانے کے لئے دیہاتوں اور پہاڑوں میں رہنے والی بلوچ قوم کو اپنے زیر نگیں لانے کی کوشش میں مصروف ہوگئے مگر اس خود سر اور آزاد منش قوم کو سوکھی روٹی اور جنگل کی زندگی بسر و چشم قبول تھی مگر غیر بلوچ کے زیر نگیں رہ کر عیش و آرام کی زندگی کبھی گوارہ نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی زبان بھی ان کے خیموں کی طرح ان کے کندھوں پر لدھی رہتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آخری بار نوشیرواں عادل نے بلوچ قوم کو ہر قیمت پر زیر کرنے کے لئے ان کے قتل عام کا مذموم حکم صادر کیا۔ اور بلوچ قوم کے لئے اپنے نام کے ساتھ "عادل" کی بجائے "ظالم" کا لفظ جڑوالیا۔

بلوچی زبان اور آثارِ قدیمہ

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلوچی بولنے والوں کی تعداد اُس زمانے میں بھی ایران میں رہنے والی دوسری اقوام کی تعداد سے کسی طرح کم نہ تھی (پاکستان کی طرح ایران بھی متعدد الاقوام ملت ہے اور ہر قوم کی اپنی جداگانہ اور منفرد زبان ہے جن میں فارسی، بلوچی، لری، کردی، ارمنی، ترکی زبانیں قابل ذکر ہیں۔ یہ اقوام آج تک ایران میں موجود ہیں اور ایران میں آج بھی لسانی بنیادوں پر صوبے قائم ہیں) اگر ایسا نہ ہوتا تو آج اس قوم کا ایک فرد بھی باقی نہ رہتا۔ علاوہ ازیں ازمنۂ ماضیہ میں یہ بھی ممکن تھا کہ ایک بڑی قوم کے مختلف قبائل میں سے چند ایک قبیلے ایک خاص قسم کی زندگی کو اپنے لئے بہتر سمجھ کر اپنی روایات سے منحرف ہو کر کسی دوسری ہم عصر قوم میں مدغم ہو کر منتشر ہو جاتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بلوچ قوم کا ایک یا اس سے زیادہ قبیلے اس وقت کی ایرانی مرکزی حکومت کو تسلیم کر کے ان کے انتظامیہ میں داخل ہو گئے اور ایک جری، لڑاکو اور دلیر قوم سے متعلق

ہونے کی وجہ سے اس قبیلے یا قبیلوں نے آخرالامر ایرانی تخت و تاج اور امورِ مملکت میں ہاتھ ڈال کر حکمراں خاندان ہو گئے اور پھر مرورِ زمانہ سے ان کو اپنی زبان سے بھی آہستہ آہستہ ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کی مثال ہمیں اپنے زمانے بیسویں صدی میں بھی ملے گی۔ جہاں پنجاب اور سندھ کے بلوچ حکمرانوں اور ملتان کے بلوچوں کی تاریخ ہمارے لئے اس بحث میں سب سے بڑی حجت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا جہاں بلوچ حاکم بن کر بھی اپنی زبان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ انہی اقوام کے ہو کر رہ گئے۔ اسی طرح اس میں امکان کی گنجائش ہے کہ ایران میں بھی چند بلوچ قبائل نے یہی عمل کیا ہوگا۔ کیوں کہ ایران باستان سے متعلق کتبے سنگ نبشتے اور آثارِ قدیمہ پر کندہ جتنی تحریریں ہمیں ملتی ہیں ان میں بیشتر الفاظ بلوچی زبان ہی کے ملیں گے۔ یہاں داریوش بزرگ اور خشیارشا کے یادگاری کتبوں میں سے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

بَگ وَزَرک اھُورمزدا ' ھیہ ایمام بومیم اَدا ' اَوَم آسمانم اَدا

ھیہ مرتیم اَدا ' ھیہ شیاتیم اَدا مرتیہتیا ! !

اب اس کی بلوچی بھی ملاحظہ ہو :۔

اھُورمزدا مزن بگ ، آئی ءَ اے زمین و آسمان دات

آئی ءَ مردم دات ، آئی ءَ شاتی دات مردم ءَ

دختِ خسرو

یہاں میں اس سلسلے میں ایک بہت بعد کے واقعہ کو دہراتا ہوں۔ جب پیغمبرِ اسلام مبعوث ہوئے اور جب خدا کی طرف سے ان کو حکم ہوا کہ تمام ملوک و سلاطین کو اسلام کی دعوت دیں تو انہوں نے حسبِ دستورِ ایران کے اس وقت کے شہنشاہ خسرو کے نام بھی

اسی قسم کا دعوت نامہ بھیجا لیکن خسرو نے اپنی ہتک سمجھ کر رسول اکرمؐ کے اس دعوت نامے کو پھاڑ ڈالا۔ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم کو یہ حال سنایا گیا تو فرمایا کہ انشاء اللہ میرے مکتوب کی طرح اس کی سلطنت بھی پارہ پارہ کردی جاتے گی۔

آخر کار جب عربوں کے ہاتھوں خسرو کی سلطنت واقعی پارہ پارہ ہوگئی اور جو ایرانی جوق در جوق مسلمان ہوگئے تو ان میں خسرو کی اپنی لاڈلی بیٹی بھی تھی۔ یہ بات تو تمام ایرانیوں اور قرب و جوار کی مملکتوں کو بھی عجب لگی کہ ایران کی اتنی بڑی اور مضبوط و مستحکم حکومت ان صحرانشینوں کے آگے کس طرح بے بس ہوگئی مگر کسی صاحب فکر و نظر نے ایک دن جاکر خسرو کی اسی مسلمان شدہ بیٹی سے خاص طور پر اس کا سبب پوچھا۔ اس خیال سے کہ امور مملکت سے شاید غداری، داخلی بدعنوانی یا نامعلوم غلطیوں کی وجہ سے اس سلطنت کا یہ حشر ہوا۔

اس وقت اسلام کی تمام خوبیوں نے خسرو کی بیٹی کے دل میں گھر کر لیا تھا اور اس نے اپنے باپ کی تباہی کا واحد سبب صرف ایک ہی جملے میں کہہ دیا۔ یہاں میں ان الفاظ کو جو کتب تاریخ میں رکارڈ ہوچکے ہیں بے کم و کاست اُنہی کلمات و زبان میں لکھوں گا جو خسرو کی بیٹی کی زبان سے نکلے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ "دیم ع خسرو سیاہ بیت کہ نامہ پیغمبر دریت"!

اب اس جملے کی بلوچی بھی ملاحظہ ہو :۔

"دیم خسروءِ شیاہ کہ نامہ ئے پیغمبرءِ دِرت ۔" یعنی "خسرو کا منہ کالا ہوا کہ اس نے پیغمبر کا خط پھاڑ ڈالا۔

میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ جملہ بالکل اور صاف بلوچی زبان میں ہے اور بعینہٖ اسی لہجے کی بلوچی اور ایرانی بلوچستان کے کئی علاقوں میں عام ہے۔ کیا یہ ہو نہیں سکتا کہ خسرو خود یا اس کی عورت اصل بلوچ قبائل کے اُن جرار قبائلی

سرداروں کی نسل میں سے ہیں جنھوں نے ایران کی امورِ مملکت میں شرکت کر کے بعد میں یہ پوزیشن حاصل کر لی تھی کہ اور چونکہ مردوں کے بہ نسبت زبان عورتوں کے ہاں زیادہ اور مزید مدت تک محفوظ رہ سکتی ہے اور اسی طرح خسرو کے گھر کی عورتوں کے ہاں یہ زبان یعنی بلوچی زبان خسرو کی تباہی کے کئی سال بعد تک کے زمانے میں محفوظ رہی۔

بلوچی ادب کی قدامت

جس طرح خود بلوچی زبان کی قدامت سے انکار ناممکن ہے ٹھیک اُسی طرح بلوچی ادب کی قدامت سے انکار کرنا حقیقت واقعہ سے منہ موڑنا ہوگا۔ کیونکہ بلوچی زبان ایک ایسی غنی زبان ہے جس میں وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک ادبی زبان میں ضروری ہیں۔ البتہ یہ بات فاجعہ ضرور ہے کہ چاکری دور سے پہلے کی کوئی بلوچی تحریر ماسوائے ان سنگ نبشتوں اور آثار قدیمہ کے کتبوں کے ہم تک نہیں پہنچ سکی لیکن یہ کوئی حیرت کی بات بھی تو نہیں کیونکہ بلوچ قوم سے ہزاروں گنا طاقت ور، منظم اور تاریخ ساز اقوام ایسی بھی ہو گزری ہیں کہ وہ اپنی کسی چیز کو دستبردِ زمانہ سے نہ بچا سکیں اور بالآخر خود بھی نیست و نابود ہو گئیں۔

یونانی، عرب اور دیگر جنگجو اور خود پرست اقوام کی طرح بلوچوں نے بھی اپنی فصیح و بلیغ زبان سے ذاتی، خاندانی، قبائلی اور قومی سطح پر اپنی بہادری، بیرگیری اور دیگر اوصاف کے سلسلے میں اچھی طرح استفادہ کیا ہے۔

ہر ایسی قوم جس کی زبان میں فصاحت و بلاغت بدرجہ اتم موجود تھی اُس نے اس کے استعمال سے بھی کبھی کوتاہی نہیں کی۔ چونکہ بلوچوں کی زبان میں یہ صلاحیت موجود تھی اس لئے یہ قوم تلوار کے دوش بدوش اپنی زبان کو بھی بالمثل استعمال کرتی رہی اور اس کے پاس مثل مشہور رہے کہ "تلوار کی کاٹ کا زخم

ٹھیک ہو سکتا ہے مگر زبان کی کاٹ کا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔"

عہد عتیق کے بلوچ شاعر

مذکورہ بالا اقوام کی طرح بلوچوں کے ہر قبیلہ میں شاعر ہوتا تھا۔ اگر کسی قبیلے میں شاعر نہ ہوتا تو وہ گونگا اور لاوارث سمجھا جاتا۔ کیونکہ عام دستور کے مطابق اس کے پاس اپنے بارے میں جنگ، مہم جوئی، بیرگری، اور قبائلی قابل فخر اوصاف کے بیان کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا اور اُن اَدوار کے مطابق یہ حقیقت ہے جس کا ثبوت انہی بلوچ قبائل کے بارے میں موجود ہے۔ چونکہ بلوچ قبائل کی ہر چیز کو محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ ان کی زبان اور شاعری تھی۔ اس لئے جس قبیلے کے ہاں شاعر تھے ان کی تاریخ یا ان کے بارے میں دوسری ایسی جانکاریاں کسی نہ کسی صورت میں اشعار میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچ گئی ہیں مگر وہ قبائل جن میں شعراء ناپید تھے اُنکی ہر چیز نیست و نابود ہو چکی ہے اور تاریخ میں ان کے وجود کا ثبوت بھی دوسرے قبائل کے اشعار و منظومات میں ان کے نام کا بر سبیل تذکرہ آنے پر ملتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ چاکر و گوُھرام کے زمانے میں بھی ہر جنگ یا مہم یا کسی ایسے واقعہ یا قبائلی اوصاف کے سلسلے میں اشعار کہے جاتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چاکر و گوُھرام یا ان کے زمانے کی دوسری شخصیات یا قبائل سے متعلق تصنیف شدہ منظومات کے ایک بڑے حصے کو لوگ اُس دَور سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ اشعار اگرچہ چاکری دَور کے بارے میں باتیں کرتے ہیں حتیٰ کہ عام طور پر ڈرامہ کے انداز اس طرح کے ہیں کہ جیسے یہ سب اشعار فی البدیہ ارتجالی کہے گئے ہیں۔ مگر یہ بلوچی شاعری کا خاصہ ہے اور آج تک اسی طرح کے اشعار کہے جا رہے ہیں جو کسی بھی گذشتہ بعید ترین زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ چند ایک نظموں میں کچھ اکّے دکّے چند ایک اشعار جو کینہ

(اسٹانزا) اُسی زمانے کی منظومات کا بچا کچا حصہ ہوں مگر اکثر و بیشتر یا اغلب منظومات شروع سے آخر تک بہت بعد کی کہی ہوئی ہیں۔ اور یہ بھی شک پڑتا ہے (جو تحقیقات کے بعد پایہ ثبوت تک پہنچایا جا سکتا ہے) کہ یہ تمام اشعار جو چاکر و گوھرام، بیبگر، نودبندگ، شہ مرید ھانی اور دیگر شخصیات سے متعلق ہیں ان کے شعرا۔ ایرانی بلوچستان، مکران، خاران اور دیگر مغربی علاقوں کے لوگ ہیں۔ یہ اشعار انہی علاقوں کے شعرا۔ کی تصنیف ہیں جو آہستہ آہستہ بلوچستان کی انتہائی مشرق میں پہنچ گئے ہیں

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز مستشرقین میں سے ڈیمس، منیٹر، اور لیچ وغیرہ نے جس محنت و مشقت سے ان اشعار کو اُن علاقوں کے لوگوں سے جمع کیا ہے وہ بالکل ٹوٹی پھوٹی اور بھونڈی صورت میں ہیں۔ اکثر منظومات کا آدھے سے زیادہ حصہ نہیں ہے اور جو کچھ بچا کچا حصہ جمع کیا گیا ہے وہ بالکل بے ربط، غیر مسلسل ہونے کے علاوہ زبان کے قواعد سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ حالانکہ وہی منظومات باقی سارے بلوچستان (ایرانی بلوچستان مکران، خاران وغیرہ) میں اپنی اصلی صورت میں ابھی تک دستیاب ہیں۔

اغیار پسندی

دوسری تسلیم شدہ حقیقت یہ ہے کہ بلوچ بڑی اغیار پسند قوم ہے چنانچہ بلوچ تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح صورت میں ثابت ہو جائے گی کہ یہ قوم ہمیشہ غیر بلوچ اقوام کی خدمت کو فخر سمجھتی رہی ماقبل تاریخ سے وہ مختلف ایرانی حکمرانوں کی خدمت گزار تھی اس کے بعد عرب، منگول، افغان، مغل اور بعد میں انگریز بہادر کی خدمت بڑے ناز سے کرتے رہے۔ ایک آدھ قبیلہ یا ایک آدھ سردار کو چھوڑ کر یہ کلیہ اس قوم پر مطلق طور پر عائد ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کے بعد بھی آج تک ہم اس کا بین ثبوت فراہم کر سکتے ہیں۔ البتہ اس سے کوئی انکار کی گنجائش نہیں کہ اس اغیار پرستی کے پیچھے ذاتی منفعت بڑی حد تک کارفرما تھی اور اب تک ہے۔

اگر بفرض محال اس قوم کو باہر سے کوئی غیر نہیں ملجاتا جس کے قدموں پر یہ اپنے بھائی کو بھینٹ چڑھادے تو اپنے ہی وطن میں رہنے والی دوسری غیر بلوچ اقلیتوں کی خاطر اپنے ہم قوم بھائیوں سے عداوت مول کر بلکہ اُن کو بری طرح ذلیل کرکے ان کو (اقلیتوں) کو اپنا حاکم وسرپرست بنا کر چین کا دم لیتی ۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی بلوچستان میں کئی ایک ' دیلمی، سلجوقی وغیرہ غیر بلوچ حکمرانوں کو بلوچ ہی کی پشت پناہی حاصل ہونے کی وجہ سے یہاں حکومت کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

دوسری طرف پاکستانی بلوچستان کے مختلف علاقوں میں دراوڑ اور راجپوت نسل کے غیر بلوچ خاندانوں کو اسی اغیار پرستی کے جذبے کے تحت، اپنا حاکم مطلق بنا کر بلوچ قوم فخر سے سر اونچا کرتی رہی ۔علاوہ ازیں متحدہ بلوچستان کے متحد مکران کے سواحل میں کوئی ایک سو سال سے لے کر دو سو سال تک عرب حکمرانوں کو فرشتہ سمجھ کر یہ قوم پوجتی رہی ۔ اس کے بعد آج تک یہ قوم متحد بلوچستان اور بیرون ملک میں مختلف اوقات اور احوال کے تحت داخلی یا خارجی اغیار کو پوجتی چلی آرہی ہے۔

اس سلسلے میں اگر کسی ایک علاقے میں اس قوم کو حب القوم نے زیادہ بیقرار کیا یا زیادہ صحیح معنوں میں اغیار نے خود اُن کی پیش کش کو مسترد یا ان کو کسی صورت میں راندۂ درگاہ کیا تو اس کو حبِّ قوم کی بیماری لگ گئی ۔لیکن اس میں بھی اغیار پرستی کو کافی دخل ہوتا تھا کیونکہ اس طرح پھر وہ اپنے ہیرو یا نظریاتی پیشوا یا حاکم مطلق کو اپنے علاقے سے باہر ہی کے رہنے والوں میں سے انتخاب کرلیتی تھی۔چنانچہ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلوچ قوم اکثر اُن شخصیتوں کو اپنا پیشوا ماننے کو قطعی تیار نہیں جو اس سے نسلی یا علاقائی لحاظ سے متعلق ہوں بلکہ ہمیشہ غیر مقامی شخصیت کو انتخاب کرکے اپنے جذبہ اغیار پرستی کو کس حد تک تسکین دیتی ہے۔چنانچہ گذشتہ ربع صدی میں مشاہدات سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اس قوم نے اس دوران میں آج تک کلّی یا

جزوی طور پر اغیار پرستی کے سلسلے میں کون سے کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں۔

چونکہ یہ بلوچ قوم کی ایک نہایت پُرانی اور غیر قابلِ تردید صفت ہے اس لئے چاکر و گوھرام کے زمانے اور اس کے بعد بھی بلوچستان کے وہ حصے جو چاکر کی سرداریت سے بالکل منقطع اور کٹے ہوئے تھے ان کے شاعروں نے بھی وہی اغیار پرستی کو تسکین دینے کی خاطر اُن کو یعنی چاکر ہی کو اپنا ہیرو بنا کر اُن کے بارے میں لمبی لمبی نظمیں تصنیف کیں۔ خصوصاً چاکر کے زوال کے بعد بلوچ قوم میں اپنے ہی نظریہ کے مطابق جب احساس زیاں پیدا ہو گیا تو اپنے دل کو تسکین دینے کی خاطر گزشتہ روایات کا سہارا لینے لگی اور اس وقت سے بلوچی اشعار (منظومات) کی تدوین شروع ہو گئی۔ اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جب بھی لوگوں کو اُن برائے نام ادوار زرّین کی یاد بیقرار کرتی تو وہ انہی اشعار کا سہارا لے کر تسلی پاتے۔

ادبی سرمایہ

کیسے بھی ہو یہ ادبی ضخیم اور قابل ستائش سرمایہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ یہاں ایک اور مسئلہ بھی درخورِ جواب ہے۔ وہ یہ کہ اس بلوچی اشعار یا منظومات کے ادبی سرمایہ کے ساتھ کا بلوچی نثر کا سرمایہ کہاں گیا۔ میں اس کو اُس سے بھی عظیم تر فاجعہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس وقت دنیا کی تاریخ بدل چکی تھی۔ اور فارسی زبان ایران افغانستان بلکہ برصغیر کے اکثر علاقوں پر چھا چکی تھی اور بلوچستان باوجود اپنی چھوٹی موٹی مرکزیت یا مرکز نما کیمپوں کے، طاقتور ہمسایوں کا سیاسی، اقتصادی، جغرافیائی اور عسکری دست نگری کے علاوہ ایک قسم کا مستقل اکھاڑہ بن چکا تھا اور آج تک بلوچستان کا سیاسی اور جغرافیائی نقشہ اس کا مدلل ثبوت ہے۔ اور انہی حالات نے اس کو ایران، افغانستان اور ہندوستان کی پیروی پر مجبور کر کے بلوچی زبان کی طرف توجہ کرنے کا موقع تک نہ دیا بلکہ ایسا کرنا اُس وقت اِس قومِ بلوچ کے لئے موت کا پیغام بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ تو

تاریخ میں ہے کہ ان تینوں بڑی طاقتوں کی سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ علاوہ ازیں بلوچستان کے مغربی حصوں کے کئی ایک سرداریوں پر دیلمی اور صفاری جیسی غیر بلوچ نسل کے خاندان یا تو مصلحت وقت کی بنا پر اور یا پھر ان طاقتور شاہنشاہوں کی رضایت پر زبردستی سے حکمرانی کر رہے تھے جو ابتداً خود بلوچ قوم ہی کی اغیار پرستی نے اختیار اقتدار ان کے ہاتھ دلوایا تھا جن کو یقیناً بلوچی زبان کی ترویج و ترقی کی فکر کبھی لاحق ہی نہیں ہوتی ہوگی۔ شعری ادب چونکہ ایک فصیح و بلیغ زبان رکھنے والی قوم کی روایات میں شامل ہے اس لئے اِس صنف ادب کا کسی طرح بھی دبایا جانا محال اور ناممکن تھا۔

پندرھویں صدی کے بعد کا شعری ادب

یہ بات بھی ہمارے لئے ماتم انگیز ہے کہ اس پندرہویں صدی کے بعد کے شعری ادب کے سرمایہ کے سوا اِس سے قبل کے کسی دور کا یہی سرمایہ بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا جس کے اسباب و علل وہی ہوں گے جو بلوچی زبان کے سلسلے میں اوپر دیئے گئے ہیں۔ البتہ پندرھویں صدی کے پہلے کے شعری ادب کا ایک حقیر سا حصہ افتاں وخیزاں بُری طرح شکست و ریخت کی حالت میں ہم تک پہنچ سکا ہے جس کے کچھ حصے ابھی تک لوگوں کو زبانی یاد ہیں جن کو ابھی تک رشتۂ تحریر میں ڈالا نہیں گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہم دودھے' دیہاتی گیت، کھیلوں کے گیت، لوریاں، چیستاں وغیرہ کا نام دے سکتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت کو بھی ہم مانتے ہیں کہ یہ سرمایہ بھی حوادثِ زمانہ کی زد سے نہ بچ سکا اور آج تک اُن کا جو بچا کچا حصہ باقی ہے رکارڈ نہ کرنے کی وجہ سے اس کے مزید ضائع ہونے کا شدید امکان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پندرہویں صدی کے بعد کا شعری ادب وہی رکارڈ شدہ

قدیم ادب یا کوئی بھی نام اس کو دیدیں ہمارا سب سے قدیم موجودہ سرمایۂ ادب مفروض ہوگا۔ اُسی شعری ادب میں اُس زمانے اور نظریات کے مطابق اُس وقت کی زندگی کے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ مثلاً اُس میں رزمیہ، طربیہ، ہجو، قصیدہ، حکایات روایات اور واقعات، ہر قسم کے اشعار ملتے ہیں البتہ رزمیہ اشعار کو بلوچی قوم کی افتاد طبع اور قومی روایات کے علاوہ اس وقت کی حالات کے پیش نظر اولیت حاصل رہی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے، کہ بلوچ قوم کے ہر قبیلے کے اپنے اپنے خاص شاعر ہوا کرتے تھے جو اکثر و بیشتر حکام کے دربار سے منسلک ہوا کرتے تھے جو حسب ضرورت یا حسب الحکم اپنے قبیلے کے آباو اجداد کی بہادری کی داستانیں، قبیلے کے متعلق لڑائیوں کے قصے، اپنی فتح اور دشمن کی شکست کی کہانی اور قبیلے کی دوسری معاشرتی اور اخلاقی خوبیاں نظم کرکے یونانی اور عرب شعراء کی طرح گوّیوں کو حفظ کرواکر بھیج دیتے تاکہ گاؤں گاؤں جاکر ان اشعار کو گاکر عوام و خواص تک پہنچائیں۔ اس کی مثال یونانی "اوڈیسے" (odyssey) اور "الیاڈ" (Iliad) اور دیگر اشعار میں ملتی ہے۔

وصفِ منظومات

یہ نظمیں مختلف موضوع اور جداجدا مضامین پر مبنی ہونے کے باوجود چند ایک خصوصیات میں مشترک ہیں۔ مثلاً اشعار باوزن ہوتے ہیں اور پوری نظم ایک ہی وزن کی پابند ہے۔ دوم تمام نظمیں قافیہ بندی پر مبنی ہیں۔

نظمیں چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور لمبی بھی۔ بڑی نظموں کی لمبائی ساٹھ ستر سے لیکر دو ڈھائی سو مصرعوں سے بھی تجاوز کرجاتی ہیں۔ البتہ ایک چیز بلوچی میں عربی نظموں سے مختلف ہے کہ اکثر نظموں میں ہر چند ایک مصرعوں کے بعد اغلب گفتگو کا پیرایہ بدلتے

ہوتے قافیہ بھی بدل جایا کرتا ہے۔ وگرنہ آخر تک ایک قافیہ باقی رہتا ہے۔

قافیہ اور وزن

یہاں ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بلوچی زبان وادب اور خصوصاً قدیم شاعری سے نا آشنا لوگوں نے ایک ایسا غلط نظریہ اپنے پلّے سے قائم کیا ہے کہ اس کے بارے میں لکھنا ناگزیر ہے۔ ان لوگوں نے نہ جانے کس تحقیق یا کس نظریے کے تحت یہ بے بنیاد رائے قائم کرلی ہے کہ بلوچی زبان کی قدیم شاعری ایک بالکل آزاد شاعری ہے یعنی اس میں قافیہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ان کی لاعلمی اور نادانستگی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ان حضرات کی سب سے بڑی دلیل ڈیمس، لیچ اور میئر جیسے مستشرقین کی جمع کردہ اور رومن بلوچی میں شائع شدہ بلوچی منظومات ہیں جو قافیہ سے آزاد ہیں۔ سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ یہ وہی اشعار ہیں جو پندرھویں صدی کے بعد کہے گئے ہیں لیکن ان کو ان مستشرقین نے تو صرف انیسویں صدی کے اواخر یا بیسوی صدی اوائل میں رشتہ تحریر میں لایا ہے مثلاً سب سے زیادہ مستند ڈیمس کی کتاب ہے جو ایک ہزار نو سو سات (۱۹۰۷ء) میں چھپ چکی ہے۔ اگرچہ ہم ان منظومات کو خود پندرھویں صدی کی تصنیف نہیں مانتے لیکن بعید سے بعید ہم ان کو سترھویں صدی سے پہلے کی تصنیف ماننے کو کبھی تیار نہیں ہوتے۔ البتہ اگر ان میں ایک آدھ ایسی چھوٹی موٹی نظم یا کچھ ایسے اشعار کی موجودگی مان لیں جو پندرھویں صدی یا سولھویں صدی سے متعلق ہو تو انتہائی فراخ دلی ہوگی۔ پھر ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے یہ کبھی بھی رشتہ تحریر میں نہیں لائی گئی تھیں یعنی اتنی مدت تک (کم از کم دو صدیوں تک) یہ صرف لوگوں کو زبانی یاد تھیں اور ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقل ہوتی رہی ہیں۔ زبانی یاد کردہ چیزوں کی حالت یہ ہے کہ ہوتے ہوتے اُن میں بھاری غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور پھر ان دو صدیوں میں نہ جانے یہ نظمیں کتنے سینوں کے حوادث وطوفان

سے دوچار ہونے اور ٹوٹنے، پھوٹنے، کم وکاست و شکست وریخت کے بعد آکر ان تک پہنچ گئی ہوں گی۔ پھر ایک اور حقیقت یہ ہے کہ ان نظموں میں سے اکثر و اغلب متحدہ بلوچستان کے وسطی اور مغربی علاقوں میں کہی گئی ہیں اور پھرتے پھراتے اسی سینہ بہ سینہ کی صورت میں بلوچستان کے مشرقی بعید علاقوں میں پہنچ گئی ہیں۔ اوّلاً تو یہاں تک پہنچتے ان کا ایک اچھا خاصا حصہ ضائع ہو چکا ہو گا۔ علاوہ ازیں جن علاقوں سے ان مستشرقین نے یہ اشعار جمع کیے وہ بلوچستان کے مشرق میں آخری وہ علاقے ہیں جن کے رہنے والے مری بگٹی لہجہ میں بولتے ہیں۔ یہ بلوچستان کے وہ علاقے ہیں جن کی سرحدیں سندھ پنجاب (بشمول ملتان) اور پختون علاقوں سے اس طرح ملی ہوتی ہیں جن کی طاقتور زبانوں نے اس علاقے کی بلوچی زبان پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کی بلوچی زبان اس طرح متاثر ہوتی ہے کہ باقی تمام بلوچستان میں عام بولنے والی بلوچی زبان سے یہ نمایاں طور پر پہچانی جا سکتی ہے اور اس لہجے کو اکثر لوگ "مری" لہجہ کہتے ہیں یا "مری بلوچی"۔

یہ تاریخی شہادت ہے کہ چاکر رند کے بعد اس طرف کے اکثر "بلوچ" مکمل یا جزوی طور پر سندھ، سرائیکستان، اور پنجاب میں مدغم ہو گئے اور جو باقی بچے وہ اتنا متاثر ہو گئے کہ وہ اپنی زبان کا بیشتر حصّہ بالکل کھو چکے اور باقی بچا ہوا حصّہ مسخ شدہ صورت میں ابھی تک موجود ہے جو اس بات کی خود دلیل ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کے لئے تو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں کہ انہی علاقوں یعنی سندھ، پنجاب اور سرائیکستان میں لاکھوں بلوچ اپنی زبان سے قطعی طور پر ہاتھ دھو بیٹھے جن میں خود چاکر رند کا اپنا خاندان بھی شامل ہے جس نے پنجاب میں سکونت اختیار کر کے اپنے سارے خاندان کو اپنی زبان سے محروم کر دیا اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب گوھرام نے چاکر کو آخری اور فیصلہ کن شکست دیدی جس کے نتیجے پر چاکر نے بلوچستان تک کو چھوڑ کر پنجاب میں پناہ لی تو گوھرام نے اسی وقت پیش گوئی کی تھی جو اشعار میں ابھی تک رکارڈ ہے۔ اشعار میں گوھرام چاکر

کے متعلق کہتا ہے ہے " بلوچی زبان کے بولنے کے لئے اس کے بچے لکنت زدہ (گنگ) ہوں گے اور عورتیں اس سے جاموٹی (سندھی) زبان میں بولیں گی ۔"

اب جن لوگوں سے ان مستشرقین نے یہ اشعار جمع کر لئے ہیں، ان منظومات اور اشعار میں جتنی غلطیاں، نقص یا بے عزانیاں پائی جاتی ہیں وہ سب انہی لوگوں کی مہربانیاں ہیں ورنہ ان لوگوں کی غلطیوں کو بلوچی شاعری کے سر تھوپنا سراسر ظلم و تعدی ہے۔ اس حقیقت کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہی نہیں کہ سندھ، پنجاب اور سرائکستان کی زبانوں نے جس طرح بلوچ اکثریت کو ان کی زبان سے محروم کر دیا اسی طرح مجاور بلوچی علاقوں میں رہنے والے بلوچی زبان بولنے والوں کی زبان کو بھی زبردست متاثر کیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان علاقوں کی زبان کچھ عجیب صورت اختیار کر چکی ہے ۔ اور میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جس طرح صدیوں سے یہ لوگ بلوچستان کے باقی نوے فیصد حصوں کے لوگوں سے یکسر الگ تھلگ رہے تھے ۔ اگر یہ بلوچی ادب کا دورِ جدید نہ آتا تو اس انعزال اور انقطاع کا نتیجہ یہ نکلتا کہ یہ لوگ بھی اپنی زبان کھو دیتے اور انہی اقوام کی زبان اپناتے جس کا ثبوت ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہے ۔

یہ شواہد بھی ہمارے سامنے موجود ہیں کہ وہ بڑی بڑی اور لمبی لمبی بین البلوچستانی داستانیں جن میں شیہ مریدھانی، للہ گرانا ز، جاکر گوھرام جیسی نظمیں قابل ذکر ہیں ۔ اور جن کو سارے بلوچستان میں بلوچوں سے گہرا تعلق رہا ہے ان کی پوری نظمیں بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں ابھی تک اسی طرح محفوظ تھیں اور ابھی تک ہیں ۔ لیکن ان کی حالت وہ نہیں ہے جو ڈیمس وغیرہ کے مسخ شدہ نسخوں میں ہیں بلکہ یہاں تو یہی نظمیں بالکل باقوافی، با اوزان اور با لفظ صحیح اور زبان کے صحیح قواعد کے مطابق موجود ہیں ۔ (میرے پاس ڈیمس کی " پاپولر پوئٹری آف بلوچز " موجود ہے ۔ انشاء اللہ اگر فرصت ملی تو اس میں درج شدہ تمام منظومات کی اصلاح کرنے کی

کوشش کروں گا) البتہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ بلوچی قدیم شاعری قافیہ بندی پر مبنی ہے کہیں کہیں اگر ردیف بھی ہے تو محض صدفتہً (اتفاقیہ) ہے عمداً نہیں کیا گیا ہے۔ اور ہاں جیسے کہ مذکور ہوا ہے، بلوچی شاعری میں قافیہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہی کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں مقید ہے۔ دوسری یہ کہ ایک نظم میں مختلف قوافی استعمال کئے گئے ہیں یعنی ہر چند مصرعوں کا مجموعہ ایک مختلف قافیہ میں محسور ہے جن کو آپ انگریزی کا نام "سٹانزا" STANZA" دے سکتے ہیں۔ اور اکثر نظمیں اسی دوسری قسم کی ہوتی ہیں البتہ ایسی نظموں میں یہ بالکل ضروری نہیں کہ ان تمام جو کبندوں (STANZA) کے مصرعے تعداد میں برابر ہوں۔

ڈیمس کی اسی کتاب میں سب سے قدیم ترین نظم کی حیثیت سے جس نظم سے کتاب کی ابتدا کی گئی ہے۔ یہ پوری پوری نظم ایک ہی قافیہ پر مبنی ہے۔

قدیم شعراء قدیم شاعری کے بارے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے مصنفین شعراء کے نام غیر معلوم ہیں ماسوای ایک آدھ نظم کے جس میں شاعر نے عمداً و قصداً اپنے بارے میں کسی وجہ سے اپنی نظم میں کچھ کہا ہو۔ لیکن ایسے ناموں پر بھی اعتبار نہیں کیا جاتا کیونکہ ایسے ناموں کے علاوہ ایسی پرانی نظموں میں کتی ایک بعد کے شعراء نے تفنّن یا نہ جانے کس نظریہ کی بناء پر اپنی طرف سے کئی کتی مصرعے بڑھا دیئے ہیں۔

ویسے عام طور پر لوگوں نے ہر نظم کو ایک نہ ایک شخص سے منسوب کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ کتی ایک نظموں میں کسی شاعر کا نام بعد میں اپنی مرضی کے مطابق لوگوں نے ڈال دیا ہے۔

اس طرح منسوب کرنے میں بھی عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً رزمیہ شاعری میں میر چاکر کے قبائلی یا درباری شعراء نے حسب حکم یا حسب طبع اگر کوئی نظم کہی ہو جس میں چاکر اور اس کے حریف کبیر گوہرام سے لڑائی میں اپنے سردار کی فتح اور دشمن کی شکست کی داستان ہو۔ اس سلسلے میں شاعر اپنے اشعار اکثر کچھ اس طرح ترتیب دیتے

کہ گویا چاکر ہی اپنی زبان سے اپنے حریف سے مخاطب ہے۔ نظم کا یہ حصہ ہمیشہ منظوم ڈرامے کا ایک حصہ لگے گا۔ اسی قسم کی ڈرامائی منظومات کو لوگوں نے چاکر ہی سے منسوب کردیا ہے۔ اسی طرح گوہرام یا دوسرے قبائلی سردار یا کسی اور شخصیت بارزہ کے بارے میں کہی گئی نظموں کو لوگوں نے انہی سے منسوب کررکھا ہے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر سچائی نہیں۔ رزمیہ شاعری کے علاوہ عشقی منظوم داستانیں بھی ان سے متعلق، عاشق و معشوق سے منسب کی گئی ہیں اور ان منظومات میں ڈائیلاگ کی صورت میں جو کچھ عاشق کی طرف سے کہا گیا ہے ان کو عاشق ہی کی تصنیف کہہ کر اس سے منسوب کیا ہے اور اسی طرح جو کچھ معشوق نے اس کے جواب میں کہا ہے وہ بھی معشوق کی تصنیف مان کر اس سے منسوب کیا گیا ہے یعنی ایک نظم دونوں سے منسوب ہے۔ وزن، قوافی اور انداز فکر وسخن اور زور بیان میں تمام نظم میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کیونکہ درحقیقت ایک ہی نامعلوم شخص کی تصنیف ہے جس نے نہ جانے پچاس یا سو سال بعد اس داستان کو لوگوں سے سن کر نظم میں پرو دیا ہے۔ عوام تو خیر عوام ہیں مگر ہمارے کچھ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لوگ بھی انہی جاہلوں کی طرح اس افسانے پر مصر ہیں اور اکثر جذباتی ہو کر بزعم خود اپنے قومی ہیروں کو صاحب سیف و قلم منوانے کی بیہودہ بے بنیاد اور مضحک کوشش کرتے ہیں۔

قدیم شاعری کا مدّوجزر

یہ بلوچی قدیم شاعری جو سولہویں[16] صدی کے اواخر یا سترھویں کی ابتداء میں شروع ہو گئی تھی پھر اسی سترھویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے جزر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ جزر بالکل سمندری جزر کی طرح اٹھارہویں صدی میں دوبارہ آہستہ آہستہ مد کی طرح بڑھنا شروع کردیتا ہے اور پھر انیسویں صدی میں اس قدیم طرز کی شاعری کی نشأۃ ثانیہ واقعی قابل ستائش اور لائق فخر عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اس بار اس کا سہرا کسی بھی پہلو سے چاکر کے سیبی و ڈھاڈر اور اس کے ملحق علاقوں کے سر نہیں بلکہ مکران

خاران کے علاوہ ایرانی صوبہ بلوچستان و سیستان کے وسیع و عریض علاقوں میں پروان چڑھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس دوران مری بگٹی علاقوں میں بھی اچھے شعراء پیدا ہوتے لیکن ان کی تعداد اور اشعار کا ذخیرہ مذکورہ فوق علاقوں کی نسبت بالکل حقیر ہے اس کے باوجود ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور بلوچی شعری ادب میں ان کا اچھا خاصا مقام ہے۔

اگرچہ انیسویں صدی کے نصف کے بعد اس قدیم شاعری نے ایک بار پھر سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی انقلابات کی وجہ سے جزر ہونا شروع کر دیا۔ مگر زوال کی حد تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی بڑی عجلت سے اپنا معیار برقرار رکھنے میں دوبارہ کامیاب ہوگئی اور آج تک مسلسل اپنا وقار باقی رکھے ہوئے ہے۔ یہ آخری بات بہت لوگوں کے لئے یقیناً بالکل نئی ہوگی لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ بلوچی کی وہ قدیم ترین شاعری جس کے نمونے ہم تک پہنچے ہیں اس قسم کی شاعری جب سے بھی شروع ہو گئی ہو وہ کبھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہے۔ البتہ دوسری زبانوں کی شاعری کی طرح اسباب وعلل و عوارض کی وجہ سے اس میں کبھی سست رفتاری، ٹھہراؤ یا جزر کی سی صورت ضرور پیدا ہوتی رہی۔ لیکن یہ بطاءِ یہ تعطّل اور یہ مکوث صرف مؤقتی اور غیر مستدیم ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ چاکری دور کے خاتمہ اور اس کے بعد اس کے حریفوں کے عہد زریں کی انتہا کے بعد ان علاقوں میں جو پراگندگی پھیل گئی اور اُن کے تقریباً تمام قابلِ ذکر سردار امراء اور روسا سندھ، ملتان، پنجاب میں جاکر آباد ہوگئے تو ظاہر ہے کہ ان کے درباری یا طفیلی شعراء کو بھی تلاش معاش کیلئے وہاں جانا پڑا اور پھر جس طرح ان سرداروں، امراء، اور رؤسا نے بلوچستان سے باہر رہ کر اپنی زبان تک کھودی تو بھلا بلوچی شعر و شاعری وہاں کیسے برقرار رہ سکتی نتیجے کے طور پر ہجرت کئے ہوئے ان درباروں کے شعراء کا بلوچستان سے باہر رہ کر خاتمہ ہی ہوگیا۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ اچھے اور قابل شعراء سب کسی نہ کسی دربار سے متعلق تھے ان کے ساتھ ہجرت کر گئے۔ باقی رہے کچھ ایسے شاعر جن کی قدرو

منزلت پہلے ہی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اب جبکہ وہ ماحول ہی باقی نہ رہا تو ان کی شاعری کو پنپنے کا کوئی موقع اس لئے میسر نہ ہوا کہ کوئی ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا ہی باقی نہ رہا تو اس علاقے میں اس فن کو عارضی موت سے دوچار ہونا پڑا۔

مگر دوسری طرف مکران، خاران اور ایرانی بلوچستان میں کوئی ایسا واقعہ ۱۹۲۵ء سے پہلے ظہور پذیر نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں یہ قدیم شاعری کا سلسلہ کبھی بھی منقطع نہیں ہوا۔ البتہ حالات، کوائف، یا انقلابات کی وجہ سے اس میں مدّو جزر ضرور ہوتا رہا۔ لیکن یہ مدّو جزر موجودہ صدی میں کئی حاکم زبانوں کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بلوچی قدیم شاعری کبھی سکون اور کبھی شوریدہ سری کی حد تک ان تمام صدیوں میں برابر قائم رہی ہے۔ خصوصاً انیسویں صدی کے نصف کے بعد سے تو یہ مکمل اور شاندار صورت میں ترقی کرتی گئی اور بیسویں صدی کے شروع ہونے سے بہت ہی پہلے ایک ایسی بلندی تک پہنچ گئی کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

قدیم شاعری مخالفت کے باوجود پنپتی رہی

انگریزوں کی آمد اور دیگر سیاسی انقلابات کی وجہ سے بلوچستان میں بھی حالات ہمیشہ غیر یقینی طور پر تبدیل ہوتے رہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ نئی زندگی اور نئے خیالات سے بلوچ نئی نسل بھی آشنا ہوئی۔ نئے دور نے اپنے ساتھ بہت ساری نئی چیزیں لاکر پرانی کئی ایک روایات پر شبخون مارا۔ انہی روایات میں ایک یہی بلوچی قدیم شاعری سے دلچسپی تھی جیسے کہ ہوتا رہا ہے یہ تبدیلیاں شہروں میں شروع ہوگئیں اور ان کا سب سے بڑا اثر نوجوان طبقہ پر پڑا۔ اور وہ راستے سے بھٹکنے لگے اور جیسا وقت گزرتا گیا ان نوجوانوں پر غیر زبانوں کی تعلیم، غیر لوگوں کی صحبت کا اثر، اور اغیار

کی حکمرانی نے اتنا تک اثر کرلیا کہ وہ اپنی ہر چیز کو بری اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور اپنی تمام روایات کو جن میں یہی قدیم شاعری بھی شامل تھی معیوب سمجھنے لگے۔ غضب تو یہ ہوا کہ ایک طرف تو نوجوان نسل کو بہکانے میں کامیابی سے قدم اٹھاتے ہوئے بیرونی اثرات آگے بڑھ رہے تھے۔ اور دوسری طرف ملّایانہ ذہنیت والے اور بزعم خود مذہب اور اخلاق کے ذمہ دار علماء نما شخصتیں بھی ایسی قومی روایات کے خلاف میدان میں کود پڑیں۔ ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور شہری بزعم خود سمجھ دار طبقہ کی دلچسپی بلوچی قدیم شاعری سے کم ہوتی گئی۔ اور ان کی معلومات بھی اس فن کے بارے میں کم ہوتی گئی۔ لیکن یہ بھی ایک غنیمت تھی کہ بلوچستان میں صحیح معنوں میں شہری آبادی بہت کم ہوتی تھی کیونکہ خود شہر بھی سوای چند ایک کے صحیح معنوں میں شہر کہنے کے لائق نہ تھے۔ البتہ بلوچوں کی یہ شہری آبادی بلوچستان سے باہر سندھ، پنجاب، مہاراشٹرا، گلف کے شیخ نشینوں میں رہتی تھی اور بھاری تعداد میں رہتی تھی۔ اور پھر بلوچوں میں تعلیمی حالت اتنی زبوں رہی کہ اس کا اثر انتہائی محدود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچ عوام نے قدیم بلوچی شاعری کے ساتھ ہمیشہ گہری وابستگی رکھی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بلوچستان میں شادی بیاہ اور کسی دوسری خوشی کے موقع پر قدیم اشعار کے گانے والے گویّوں کی بڑی بڑی مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں اس کے علاوہ تفریحی اور دوسری مخصوص مجلسوں میں بھی یہ اشعار دلچسپی سے سنے جاتے تھے۔ مزید ایک روایت یہ بھی تھی کہ ہر سال دو ایک پہلوان (گوتپے) بلوچستان کے دورے پر نکل جاتے تھے اور وہ شہر، شہر، گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور بندر بندر کا دورہ کرکے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے اور کمال کی بات یہ ہے۔ یہ سلسلے ابھی تک اسیطرح جاری ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان صدیوں میں قدیم بلوچی شاعری مسلسل جاری رہی اور خصوصاً انیسویں صدی نے تو مایہ ناز اور قابل قدر شعراء کو جنم دیا۔ البتہ اس تلخ حقیقت سے انکار

مشکل ہے کہ سندھ، پنجاب اور سرائکستان کی ہمسائیگی میں رہنے والے بلوچ باقی تمام بلوچستان سے بالکل منعزل اور منقطع رہے کیونکہ باقی بلوچستان اور ان کے درمیان "لسں" سے کوئٹہ تک کا پورا علاقہ ایک سدِ سکندری کی طرح حائل ہے اور یہ بات پرلطف ہے کہ بلوچستان کے اس مشرق بعید سرحدی علاقے میں رہنے والوں نے کبھی اس سد کو پار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے لوگ باقی بلوچستان سے بالکل کٹ کر زندگی بسر کرتے رہے اور آج تک تقریباً یہی حال باقی ہے۔ البتہ ان علاقوں کے لوگ پنجاب، سندھ، ملتان کے علاوہ پختونوں سے زیادہ مربوط رہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کو باقی پورے بلوچستان کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں ہے اگر ہے بھی تو ان کے ذرائع وہی انگریز نویسندگاں ہیں۔ جس طرح اس علاقہ اور اس کے لوگوں کو پورے بلوچستان کے بارے میں واقفیت نہیں۔ ٹھیک اسی طرح ان کی معلومات بلوچی زبان اور شاعری کے بارے میں بھی محدود ہیں۔ اگرچہ باقی پورا بلوچستان بھی اس منعزل چھوٹے علاقے اور اس کے لوگوں سے غیر مربوط رہے اور یہ ضروری ہے کہ ان کی واقفیت کا بھی وہی حال ہو جو ان کا ہے لیکن ایک بات یہاں قابل ذکر ہے کہ چونکہ بلوچی قدیم شاعری میں ان مشرقی علاقوں کو اہمیت دی گئی ہے اس لئے اسی شاعری کی وجہ ہے کہ بلوچستان کے لوگ ان علاقوں سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں مگر ان مشرقی لوگوں کو تو کوئی بھی ایسی چیز میسر نہیں جس کے ذریعے وہ عظیم بلوچستان اور اس کی زبان اور قدیم شاعری کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر سکیں۔

مطلب یہ کہ بلوچی قدیم شاعری سارے بلوچستان میں ابھی تک بالکل مکمل صورت میں باقی ہے بلکہ ہم یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ آج کے دور میں بھی آپ کو اتنے ہی اچھے شعراء ملیں گے جو قدیم شاعری کے کسی بھی دور میں موجود تھے اور مزید برآں آج ان کی تعداد پرانے

کسی بھی دَور کے شاعروں کی تعداد سے کم نہیں ہے اور ہم بلا چون وچرا بلکہ فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ اسی غیر منقطع اور مسلسل قدیم شاعری کے مادرانہ دامن سے آج کی جدید شاعری کی بیش بہا سوغات ہمیں مل گئی ہے۔ اور یہ میرا ایمان ہے کہ بلوچی جدید شاعری کی ارتقاء اور نمو کے لئے بلوچی قدیم شاعری ہی واحد لابدی چیز ہے۔ اور ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ موجودہ جدید شاعری میں کامیاب ترین شعراء وہ ہیں جنھوں نے بلوچی قدیم شاعری سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور جن شعراء نے اس سے اجتناب کیا وہ آج تک ہوا میں ہاتھ پاؤں مارتے نظر آئیں گے۔

جدّت، انقلابات اور نئے رجحانات

انیسویں صدی کی قدیم شاعری جس کو میں نے نشأۃ ثانیہ کا نام دیا ہے اپنی سابقہ مربوط اور غیر منقطع شاعری سے کوئی مختلف نہیں ہے۔ یعنی وہی اوزان کی پابندی، وہی لمبی لمبی نظمیں اور وہی قافیہ بندی ہے۔ البتہ اس میں کئی نئی چیزوں کا اضافہ بھی ہو گیا ہے جن کو ہم بالترتیب بیان کریں گے۔

اوّل یہ کہ اس صدی میں بلوچستان میں فارسی زبان پاؤں جما چکی تھی اور جتنے بھی پڑھے لکھّے لوگ تھے سب کے سب کا ذریعہ تعلیم فارسی تھی۔ چونکہ اس دَور کے اکثر وبیشتر شعراء فارسی پڑھے ہوتے تھے اس لئے اُن کے اشعار میں فارسی کے الفاظ کا نمایاں طور پر اضافہ ہوا اور عربی زبان کے الفاظ بھی فارسی کے راستے بلوچی تک پہنچ گئے۔ علاوہ ازیں مذہبی نظریات بھی اِن خواندہ حضرات نے بلوچی اشعار میں ڈھالنے شروع کر دیئے۔

یہ مسلّم امر ہے کہ جس دَور میں جس زبان کی تعلیم عام ہو جاتی ہے اس زبان کو لوگ فخریہ اپنی گفتگو اور نوشت وخواند میں استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔ انگریزی ہی کو لیجیے۔ آج تک برصغیر میں انگریزی جاننے والوں کی قدر ومنزلت ہر طبقے کے لوگوں

میں معلوم ہے۔ اسی طرح جب فارسی اور عربی نے بلوچستان میں اپنے پاؤں جما دیئے تو لامحالہ پڑھے لکھے لوگ ان کے الفاظ کا استعمال فخر سمجھنے لگے اور خصوصاً وہ لوگ جو ان زبانوں کی قدر مذہبی نکتہ نظر سے کرتے تھے۔ یہی حال بلوچوں کا تھا عربی زبان کو وہ مذہبی فخر کے ساتھ استعمال کرتے تھے اور فارسی تو سیاسی تسلّط کی سوغات تھی جس سے کوئی مفر نہیں۔ اس حقیقت کو ہم جانتے اور مانتے ہی ہیں کہ فارسی کے کثرت استعمال نے بلوچی زبان کو کافی نقصان پہنچایا یا زیادہ صحیح الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی نہیں بلکہ عربی کے الفاظ نے فارسی سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ مگر فارسی زبان اس کی ذمہ دار ضرور ہے۔ کیونکہ فارسی ہی کے چور دروازے سے عربی الفاظ بلوچی زبان میں گھس آتے تھے۔ مگر اس میں ان شاعروں کا دوش بھی تو نہیں ہے۔

ہر شاعر اپنے دَور سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اُس زمانے میں زبان کے متعلق لوگوں کا نکتہ نظر وہ نہ تھا جو آج ہے۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اُن کو اس بات کا علم ہوتا کہ اس طرح کرنا ان کی زبان کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ یقیناً کبھی ایسا نہیں کرتے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جس چیز کو لوگ علم و دانش کا معیار سمجھیں گے اس چیز کا مظاہرہ ناگزیر ہو جائے گا۔

اردو شاعری کو لیجیے جس میں اردو کے "کا، کے، کی، ہیں، کبھی، نہیں" وغیرہ جیسے الفاظ کے سوا باقی سب کے سب فارسی اور عربی الفاظ ہیں اور یہی اردو شاعری کی علمیت کا معیار ہے۔ تو کیا اردو شاعری روبہ تنزل ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اردو کا اپنا سرمایۂ الفاظ محدود ہے اس لئے اس کے شعراء مجبوراً فارسی کا دامن تھام لیتے ہیں اور دوسری طرف بلوچی زبان کا سرمایۂ الفاظ اتنا ضخیم ہے کہ اس کو کسی بھی غیر بلوچی لفظ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

غیر زبانوں کا اثر

جس زمانے میں پورے متحد بلوچستان میں بلوچی

شاعری پر فارسی کا اثر پڑنے لگا تھا دوسری جانب بلوچستان کے اس چھوٹے حصے میں جو وہی انتہائی مشرقی حصہ ہے جو کہ پنجاب، سندھ، ملتان اور پختون سرحدوں سے ملتا ہے۔ وہاں بلوچی زبان پر ان مجاور زبانوں کا اتنا اثر ہونا شروع ہو چکا تھا کہ اس کا عشر عشیر بھی فارسی زبان نہ کر سکی۔ مثلاً مری بگٹی زبان پر سندھی، سرائیکی اور پنجابی نے اتنا تک اثر کیا کہ وہاں کی بلوچی زبان سن کر یہ شک ہونے لگتا ہے کہ یہ کیا واقعی بلوچی زبان ہے؟ سندھی، سرائیکی اور پنجابی زبانوں کے الفاظ کا وہاں کے بلوچی روزمرہ کی زبان پر اثر کا یہ حال ہے کہ خود بلوچی زبان کے الفاظ اُن زبانوں کے تلفظ اور لہجے میں ادا کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بلوچی گرامر اور نحوی تراکیب بھی اتنے بگڑ کر رہ گئے ہیں کہ جملے کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ پورے متحد بلوچستان میں اگر فارسی اپنا اثر بلوچی زبان پر چھوڑ گئی۔ لیکن بلوچی زبان کے گرامر اور نحوی قواعد پر تو کچھ اثر نہ کر سکی۔ اس کے علاوہ روزمرہ گفتگو کی زبان پر کوئی قابل ذکر اور نمایاں تبدیلی بھی واقع نہ ہوئی لیکن اُسی دوران بلوچستان کے اس چھوٹے مشرقی علاقے کی زبان پر ان مجاور زبانوں نے اتنا اثر کیا ہے کہ اس کی اصلی صورت تک مسخ ہو گئی ہے۔ لیکن ان اثرات کے بارے میں ایک نمایاں چیز یہ ہے کہ متحد بلوچستان میں فارسی کا یہ اثر صرف بلوچی اشعار پر ہوا ہے جبکہ دوسری صورت میں زبان محفوظ رہی۔ لیکن مری بگٹی علاقوں میں بلوچی زبان سندھی پنجابی اور سرائیکی زبانوں سے اتنا متاثر ہے کہ اس کے لئے باقاعدہ منظم جدوجہد کی ضرورت ہے۔

یہ تو قدرت کی طرف سے ایک غیر متوقع امداد سے کچھ کم نہیں کہ اب بلوچ قوم کو اپنی زبان کے سلسلے میں یہ احساس پیدا ہو چکا ہے اور یہ کہ بلوچی زبان و ادب کے اس جدید دور کا آغاز ہی اس کی حفاظت کی دلیل ہے۔ اس لئے یہ اُمید پیدا ہو گئی ہے کہ اس کی ضرور اصلاح ہو جائے گی کیونکہ اب سیاسی، سماجی، ثقافتی حالات بلوچستان میں کچھ ایسی

سطح پر آگئے ہیں کہ وہاں کے منعزل لوگ بلوچستان کے باقی علاقے اور وہاں کے لوگوں سے اب رابطہ قائم کر رہے ہیں اور اگر تعاون و رابطہ کا یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ لوگ بہت جلد اپنی زبان کی اصلاح کر سکیں گے یا خود بخود ایسے ہو جائے گا۔

اس زیر بحث مشرقی علاقے میں بعد کی صدیوں میں بھی چند ایک شعراء پیدا ہوتے ہیں جن کا کلام بھی سندھی اور سرائیکی زدہ ہے' البتہ دو ایک شاعر ایسا بھی گزرے ہیں جنھوں نے زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے دامن کو چھڑا نہ سکے۔

نور احمد نور

جامُ دُرک

اس مشرقی علاقے میں کچھ لوگ جامُ دُرک کی شاعری کو اسلئے قابلِ تقلید سمجھتے ہیں کہ بقول ان کے اُس نے خالص بلوچی اشعار کہے ہیں اور فارسی کلمات کے استعمال سے بالکل پرہیز کیا ہے اور اُس کے مقابلے میں ملا فاضل کی شاعری کو قابل اجتناب سمجھا ہے اس لئے کہ اُس نے بقول اُن کے فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان کا یہی فیصلہ خود اُن کے لئے اس بات کا فیصلہ ہے کہ وہ بلوچی زبان اور باقی بلوچستان سے کتنا نا آشنا ہیں۔ حالانکہ ان دونوں شاعروں کی ہر چیز ہر حیثیت سے مختلف ہے۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جامُ دُرک کے تقریباً تمام اشعار اس سے منسوب ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کسی ایک نظم کا ایک حصہ بھی نام نہاد مشرقی بلوچی میں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام منظومات میں فارسی عربی الفاظ کافی تعداد میں موجود ہیں جو ایک عام بلوچی شاعر کی نشانی ہے۔ جامُ دُرک سے منسوب ہر ایک نظم کا ہر شعر زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں بلوچستان کے باقی حصوں کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہوں اور مجھے اس نام نہاد مشرقی علاقے کی زبان سے کوئی سروکار نہیں۔

ان منظومات میں الفاظ' بندشیں' استعارے اور بیان صاف صاف

ہیں۔ اگر یہ اشعار اس مشرقی علاقے کے ہوتے تو ان میں حسب معمول سندھی، پنجابی اور سرائیکی الفاظ کی بہتات ہوتی۔ لیکن اس کے برعکس ان اشعار میں فارسی عربی کے الفاظ فراخ دلی سے استعمال کیے گئے ہیں مثلاً لطیف، ہجر، حُبّ، اخلاص، ذلّت، پیکان، دعاگو، جبین، بالیقین، لُطف نظر ما را بہ بین، قلب، بشر، مژگان، ناوک، برمن بکُن، نسترن، رُخ، طبیعت " چند الفاظ ہیں جو ہم نے جامُ دُرک کے مجموعہ " درچین " ۔ (مرتبہ بشیر احمد بلوچ) کے شروع کی دو ایک چھوٹی نظموں سے لیے ہیں۔ باقی تمام نظموں میں ایسے ہی عربی اور فارسی الفاظ مستعمل ہیں۔ اب یہ کیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ جامُ دُرک کے اشعار فارسی عربی سے پاک ہیں۔

" پاپولر پوئٹری " میں ڈیمز نے تشریح کرکے لکھا ہے کہ یہ نظمیں جام دُرک سے منسوب ہیں اور ان کی تعداد اس نے صرف پانچ لکھی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جامُ دُرک کے نام پر طبع شدہ مجموعہ کلام " درچین " میں دوسرے شعراء کے کلام کو بھی دُرک کے کلام کی صورت میں درج کیا گیا ہے۔

یہ نظمیں " ۱۔ روتح ماں جری انت ، ۲۔ سیری چہ باگیں بیلوءَ " ، ۳۔ گوشتِ کنگراں " زبردستی جامُ دُرک سے منسوب کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ڈیمز تک ان کو دوسروں کی تصنیف بتاتا ہے۔ علاوہ ازیں ۱۔ دوستین شیرین ۲۔ لیلیٰ مجنا۔ ۳۔ عیسیٰ برّی جیسے عوامی نظموں کو نہ جانے کیوں جام کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ ان میں سے کوئی بھی نظم جام دُرک کی تصنیف نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جام دُرک ڈومبکی شاعر نہیں بلکہ صرف ایک ڈومب یا ڈوم تھا۔ جس کو بلوچستان میں پہلوان (گوّیا) بھی کہتے ہیں۔ ڈومب کا کام بھی یہی ہے۔ وہ مختلف شعراء کے اشعار اور منظومات کو ازبر کرکے گاؤں گاؤں گاتا پھرے۔ جام دُرک بھی اسی طرح مختلف شعراء کا کلام یاد کرکے گاتا پھرتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ

وہ نصیر خان کے درباری گوّیے تھے اور اس کو جام کا لقب اُسی درباری گوّیے کی حیثیت سے دیا گیا جس طرح ہندوستانی گویّوں کو اسی قسم کے القاب سے نوازا جاتا ہے ۔مثلاً خان صاحب، نائک وغیرہ ۔

یہاں اس سلسلے میں اور زیادہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے ۔مطلب یہ کہ اگر انہی منسوب شدہ منظومات پر ایک نظر ڈالی جائے تو بھی، وہ فارسی الفاظ سے بھری پڑی ہیں ۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ جام درک بھی کوئی مستثنیٰ نہیں ہیں جس کی تقلید کی تلقین کی جاتی ۔

ملّا فاضل دوسری طرف ان حضرات نے نہ جانے اتنی جرأت کیسے کی ہے کہ مُلّا فاضل جیسے ایک عظیم شاعر کی تقلید کو بلوچی زبان کے لئے تباہی کا ذریعہ بتایا ہے ۔ سب سے پہلے میں ان کی لاعلمی کی وجہ سے اُن کو ملامت بھی نہیں کرتا اور یہاں کسی بحث کی گنجائش تو نہیں مگر ہم اتنا تو کہے دیتے ہیں کہ مُلّا فاضل نے اگرچہ اپنی منظومات میں کچھ عربی فارسی کے الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن اپنے ہم عصر مُلّا شاعروں میں سے سب سے کم استعمال کئے ہیں ۔ (مُلّا کے ہم عصر کئی ان پڑھ بہترین بلوچی شاعر ہو گزرے ہیں جن کا کلام فارسی زبان سے کم ملوّث ہے) مُلّا فاضل ایسا کرنے پر اس لئے مجبور تھے کہ اس زمانے میں اچھے شاعر کی پہچان یہی تھی ۔مگر مُلّا فاضل اس امر سے غافل نہیں تھے کہ خالص بلوچی زبان میں اشعار کہنا بھی نہایت ضروری ہے ۔ چنانچہ انہوں نے خالص بلوچی میں ایسی نظمیں بھی کہی ہیں کہ بلوچی شاعری کی تاریخ میں ان کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے ۔

علاوہ ازیں ملّا نے اپنی نظموں میں انوکھے خیالات کے ساتھ ساتھ بلوچی زبان کے ایسے نادر الفاظ بھی استعمال کئے ہیں کہ دوسرے شعراء کا وہم و گمان وہاں تک پہنچ نہ سکا تھا ۔ (ان شاء اللہ مُلّا فاضل پر زیر تصنیف کتاب میں تفصیلاً اُس

سلسلے میں بحث ہوگی۔)

نشأۃ ثانیہ اور صنفِ سخن

بہرحال اِس دور یعنی بلوچی قدیم شاعری کے اس دوسرے دور میں یہ نئی چیز ضرور پیدا ہو گئی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا یعنی فارسی اور عربی کے الفاظ نے بلوچی شاعری میں راہ پیدا کر لی اور پھر بلوچ چونکہ مذہبی لوگ تھے اس لئے وہ اکثر نظموں کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ، اور نعت رسول مقبول و منقبت خلفاءِ راشدین حتیٰ کہ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی توصیف سے کرتے تھے جو قدیم شاعری کے دورِ اوّل میں موجود نہیں۔

دوم یہ کہ فارسی میں داستان امیر حمزہ، جنگ نامہ حضرت علی، قصہ وَرقاء گلشاہ اور ایسی کئی چیزوں سے جب بلوچ شعراء آشنا ہوتے تو انہوں نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھنی شروع کر دیں جو بجائے خود بلوچی شاعری میں ایک نئی صنفِ سخن تھی اس قسم کی شاعری کو بلوچ ان مواضیع کے مطابق اسلامی نظمیں، پیغمبری نظمیں یا کتابی نظمیں کہتے ہیں۔

ایک اور صنفِ سخن ہے جو پہلے دور کی قدیم شاعری میں نہیں ہے جو اس دوسرے دَور کی پیداوار ہے۔ وہ موسمی حالات واقعات جیسے بارش، طوفان، قحط سالی، آبادی، آفات زمینی و آسمانی جیسے واقعات کو نظم کرنا ہے جو واقعی قابلِ تعریف اضافہ ہے۔

ایک اور صنف جس کا اس دوسرے دَور نے اضافہ کیا ہے وہ ابہام گوئی ہے جو اس سے پہلے کی بلوچی شاعری میں مفقود رہے۔

دَورِ اول میں اگرچہ کئی ایک شعراء سرداروں کے دربار سے متعلق و منسلک تھے مگر انہوں نے اپنے سردار، اس کے داد و دہش یا جوانمردی اور دیگر اوصاف

میں پوری پوری نظمیں کبھی نہیں کہیں مگر اس دورِ ثانی کے شعراء نے بڑی بڑی نظمیں اپنے سردار یا حاکموں کی توصیف و حمد میں لکھیں۔ جو واقعی ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اسی دورِ ثانی میں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو شروع سے آخر تک خدا، رسول یا کسی ولی اللہ کی تعریف میں کہی گئی ہیں۔ ویسے مذہبی پند و نصائح اور وعظ و تلقین کی صورت میں کافی نظمیں کہی گئی ہیں جن میں اسلام کی تعریف کفر کی توہین، قیامت اور روزِ جزا کے بیان وغیرہ پر کافی تفصیل سے سخن سنجی کی گئی ہے۔

"عاشقی شیئر" بلوچی شاعری کی ایک صنف خاص کا نام ہے جو عربی شاعری کی اسی صنفِ سخن سے ملتی جلتی ہے۔ ویسے تو یہ لمبی لمبی نظمیں انہی عام با اوزان اور با قوافی نظمیں جیسی ہیں مگر ان میں شاعر اور سخن کا محور معشوق ہے جس طرح اردو فارسی غزل میں بنیادی طور پر محور و مدار معشوق ہی ہے۔ بلوچی کی ان عاشقی منظومات کا بھی یہی حال ہے لیکن یہ اردو فارسی کی طرح نہیں بلکہ عربی شاعری میں اسی صنف سخن کی مانند ہے۔ یہ بھی ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جو اسی دوسرے دور کی پیداوار ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کے دور میں اگرچہ چند ایک عشقیہ داستانوں کو منظوم کیا گیا ہے لیکن وہ صرف قصہ کی صورت میں۔

دوسرے دور میں بھی اس پر کافی نظمیں کہی گئی ہیں لیکن یہ غزل نما عاشقی شیئر یا منظومات دوسرے دور ہی نے جنم دیئے ہیں۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو یہی غزل کی ابتدائی شکل ہے جو بعد میں اردو فارسی میں نئی شکل اختیار کر کے نئے قوانین و ضوابط کے تحت نئی صنف سخن بن گئی۔

اگرچہ اس دوسرے دور یا نشاۃ ثانیہ میں بلوچی شاعری میں عربی فارسی کے الفاظ سے بلوچی زبان ملوث ہو گئی لیکن اس دور میں بلوچی شعری ادب میں لاتعداد اصناف

سخن کا پیدا ہونا مختلف اور نئے موضوعات پر نظمیں کہنے اور بہت بڑی تعداد میں کہنے کے نتیجے پر بلوچی شعری ادب نے انتہائی ترقی کی اور اس دور کی شاعری کا بلوچی زبان پر بہت ہی بڑا احسان ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دوسرے دور کے شعراء کا کلام بھی زیادہ محفوظ ہے کیونکہ اس دور کے اکثر شعراء پڑھے لکھے ہوتے تھے اور اپنا کلام خود لکھ کر محفوظ کرتے تھے۔ البتہ اَن پڑھ شعراء کے کلام کے ضائع ہونے کا اندیشہ زیادہ ہے۔

جی ہاں! انیسویں صدی سے لے کر آج تک کے قدیم شاعری کے شعراء میں اَن پڑھ شعراء بھی ہیں جنھوں نے بہترین اشعار نظم کئے ہیں قابل تعریف بات یہ ہے کہ یہ اَن پڑھ شعراء کا کلام فارسی یا عربی الفاظ سے بڑی حد تک مبّرا اور پاک ہے۔

ہمارے آج کے جدید دَور میں بھی بلوچی قدیم شاعری میں نظم لکھنے والے شعراء کافی تعداد میں موجود ہیں اور ان میں سے بھی کتنے ایک ان پڑھ شاعر بھی ہیں۔ البتہ اب تو ایک ان پڑھ شاعر بھی اپنے اشعار لکھوا کر محفوظ کرا سکتا ہے۔

اس میں فائدہ یہ ہوا کہ پہلے دور کی قدیم شاعری کی طرح اس دوسرے دَور کی منظومات کے مصنفین گمنام اور نامعلوم نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان اشعار کے ہیرو اور ہیروئن زبردستی ان کے مصنفین قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مزید براں یہ دوسرے دَور کی شاعری سابقہ قدیم شاعری سے بیسیوں گنا زیادہ ضخیم ہے۔ البتہ ابھی تک اس کے جمع کرنے اور کتابی صورت میں محفوظ رکھنے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہو سکا ہے جس سے ان کے ضائع ہونے کا ابھی تک اندیشہ باقی ہے۔

قدیم شاعری کے ادوار

اگرچہ میں نے قدیم شاعری کو ۲ دو ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے محض خانہ پُری کے لئے قدیم شاعری کو تین ادوار میں بانٹ دیا ہے۔ مگر میرے نزدیک ایسا کرنا

غلط ہے ۔ بلوچی شاعری کا جو نمایاں دَور انیسویں صدی میں شروع ہو جاتا ہے اس سے پہلے کسی درمیانی دَور میں اس کی کوئی خصوصیت ایسی نظر نہیں آتی جس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک درمیانی دَور کا نام دیا جاتے ۔ اور خصوصاً یہ صاحبان اس درمیانی دور کو برٹش دَور یا عہدِ برطانیہ سے پہلے اور تیسرے دَور کو انگریز کے زمانے سے متعلق کرتے ہیں ۔:

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریزوں کو بلوچی ادَب سے چسپاں کر دینا کیا مصلحت رکھتا ہے ؟ ویسے بھی انگریزوں کے دَور سے پہلے یا اس کے بعد کی شاعری میں کیا مختلف خصوصیت پائی جاتی کہ اس کی اس طرح کی تقسیم ضروری ہوگئی کہ اگر کسی ایک آدھ شاعر نے انگریزوں کے خلاف کسی بھی موضوع پر تھوڑی بہت طبع آزمائی کی بھی ہے تو آٹے میں نمک کے برابر بھی تو نہیں ہے جس کے متعلق صرف برسبیل تذکرہ کچھ کہنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔

درّک، توکلی، فاضل

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی خود ساختہ تقسیم کے مطابق جامُ درّک اور مُلّا فاضل کو ایک ہی وقت کے شعراء بتاتے ہیں ۔ اُن کے کہنے کے مطابق جامُ درّک نصیر خان اوّل کے دربار سے منسلک تھا یا بقول اُن کے درباری ملک الشعراء تھا ۔ اور نصیر خان ۱۷۹۵ء میں مر گئے تھے اور اس کا بیٹا محمود خان ۱۲۰۸ھ میں قلات کی گدی پر بیٹھ گیا ۔ اور مُلّا فاضل کی تاریخ وفات ۱۲۷۰ ھجری ہے ۔ اس حساب سے جام دُرّک کی موت کے بعد ملّا فاضل پیدا ہوئے ۔ کوئی اٹھارہ بیس سال کی عمر میں شاعری شروع کی ہوگی ۔

لطف یہ ہے کہ یہ حضرات اسی مدت سے منسوب شدہ کسی دوسرے شاعر کا نام تک نہیں لے سکے اور صرف جامُ درّک ہی پر اکتفا کیا ۔ کم علمی اور عدم معلومات کا اس

سے زیادہ کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ ان حضرات کا واحد ذریعہ ڈیمز کی کتاب ہے اور چونکہ ڈیمز نے اپنی کتاب ''پاپولر پوئٹری آف بلوچیز'' میں لکھا ہے کہ '' کہتے ہیں کہ جام دُرّک نصیر خان اوّل کے دربار سے منسلک تھا۔'' ان حضرات نے کورانہ تقلید میں اسی غیر مستند حدیث کو اپنا سند بنا کر پیش کیا ہے۔

البتہ ہم مست توکلی کو مُلّا فاضل کا ہم عصر کہہ سکتے ہیں۔ محترمہ زکیہ سردار خان نے مست توکلی کی پیدائش ۱۸۲۸ میلادی لکھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ نصیر خان اوّل کی موت اور اس کے بیٹے محمود خان کی گدی نشینی کے (۳۳) تینتیس سال بعد مست توکلی پیدا ہوتے۔ (اور پھر ۱۸۹۵ میں وفات پا گئے) جس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مست توکلی بھی جامُ دُرّک کی موت کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی حد تک یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جام دُرّک کی موت نصیر خان کی موت سے پہلے واقع ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود خان کے ساتھ اس کے نام کا قطعی ذکر نہیں ملتا۔

مُلّا فاضل کے لوح مزار کے مطابق وہ بارہ سو ستّر (۱۲۷۰) ھجری میں وفات پا گئے ہیں جو تقریباً (۱۸۶۲) اٹھارہ سو باسٹھ میلادی کے برابر ہو گا۔

مُلّا فاضل کی وفات کے بارے میں ہمارے چند دوستوں نے اُن کے مزار کی زیارت کر کے اور کتبہ پڑھ کر یہ لکھا ہے کہ مُلّا کی موت '' نیم سر'' (درد شقیقہ) کے مرض سے واقع ہوئی ہے۔ لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ ان حضرات نے مُلّا فاضل کے مزار پر حاضری دینے میں بڑی دیر کی تھی۔ اور میں فخر یہ کہتا ہوں کہ اس دَور میں مَیں سب سے پہلا شخص ہوں جس نے مُلّا فاضل کے مزار پر سب سے پہلے حاضری دی ہے اور یہ ۱۹۵۴ میلادی کا سال تھا۔ اور میں نے اپنے ہاتھوں اُن کے مزار کے گرے ہوئے اور خاک میں اَٹے ہوئے پتھر اور لوح مزار کو دھو دھا کر دوبارہ بالترتیب نصب کر دیا۔ اور مزار کے باقی پتھروں کو بھی قرینے سے رکھ دیا۔

اس کا ثبوت میرے پاس وہ تصویریں ہیں جو میں نے مزار کی شکستہ حالت اور بعد کی ٹھیک حالت میں لی ہیں ۔ اس وقت لوح مزار کے تمام الفاظ بھی ثابت تھے اور میں نے ان کو نقل بھی کیا تھا۔ علاوہ ازیں اسی لوحِ مزار کی ایک تصویر بھی نزدیک سے تھی جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے اور اس پر لکھی ہوئی عبارت بالکل صاف پڑھی جا سکتی ہے ۔ بعد میں باد و باران نے اس پر اثر کیا ہوگا اور اس کے کچھ حروف سٹر گئے ہوں گے۔ جس کی وجہ سے میرے بعد مزار پر حاضری دینے والوں نے اس عبارت کو غلط پڑھ کر غلط معنی نکالے ۔

تو اس حساب سے مست توکلی اور مُلّا فاضل کو ہم ہمعصر شعراء کہہ سکتے ہیں اسی طرح مُلّا فاضل کا ذکر کرتے ہوئے ان حضرات کی کم علمی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ان حضرات نے مُلّا فاضل کے ہمعصر شعراء کے صرف دو چار نام لے کر اپنی علمیت جتانے کی بے سود کوشش کی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے جہاں مری بگٹی علاقوں میں ان مختلف صدیوں میں آپ کو صرف معدودے چند شعراء ملیں گے ۔ وہاں صرف مُلّا فاضل کے ہمعصروں کی تعداد پچاس ساٹھ تک پہنچ جاتی ہے جس میں سے بیس پچیس شاعروں کے نام سے تو بلوچستان کا بچہ بچہ واقف ہے ۔

اس کے علاوہ برطانوی دَور سے موسوم کر کے بھی یہ حضرات صرف انہی شاعروں کا نام گنواتے ہیں جو صرف اور صرف اس محدود اور نام نہاد مشرقی علاقے سے متعلق ہیں اور ان کے نام تک گن گن کر لکھ دیئے ہیں اور مقامِ افسوس ہے کہ اسی زمانے کے وہ شعراء جو پورے متحد بلوچستان پر چھائے ہوئے تھے ۔ ان میں سے ایک کے نام کا ذکر تک نہیں جو کم دانشی اور لاعلمی کی سب سے بڑی دلیل ہے کیونکہ نام نہاد برطانوی دَور میں سارے (متحد) بلوچستان میں ساٹھ ستر کے

قریب اچھے شاعر موجود تھے لیکن ان کا ذکر نہ کرنا یا تو معلومات کی محدودیت ہے
یا پھر تعصّب کی وجہ سے آنکھیں موندھ لینا ہے۔

ان جملِ معترضہ کے بعد میں اس بات کا دوبارہ اعادہ کرتا ہوں کہ جو بلوچی قدیم
شاعری پندرھویں صدی کے بعد جب بھی شروع ہو گئی ہے اُس وقت سے مسلسل
چلی آرہی ہے اور اُس میں کسی قسم کا انقطاعی یا ایقافی دور نہیں آیا اور اس کو
خواہ مخواہ مختلف ادوار میں تقسیم کرنا لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے
صرف چند خصوصیات کے پیشِ نظر نشأۃ ثانیہ کو جس میں اس شاعری میں کافی ایجاد و
اختراع ہوتے اور نئے اصنافِ سخن وجود میں آتے، دوسرے دور سے تعبیر
کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم بلوچی کے جدید ادب کے بارے میں بات کی ابتداء کریں۔
مناسب یہی ہے کہ بلوچی قدیم شاعری کے بارے چند اختصاصی جملے لکھ کر مختصر
طور پر اس کی اصناف کا بھی ذکر کریں۔ جن میں لوک شاعری بھی شامل ہے

موسیقی اور شاعری

موسیقی ہی وہ قوتِ محرکہ ہے جس نے شاعری کو جنم
دیا ہے۔ موسیقی ایک بالکل فطری چیز ہے اور
فطرت ہی کی پیداوار ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی آواز نہیں جس میں موسیقی نہ ہو یا موسیقی
کا جزو نہ ہو۔ کیونکہ آوازوں کے زیر و بم سے پیدا شدہ صدا کو موسیقی کہتے ہیں۔ قدرت
کی پیدا کردہ کائنات کی وہ مخلوقات جن کو ہم حیوانات کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک
کی آواز میں موسیقی موجود ہے۔ حتیٰ کہ گدھے اور کوے تک کی کرخت آوازوں

میں موسیقی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ انسان نے اپنی فطرت کے مطابق ہر شے اور ہر آواز کی پسند ناپسند کا اپنی طرف سے معیار مقرر کیا ہے ۔ البتہ موسیقی اور آواز جتنی لطیف ہو اتنی ہی جاذب اور دلپسند ہوگی ۔ یہ اور بات ہے کہ برمحل و برموقع بھی کرخت ترین آواز بھی محبوب ہوگی ۔

یہ مشاہدہ ہے کہ جو کرخت آواز نزدیک میں ناقابلِ برداشت اور غیر محبوب ہوتی ہے ، وہی آواز اگر دُور سے سُنائی دے گی تو اس میں دلکشی ہوگی ۔ کیونکہ دُور ہونے سے آواز کم ہو کر اس میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے ۔

ہم اگر ہندوستانی موسیقی ہی کو لے لیں جس کی بنیاد "سا ۔ رے ۔ گا ۔ ما ۔ پا ۔ دا ۔ نی ۔" پر مبنی ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سُر سننے میں تکلیف دہ ہیں مگر وہی کوّے اور گدھے کی آوازیں بھی ان میں موجود ہیں ۔ البتہ یہاں ان آوازوں کو چھان کر نکالا جاتا ہے گا جس کی مثال گدلے اور صاف پانی میں کی ہوگی ۔ اب سازوں کی طرف سے جن میں سُروں کی آوازیں نکالی جاتی ہیں ۔ تال کی جانب آئیے جو طبلہ ، دف ، ڈھولک ، پکاوج اور مِٹر دنگم وغیرہ اس کے اظہار کے ذرائع ہیں ۔

اس سلسلے میں وہی مثال دی جا سکتی ہے کہ ان آلات سے بھی لطیف ترین سے لے کر کرخت ترین آوازیں نکالی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً اگر طبلہ پر "دھا" یا "دھن" کی تال بار بار اور زور زور سے بجائی جاتے تو یقیناً ناقابلِ برداشت ہوگی مگر اس "دھا" کو ایک مخصوص انداز سے دوسرے تالوں کے ساتھ بجایا جاتے تو پُرلطف بلکہ رُوح افزا ہوگی ۔

مثلاً اکتالہ کی دھن ترکٹ ۔ دھن ۔ نا ۔ دھن ۔ دھن ۔ نا ۔ ترکٹ ۔ تو ۔ نا ۔ کت ۔ تا یا جھپ تال کے "دھن ۔ دھاگے ۔ ترکٹ ۔ دھن دھن دھاگے ترکٹ ۔ تن ۔ تاگے ۔ ترکٹ ۔ دھن دھن دھاگے ترکٹ ۔

ٹرکٹ ۔ ٹن ۔ دِ نا گے ۔ ٹرکٹ ۔ دھن دھن دھن ۔ ٹرکٹ ۔ ۔" علاوہ ازیں رزمیہ یا رجز گانے میں تو یہی" دھایا یا "دھن" اتنی ہی باصواب ہو گی۔

جیسے کہ معلوم ہے کہ انسان جانوروں کی اور خصوصاً پرندوں کی ....
آوازیں یا رات کی خاموشی میں حشرات کی آوازیں سُن سُن کر ان میں سے اپنی پسند و ناپسند کا معیار قائم کر کے آہستہ آہستہ ان کی نقل کرنے کی کوشش میں لگ گیا جو ابتداً ضرور گنگنانے یا سیٹی بجانے تک محدود ہوا ہو گا۔ کسی حد تک اس کوشش میں کامیاب ہونے کے بعد تو اظہارِ جذبات کے طور پر سُر کی لطافت اور مزاج کے مطابق اس کے لئے محل و توع کا تعین بھی کر دیا۔ مثلاً بچے کو سُلانے یا اس کو بہلانے کی خاطر ایک مخصوص سُر چن لیا گیا تو اکیلے اور تنہائی میں بیٹھے کسی میٹھی یاد سے محظوظ یا بیقرار ہو کر تنفیس یا تمہید کی خاطر دوسرا سُر متعین کیا گیا۔ اور پھر بعد میں اپنے انہی جذبات کو اُگے دکے الفاظ میں ادا کرنا بھی شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اُسی سُر کے مطابق ایک موزوں قسم کا مختصر و مجمل جملہ کہہ دیا جس سے ان جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔

اس طرح لوری، گیت وغیرہ شاعری کی ابتدائی چیزیں موسیقی ہی کی بنیادوں پر رکھی گئیں اور بعد میں دوسرے اصناف کی باری آتی گئی۔

بلوچی زبان کا پُرانا شعری ادب انہی مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہے۔ مثلاً اس پُرانے شعری ادب کے اصناف لیلو، دد گال، لیب لچہ، سوت، زہیرنگ، موتک، نازینک، ھالو، سپت اور لچہ، موجود ہیں۔

لیلو "لیلو" وہی "لوری" ہے۔ "لیلو" کو ہر بلوچ گھر میں عورتیں اپنے بچوں کو سلانے کے لئے دوسری اقوام کی عورتوں کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ایک عام صنفِ ادب یا صنفِ شاعری یا لوک

شاعری ہے مگر ابھی تک ان کو جمع کرنے کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ بدقسمتی
"لیلو" کے بارے میں لکھتے وقت کچھ مضمون نگاروں نے عجیب سی باتیں کہی ہیں۔
حالانکہ سیدھی سادھی سی بات ہے کہ "لیلو" وہی "لوری" ہے۔ لکھنے کو ہمارے
نویسندے محض مضمون کو طول دینے کی خاطر بیکار کی اِدھر اُدھر کی باتیں تو لکھ دیتے
ہیں لیکن اس کے بارے میں تحقیق کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے
ہر ایک نویسندہ مثال کے طور پر ہمیشہ ڈیمز کی کتاب "پاپولر پوئٹری آف بلوچز"
میں دی ہوئی دو چار لوریاں ہی پیش کرتا رہا۔ اور اپنی طرف سے کبھی ایک آدھ
لوری حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اگرچہ ڈیمز کی دی ہوئی لوریاں حقیقی معنوں میں ادنیٰ ترین قسم کی ہیں۔ لیکن
حیرت تو یہ ہے کہ اُن کو صرف تین ٹکڑے مل گئے تھے جو حقیقت میں ایک ہی لوری
کے تین حصے ہیں۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان کے اس منعزل علاقے
میں یہی ایک لوری ہے۔ حالانکہ متحدہ بلوچستان کے طول و عرض میں کافی تعداد میں
لیلو (لوریاں) موجود ہیں۔ لیکن ان کے جمع کا انتظام ابھی تک کرنا باقی ہے۔ یہاں
میں ایک ایسی لوری کے چند بند نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں جو سارے متحدہ بلوچستان
کے طول و عرض میں مشہور ہے۔

لوری دیتی ہوں اپنے بچّے کو ــــــــ!
میرا بچّہ سوتا نہیں ہے اور روتا ہے
کل رات میرا لال بہت رویا تھا
اس کے آنسو سے لونگ گرتے تھے ـ!
جب وہ ہنستا ہے تو موتی جھڑتے ہیں!
سو جا میرے لال کہ نیند تیری پرورش کرتی ہے

اور بے خوابی تجھے نحیف بنا دے گی ......

میں نے لال کو پیدا ہوتے ہی دیکھ لیا ...

محلے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی !....

گھر، گہوارے سمیت چمک اُٹھا .....

ساگوان کا گہوارہ تیری خواب گاہ ہے !....

اور بکری کے بال سے بنی ہوئی تنابیں تمہاری پاسبان

نگہبان تو خود اللہ ہی ہے ....

اولادِ نرینہ اور بھائی روز روز نہیں ہوتے !

اولادِ نرینہ اور بھائی خدا کی دین ہے .....

اگر یہ قابلِ خرید چیزیں ہوتیں ....

تو سرمایہ دار خریدتے ....

اور ہم نادار ترس ترس کے مر جاتے

اگر خوفِ طوالت نہ ہوتا تو چند ایک اور لوریوں سے اقتطاف پیش کرتا ہے !

۲۔ دوگال

پرانے شعری ادب میں یہ "دوگال" کی صنف شاید بلوچی شاعری میں ابتدائی قدم ہے۔ کیونکہ اس میں صرف دو مصرعوں ہی میں مطلب کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس میں اغلب توصیف کا پلّہ بھاری اور تشبیہ عام ہے۔

اگر ہم زیادہ دقیق بیانی سے کام لیں تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہی "دوگال" غزل کی ابتدائی شکل ہونی چاہیے۔ جس طرح غزل میں ہر دو مصرعے اپنی علیحدہ اور آزاد حیثیت رکھنے کے باوجود تکمیل مقصد کے لئے کافی ہوتے ہیں، اسی طرح اس "دوگال" میں بھی صفت موجود ہے۔ جس طرح "رُباعی" چار مصرعوں پر مشتمل

ہے اسی طرح یہ" دوگال" صرف دو مصرعوں میں تکمیل ہو پاتا ہے۔ یہ" دوگال "
مختلف مواقع پر مختلف طرز موسیقی یا غناء میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ان مصرعوں
کو" سوت " نازینک" یا" زھیریگ" میں آزادی سے استعمال کیا جاتا ہے
البتہ یہاں زھیریگ سے زھیریگ کی اُس قسم سے مراد نہیں ہے جسے بلوچی کلاسیکی
گویے پیش کرتے ہیں بلکہ یہ ایک خاص چیز ہے جس میں رقت آمیز لہجے اور سُر
میں یہ مصرعے گائے جاتے ہیں اور اکثر اس میں کسی سازینہ کی ضرورت بھی نہیں
ہوتی۔ البتہ اضافی طور پر بلوچی" سروز" اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔ ویسے
" سروز" پر اکیلا بھی یہ دلآویز صورت میں بجایا جاتا ہے

" دوگال" اُس قسم کے زھیریگ میں استعمال ہوتا ہے جس کو عورتیں کپڑے
سینے یا چکی چلاتے وقت گاتی ہیں۔ ساربان وشتربان رات کے سناٹے میں
کوفتِ سفر کو آسان بنانے کی خاطر ان دوگالوں کو اپنے زھیریگ میں استعمال
کرتے ہیں۔

پہاڑ کے دامن میں چرواہا یا جت بان بھی اس کو گاتے ہیں۔ ویسے خوش
گلو لوگ اس قسم کی زھیریگ کو اپنی خاص منعقد شدہ مجلسوں میں بھی سناتے ہیں
اس" دوگال" کے چند مصرعے نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ؎

تو نے مجھ سے دُور جا کر اتنی دیر لگائی — کہ تیری یاد میں میری آنکھیں بے نور ہوگئیں
تم خوش اور ہنستے چلے آؤ گے — تو میں ہاتھ باندھے تیرا استقبال کرونگا
تم جب سے گزشتہ سال چلے گئے — میں مکمل عذاب ہی میں رہا!

سوت

حالانکہ موسیقی یا فنون طرب میں اس" سوت" کو کسی حد
تک ایک خاص علیحدہ مقام حاصل ہے۔ لیکن ہم اس کو ایک
مشترک چیز کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ شعری ادب میں اس کو وہی مقام حاصل ہے جو

ہندی زبان کے " گیت " کو حاصل ہے ۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ " گیت " ایک ہمہ گیر چیز کا نام ہے مثلاً شادی بیاہ کے گیت ، برھا کے گیت ، ملن کے گیت ، پہاڑی گیت ۔ اسی طرح سوت کی موسیقی پر ہر قسم کے اشعار مثلاً غزل ، دوھے ، طربیہ المیہ ، نظم نما غزلیں گائی جاتی ہیں ۔

جس طرح ہندوپاکستان میں قوالیوں کی محفلیں ہوتی ہیں جن میں غزل ، نظمیں اور اسی قسم کی چیزیں قوالی کی صورت میں گائی جاتی ہیں ۔ " سَوت " اس صورت میں بالکل اسی " قوالی " کی طرح ہے جس طرح قوالی میں ایک گانے والا اور باقی ہمنوا ہوتے ہیں یہی حال " سوَت " کا ہے ۔ " سوَت " شادی بیاہ یا دوسرے ایسے مواقع میں گایا جاتا ہے ۔

ابتدا میں یہ " سوَت " صرف مردوں پر منحصر تھا جو قوالی کی طرح ہوتا تھا ۔ اس کے گانے میں بلوچی ساز کی خاص چیزیں استعمال ہوتی تھیں " گوُنّنرگ " اور " تار " اس کے ضروری جزو تھے ۔ گوُنّنرگ مقامی ساخت کے صراحی نما یا جگ نما بانی کا برتن ہوتا ہے ۔ اس کی اونچائی کوئی ڈیڑھ سے پونے دو فٹ کے قریب ہوتی ہے لیکن یہ کافی موٹا ہوتا ہے اور اسیطرح کافی وزن دار ـــ دو ایسے " گوُنّنرگ " طبلہ کے نرماوی کی طرح استعمال ہوتے ہیں ۔

ان کا دھانہ ہتھیلی بھر چوڑا ہوتا ہے ۔ دھانوں پر کوئی جلد وغیرہ نہیں چڑھائی جاتی ۔ بالکل ایسے کھُلے چھوڑے ہوتے ہیں اور بجانے والا ہتھیلیوں کے ذریعے ان کو بجاتا ہے ۔ اور " تار " یا " تال " تانبے کا چوڑا برتن ہے جس میں عام طور پر چاول کھایا جاتا ہے ۔ اس کے کناروں کو دو چھوٹی لکڑیوں سے ایسے بجاتے ہیں جیسے کہ بینڈ میں چھوٹا ڈرم بجایا جاتا ہے ۔

ہمنواؤں کو تال کے ساتھ تالیاں بجانا بھی ضروری ہوتا ہے ۔ اسی " تار "

اور "تالیاں" بجانے کے اچھے فنکار ہوتے ہیں جو "سُر تال کی حدود میں رہ کر "تار" یا "تالیوں" کے ضربات دو چند یا اس سے زیادہ بڑھا کر فن کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ دو طبلہ بجانے والے ایک گانے والے کے ساتھ بجا رہے ہیں اور گانا سولہ ماترا کے تین تالہ پر ادھارک ہے۔ ان میں سے ایک طبلچی حسب معمول طبلہ بجاتا ہے جبکہ دوسرا طبلچی اسی تین تالہ کو دوگن یا اور بڑھا کر چوگن بجاتا ہے۔

شروع شروع میں "سوت" میں وہی "دوگال" والے اشعار استعمال ہوتے تھے اور صرف ایک ہمنوائی مصرعہ زیادہ ہوتا تھا جو بار بار دُھرایا جاتا تھا لیکن بعد میں کچھ غزل نما اشعار کہہ کر اس کو ایک خاص صنف بنا دیا گیا۔ "سوت" کے شروع میں اس کے اشعار کے "سارے گاما" یعنی "لڑے لاڑے" ضرور کہے جاتے تھے۔ اور پھر دوسرے بند کہے جاتے۔ مثلاً ے

لاڑے لڑے لا۔ ڑے لڑے　　　لاڑے لڑے لا۔ ڑے لڑے

کس نہ روت اِنت گوْا درءَ　　　زَھیران ئے بنداں چپا درءَ

(کوئی گوادر نہیں جاتا کہ میں اپنی بے قراریاں اس کی چادر میں باندھ کر بھیج دوں۔)

گانے والا شخص یہ پہلے کے مصرعے گاتا ہے اور ہمنوا انہی مصرعوں کو بمعہ "لاڑے لڑے" دُہرائیں گے۔

سوت گانے والا باقی اشعار بھی گاتا جاتا ہے اور ہمنوا اسی ابتدائی مصرعوں کو بشمولیت "لاڑے لڑے" گاتے جاتیں گے۔

سوتی:۔ کَس گوں کَس ءَ جوڑش نہ کنت　　　(کوئی کسی سے ایسے نہیں کرتا۔)

دوست ءَ پراموشں نہ کنت　　　(اور اپنے دوست کو فراموش نہیں کرتا)

کس نہ روت اِنت گوادرءَ　　　زَھیران ئے بنداں چپا درءَ

ھمنوا ۔ لاڑے لڑے لا۔ ڑے لڑے لاڑے لڑے لا۔ ڑے لڑے

کس نہ روت اِنت گوادرءَ زہیران گُڈ بنداں چپادرءَ

ایک اور " سوت " کے شروع کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں

لاڑے لڑے نے لاڑے اوجانی دل پہ مُدکّ ءَ بندانت

(اے میری جان میرا دل مُدک کے لئے بیقرار ہے۔)

کاگد حُراساں آتکگ (تئی) مات ءَ پتاں وانینتگ

(خراساں سے تمہارا خط آیا اور تمہارے والدین نے اُس کو پڑھوایا)

ھوراں دو دیمی گوَرتگ (تئی) دشتِ ءَ ڈگار پُر بوتگ

(زبردست بارش ہوتی ہے اور تمہاری دشت کی زمینیں سیراب ہوگئی ہیں۔)

رفتہ رفتہ عورتیں بھی " سوت " گانے لگیں۔ عام طور پر وہی " سوت " جو مرد گاتے ہیں۔ عورتیں بھی گاتی ہیں۔ لیکن کچھ ایسے " سوت " بھی وضع ہوگئے ہیں کہ ان میں " نسائیت " کا رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً ؎

لَڑے، لا۔ ڑے، لڑے لاڑے، لَڑِ، لا۔ ڑے، لَڑے لاڑے

گوَمساں مَلگ جنےشُو کی چی ءَ زھرتے

یا کہ یہ " سوت " ؎

لےَ، لاڑے لے، لاڑے، لاڑے لاڑے مَن پہ سرو زناز ینان زبادمال ءَ

بیسویں صدی کے ربع ثانی کے بعد " سوت " بھی ایک نئے موڑ پر آپہنچا کیونکہ شہروں اور بنادر میں آباد بلوچ اس زندگی سے آشنا اور مانوس ہونے لگے اور خصوصاً وہ بلوچ جو بھاری تعداد میں کراچی جیسے شہروں میں رہتے تھے۔ ان پر ہندوستانی فلموں نے زبردست اثر کیا اور ان فلمی گانوں کی تتبع میں

یہ بھی اسی طرح کے "سوت" کہنے پر مائل ہو گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ اس قسم کے "سوت" عام ہونے لگے۔

لَڑِ لَڑِ لا۔ لڑے لڑ لَڑ لا لِڑے دل ءَ داگ دئے بیگھاں چہ ءَ گوزئے
(شام کو جب تم یہاں سے گزرتے ہو تو دل پر داغ رکھتے ہو۔)

یا پھر
نَے لڑے لے لاڑے لاڑے کَے لاڑے نَے لاڑے لاڑے
مالیَن ءِ تَرَّگ ءَ بندیں ما سبزءِ وادھاں نندیں
(ہمارے محلے میں گھومنے پر قدغن لگا دی گئی ہے۔ مگر ہم اس سانولی کے وعدوں پر قائم رہیں گے۔)

یا کہ اس سے بھی زیادہ دلیرانہ یا دوسرے لفظ میں عُریاں تر "سوت" کے دو مصرع ملاحظہ ہوں۔

لَڑِ لاڑے لڑے لاڑے لڑے گو لَڑِ لاڑے لڑے لاڑے لڑے گوں
پُرشَات اِنت شِشّمیں تھت گوں تواراں
من ءَ بنام ئے کُت ماں دز گُوھاراں !
(اللہ کرے میری چرچرانے والی شیشم کی چارپائی ٹوٹ جائے جس نے مجھے سہیلیوں میں بدنام کر دیا ہے۔)

اور پھر یہ تبدیلیوں کے رجحانات مکران کے ساحلی علاقوں (جو وہی بلوچستان کے ساحلی علاقے ہیں) تک پھیل گئے چنانچہ وہاں بھی اسی قسم کے "سوت" کا رواج پڑ گیا ہے۔ اور پھر ساحلی علاقوں سے یہ اثر داخلی علاقوں کی شہری آبادیوں تک پہنچ گیا اور اس قسم کے نئے "سوت" عام ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیانی وقت میں کیچ کے اسماعیل سوتی نے ساحلی علاقوں میں آ کر بڑا نام و نان پیدا کیا۔ اسی اسماعیل سوتی نے خود بھی بیسیوں نئے "سوت" کہے۔ نمونے

ذیل میں ملاحظہ ہوں ؎

لاڑے لڑے گو، لاڑے لڑے گو   زمانگ جن ئیگ اِنت مردءَ هبر نیست

(زمانہ بیوی کا ہے اور شوہر کی کوئی بات نہیں چلتی)

یاکسہ نوکیں زمانگے درآتگگ   چُک چہ پت ءَ شگوستگ

(نیا زمانہ آگیا ہے۔   اولاد اپنے باپ سے آگے نکل گئی ہے)

یا پھر اس سوت" کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو ایک شخص کی توصیف میں کہے گئے ہیں۔ ؎

لڑے لاڑے لڑے لاڑے لڑے لاڑے لڑے لاڑے

ھلو، ھالو، کناں ھان ءَ رئیس محمد عمر جان ءَ

ساحلی علاقوں کے ایک مقبول "سوت" کا ایک بندش کر اندازہ لگائیے کہ سیاست بھی "سوت" میں جگہ پاگئی ؎

سرکارءُ گاندی جنگ اِت اَنت   پیت ءُ ستارا بنداِت اَنت

(انگریز سرکار اور گاندھی میں لڑائی چھڑ گئی تھی اور   (اور کپڑوں کے سینے میں استعمال ہونے والے) بیت اور ستارے بند ہو گئے تھے۔

لیب لچہ شعری ادب کے لوک حصہ میں "لیب لچہ" کا بھی خاص مقام ہے۔ "لیب لچہ" کے لفظی معنی "کھیل کی منظومات" ہیں۔ اس کو "لیب سوت" (کھیل کے گیت) بھی کہا جاتا ہے۔

چونکہ یہ ایک روایتی چیز ہے اس لئے اس کو بلوچی دود ربیدگ یعنی کلچر سے خاص واسطہ ہے۔ بچے جو مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ ان میں کچھ کھیل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں بچے اظہارِ نیت کے لئے کچھ مسجع یا مقفی بول ادا کرتے ہیں جن کو ان کھیلوں کے ساتھ متعلق ہونے کے علاوہ بلوچی قومی روایات سے بھی علاقہ ہے

چند ایک انہی "لیب لچہ" میں کچھ مصرع ملاحظہ ہوں۔

لڑکیاں گول دائرے کی صورت میں اکڑوں بیٹھتی ہیں اور اپنی ہتھیلیاں گھٹنوں کے اوپر رکھ دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک سوال کرتی ہے اور دوسری جواب دیتی ہے۔ سوال و جواب کا سلسلہ کچھ یوں ہے۔

س:۔ تاس عَدئے (تاس (پانی پینے کا مخصوص برتن ہے) دیدے] ؟

ج:۔ تاس بنَدائِنت ۔[تاس بند ہے]

س:۔ چے ئے ماں ۔ [اُس میں کیا ہے] ؟ ج :۔ ھِنّی ۔[مہندی]

س :۔ ھِنی کئیگ اَنت [مہندی کس کی ہے] ؟

ج:۔ واجہ ئِ (واجہ کی) ۔

س:۔ واجہ کجُا شت ؟ [واجہ کہاں گئے ہیں]

ج:۔ بمبیّ ءَ ۔ [بمبیّ کو]

س:۔ چے کارِایت ؟ [کیا لائیں گے]

ج :۔ مھر گ ءُ دانگ ۔[موتی اور منکے]

س:۔ کے گوْرءَ کَنت ؟ [کون پہنے گی]

ج:۔ شھنک ءُ مَہنک ۔ [شھنک اور مُھنک]

س:۔ دُرملک کپنگ نہ کپتگ ؟ [دُرمَلِک زَچّہ ہوتی ہے کہ نہیں]

ج:۔ کپتگ ۔ [زَچّہ ہوتی ہے]

س:۔ چہ چُکے ؟ [بچّہ کیا ہے] ج :۔ بچکے ۔ [لڑکا ہے]

س:۔ نامئے کے اِنت ؟ [نام کیا ہے] ج :۔ گرِیشاہ ۔ [گرِیٔشاہ]

اِس کے بعد اچانک سب لڑکیاں اسی اکڑو کی حالت میں اُچھلنا شروع کر دیتی ہیں اور اچھلنے کے دوران یہ کہتی جاتی ہیں۔

"گریشاہ داد گریشاہ" [ہے گریشاہ خدا کی دین ہے گریشاہ] ۔

ایک اور لیب لچہ کے دو بول ہیں ۔

لڑکا:۔ میرا کُتّا کاٹنے والا ہے ۔ **لڑکی**:۔ میری چکّی پیسنے والی ہے ۔

کتی اور لیب لچے ایسے ہیں کہ ان کا اردو کرنا ان کی ہر چیز کو بگاڑتا ہے ۔ اس لئے یہاں میں ایک بلوچی لیب لچہ لکھتا ہوں اور اس جیسے ایک ایسے لیب لچے کے بول لکھتا ہوں جو پاک و ہند کے بچوں میں عام ہے ۔ ان دونوں کے الفاظ اگرچہ مختلف ہیں مگر ایک ہی مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں ۔

بلوچی:۔ کُوٹُشتنگ پَسیل عَ کارِیتُ مشکُ مسیلّ عَ

سردارِ عِ چیلّم عَ اُو کُوٗ بُوٗ کُوٗ ———!

شَربتِ لیمبُوَ ۔ چُٹّات ئے !

:۔ ادلا، بدلا، دَوَلا، دُو سیکھ جا پڑھنا کچھ کچھ تو

اب تم چُھپنے کو بھاگو !

برسات کے موسم اور دیگر ایسے مواقع کے لئے کافی "لَیب لچہ" موجود ہیں ۔ یہاں ایک سادہ ترین کا نمونہ دیکھئے جس میں اس وقت کے معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے ۔ بچّے اگر کھیل رہے ہوں گے اور بارش اچانک شروع ہو جاتے تو سرمایہ دار فوراً اپنے بچوں کو گھر کے اندر بلا لیتے ہیں کہ بارش میں نہ بھیگ جائیں یا سردی نہ لگے ۔ (بلوچستان کی موسمی بارشیں سردیوں میں ہوتی ہیں ۔)

غریب کا بچہ اگر ایسے میں گھر جاتے بھی تو کیا فرق پڑتا ہے — وہاں بھی وہ بھیگ جاتا ہے ۔ اس لئے اس کے ماں باپ کو بھی اس کی فکر لاحق ہو ہی نہیں سکتی ۔ اب جب شروع میں بوندا باندی کی ابتداء ہو جاتی ہے تو سب بچے بازو پھیلا کر اپنے ہی گرد گھوم گھوم کر مترنم آوازیں کہتے ہیں ۔

"ھَورَو! ھَورَو، ایردَے!   بانگ ءِ چُپکاں جیردَے!

یعنی" برکھا برکھا کھُل کے برس!   چودھرائن کے بچّے چھُوادے

یہ "لیب لچّہ" کا ذخیرہ بلوچی میں بہت زیادہ ہے اور یہ لوک ادب کا خاصا حصّہ ہے۔!

زھیریگ "زھیریگ" ایک ایسا فنِ سخن ہے جس میں شاعر اپنے دل سے اُٹھتی ہوتی ہوک کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ گزشتہ خوشحالی، چھوڑا ہوا مُلک، بچھڑے ہوتے لوگ یا کسی ایسی از دست رفتہ کی یاد میں بیقرار جذبات کو اُجاگر کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ الفاظ اظہار کے صحیح ذرائع ہیں مگر "زھیریگ" الفاظ سے زیادہ "سُر" سے متعلق ہیں، سواتے اس زھیریگ کے جو کسی شاعر نے لمبی نظم کی صوُرت میں کہا ہو۔

عام طور پر زھیریگ میں وہی "دوگال" یا دوھے استعمال ہوتے ہیں جو کتی اور اصناف موسیقی میں مستعمل ہیں۔ اس کی تشریح سے پہلے خود لفظ "زھیریگ" کے بارے میں باتیں ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔

کسی زمانے میں مستشرقین نے مشرق کی اُن تمام اقوام کو جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے عرب کا نام دیا ہے یعنی مسلم یا مسلمان کے بجاتے اُن کو "عرب" کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مستشرق "فلپ حتّی" (جو اسلامی تاریخ پر سند ہے) نے اپنی کتاب کا نام "دی عرب" رکھا۔ لفظ "عرب" سے اُس کی مراد "مسلم" یا "مسلمان" ہے۔ جس طرح یہ مستشرقین ان اقوام کو عرب کہتے تھے اُسی طرح یہ حضرات ان مسلم اقوام کی زبان، نسل، کلچر وغیرہ کو طوعاً و کرھاً زبردستی اُلٹی سیدھی دلیل اور حجّت کے ذریعے عرب قوم یا اس کی زبان سے وابستہ کرتے تھے۔

چنانچہ اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان محققین نے کس طرح بلوچ قوم کو زبردستی

گھسیٹ کر عرب نسل منوانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بلوچی زبان تک کو عربی سے مشتق منوانے کی کوشش میں ہر اس بلوچی لفظ کو جس کے معنی ان کے لئے روشن نہ تھے زبردستی گھسیٹ کر عربی لفظ قرار دیا۔ اسی سلسلے میں ان حضرات یا ان کے اندھی تقلید کرنے والے پیر تولوں نے موسیقی یا شعری ادب کے کئی عنادین کو عربی لفظ قرار دینے کی کوشش کی۔ مثلاً "سَوت" جو خالص بلوچی لفظ ہے۔ جس کی تشریح اوپر ہو چکی ہے اس کو بھی کسی مخبوط نے عربی کا "صَوت" قرار دیا تو دوسرے نے "سانسکرت"۔ حالانکہ ان حضرات کی اپنی علمیت بلوچی کے بارے میں صرف چند غیر بلوچ لکھنے والوں اور چند غیر مستند بلوچ لکھنے والوں تک ہے۔

ان مقلدوں نے اب ایک اور ڈھونگ کھڑا کر دیا ہے کہ زھیر یگ بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایک ایسے ہی محقق صاحب نے اس لفظ میں سے تین حرف "زھر" چن کر عربی ڈکشنری کی ورق گردانی شروع کر دی کیونکہ اس کو عربی کی وسعت و فصاحت کا اچھی طرح سے علم تھا کہ عربی الفبا سے مرکب کوئی ایسا ۳ حرفی لفظ بہت ہی کم ہو گا جو عربی ڈکشنری میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ ان حضرات کو "زَھَر" کا لفظ تو لامحالہ مل ہی جائے گا اور اسی ایک لفظ کے متعدد معنی بھی ہوں گے۔

اب جو معنی ان صاحبان کے مقصد سے زیادہ ملائم اور قریب ہوا اس کو اپنی تحقیق کا نچوڑ قرار دے کر بلوچی زبان کا بیڑا پار کرنا چاہا۔ موصوف لکھتا ہے کہ "زھیر یگ" کی اصل "زھیر" ہے۔ یہ لفظ عربی ہے "ازھر" و "ازھّر" بھی اسی لفظ کے مزید میں جن کے متعدد معنی ہیں سے ایک "آگ روشن" کرنا ہے۔ گویا گھر کی یاد کا آنا آگ روشن کرنے کے مترادف ہے۔ محبوب کی یاد سے تو آگ جل ہی اٹھتی ہے۔

واہ واہ کیا بات ہے۔ اوّل تو یہ کہ "اِزْھَرّ" کے معنی تو آگ جلانے کے بالکل نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی "پھول نکالنے" کے ہیں۔ "اِزھَرّ النبات" یعنی پودے نے پھول نکالے۔ باقی

رہا "اَزْھَرَ" تو اس کے معنیٰ اوّل بھی وہی "پھول نِکلنے" کے ہیں۔ البتہ معنیٰ دوم "روشن کرنے" کے ضرور ہیں۔ لیکن اِن دو افعال مزید کو چھوڑ کر ہم اصل فعل ثلاثی کو لیں گے۔ لفظ کا ماضی "زُھَرَ" ہے اور اس کا مضارع "یَزْھَرُ" اور مصدر "زُھُورٌ" ہے۔ اب اس کے معانی ملاحظہ ہوں (۱) چراغ، چاند یا چہرے کا چمک اُٹھنا۔ (۲) روشن کرنا (۳) کسی چیز کے رنگ کا نکھرنا (۴) آگ میں جلتی ہوئی اوپر والی لکڑی کا جل کر آگ کو روشن کرنا۔

اب حیرت کی بات یہ ہے کہ کونسی مجبوری تھی اس لفظ کو گھسیٹ کر عربی کے ان غیر مرتبط اور غیر متعلق معانی سے چسپاں کر دینے کی۔!

اس سلسلے میں اگر ان علماء و محققین کو اور مواد مہیا کر دوں تو نہ جانے یہ حضرات اس زبان سے ناآشنا ہوتے ہوئے کیا گل کھلائیں گے۔ لیجئے "مُونِک" بھی عربی ہے۔ اس کا ثلاثی فعل "مَتَک" ہے۔ ماضی "یمتک" مضارع "یمتک" اور مصدر "مَتک" ہے۔ اس لفظ کے عربی معانی بھی ان معتبر علماء و محققین کے دلوں کی حسرت نکالنے کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اس کے معنی ہے "کاٹنا"۔

اب اُسی "ازھر" کی طرح اس کی بھی یہی دلیل لیجئے کہ "مُونِک" سے غم کٹتی ہے یا، "مونِک" غم کو کاٹنا ہے۔ یا یہ کہ درد و غم سے دل و جگر کٹتے ہیں تو "مونک" کہنا پڑتا ہے۔ واللہ کیا فلسفہ ہے۔ اسی لُغت کے تحت "مزید" کا فعل "تمتک" ہے جس کے معنیٰ "تجرّع" یعنی "گھونٹ گھونٹ پینا" ہے۔ اور "مونک" کی صورت میں غم بھی گھونٹ گھونٹ پیا جاتا ہے (اگر غیر موضوع البحث نہ ہوتا تو میں ایسے بلوچی الفاظ کے مرادف الفاظ لا کر زبردستی عربی بنا کر سینکڑوں کی تعداد میں پیش کرتا)

تو یہ حالت ہے ہمارے محققین کی۔ حالانکہ "زھیرگ" خود اصل میں خالص بلوچی کا لفظ ہے جس کے دو مآخذ ہیں۔ اوّل "زھیر" کا لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ "گِلہ" کے ہیں اور یہ ایک اور لفظ کے ساتھ عام طور پر آتا ہے۔ کہتے ہیں "زنگ ءُ زَھیر" یعنی "گلہ و شکوہ"

یہ تو ظاہر ہے کہ شکایت اور گلا میں کیا فرق ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

دوسرا ماخذ اس کا "زار" ہے جس کے معنی "فریاد و فغان" کے ہیں اور یہ لفظ اردو میں بھی مستعاراً مستعمل ہے۔ اور "گریہ و زاری" کے مشہور جوڑے کا حصہ دوم ہے۔ "زار" کا لفظ دراصل "زَہَر" ہے جو ایک طرف "زہر" سے "زار" بن گیا تو دوسری طرف "زہر" سے "زہیر" اور پھر "زھیر" بن گیا۔ جس کے معنی پہلے ہی بتائے گئے ہیں کہ "گلہ" ہے۔ چونکہ اپنی اصلی حالت و لغت کے معنوں کے مطابق "زہر"، "زہیر" یا "زھیر" صرف الفاظ سے ادا کیا جاتا تھا اس لئے جب الفاظ کے ساتھ "رونا" یا "ترنم" کی رونی حالت کے سُر اس میں ملائے گئے تو اس لفظ کے ساتھ "گُریوگ" یعنی "رونا" کا لفظ بھی شامل ہو کر "زھیر گُریوگ" بن گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ دو لفظوں نے ایک لفظ کی صورت اختیار کر لی یعنی "زھیر گُریوگ" سے "زھیر گُریو" پھر "زھیر گر" اور آخر میں "زھیریگ" بن گیا۔ بلوچی کے چند ایک لہجوں میں ابھی تک "زھیروک"، "زھیرونک" اور "زھیر گر" کہتے ہیں۔

یہ بات بھی ناقابلِ تردید ہے کہ "زھیریگ" سُننے اور سمجھنے والے کی آنکھیں اگر نہ روئیں تو دل ہر حالت میں روتا ہے۔ تو یہ تھا وہ لفظ جو بالکل خالص بلوچی الاصل ہے جس کو بلوچی زبان سے قطعی ناآشنا لوگوں نے اپنی مزعوم علمی قابلیت کے ثبوت میں عربی بنا دیا۔

جیسے کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "زھیریگ" کو الفاظ سے زیادہ سُر سے تعلق ہے۔ اور بلوچی موسیقی میں اس "زھیریگ" کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ بلوچی میں یہ شاید واحد صنف موسیقی ہے جو مکمل طور پر "سارے گاما" میں مقید ہے اور "سرگم" متعین ہیں۔ اور (۱) اشرف دَرائی (۲) بیگمی (۳) سرحدی وغیرہ اقسام پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کے سرگم دوسرے سے مختلف ہیں۔

(اس سلسلے میں موجودہ وقت میں مکران کے کہن سال اور آزمودہ کار شخصیت میر

عیسیٰ قومی کی ہے جن کو ان چیزوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہیں۔ ہماری ان سے استدعا ہے کہ وہ ان چیزوں کو محفوظ کرے۔ ورنہ ان کے ضائع ہونے کا قوی امکان ہے)

زیادہ وضاحت کے ساتھ "زھیر یگ" کے بارے میں یوں کہنا اور اچھا ہو گا۔ مثال کے طور پر "زھیر یگ" کو آپ بالکل ہندوستانی موسیقی کا ایک "راگ" سمجھتے، جس میں "سُر" ہی ہر چیز ہے۔ البتہ "تال" اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ "تال" ہی اس کی تقسیم، تقطیع، تھوید، تنویم، تجوید، ترتیب، ترکیب، ترجیل وغیرہ کی وضاحت کرتی ہے۔

اب رہے الفاظ یعنی راگ کے بول تو درحقیقت راگ بہ جنسہٖ ان کا محتاج نہیں مگر "بول" کے چند خوبصورت اور جذبات کے صحیح مترجم الفاظ سننے والے پر کافی اثر کرنے کے علاوہ خود راگ گانے والے کے دل کی ہُوک کو بھی تسکین دیتے ہیں "بول" جتنے خوبصورت، بامعنی اور جذباتی ہوں گے اتنا ہی اثر کنندہ۔ اور ہاں اچھے "بول" خود راگ کو سجا بھی سکتے ہیں۔

"راگ" کے بول بہت ہی کم، مختصر مگر جامع و مجمل ہوا کرتے ہیں یعنی اگر ایک راگ کو آدھ گھنٹہ یا حتیٰ کہ ڈیڑھ گھنٹہ تک بھی گایا جاتے تو اس میں بول کا ایک ایک مصرعہ "بلمپت" اور "درت" کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ وہ اور بات ہے کہ "راگیا" اپنی مرضی کے مطابق مزید مصرعے بھی گاتا جاتے۔ مثلاً ہم ایک راگ کی سادہ ترین تقسیم کرتے ہوتے کہیں گے۔ "شروع میں "آلاپ" جو بغیر بول کے بھی گایا جاسکتا ہے۔ جس کو ایک اچھا "راگیا" پندرہ منٹ یا اس سے زیادہ تک طول دے سکتا ہے۔ اس کے بعد "بلمپت" کے لئے صرف ایک ہی مصرعہ کافی ہو گا مثلاً "بالموا آجا"۔ "بلمپت" کو "راگیا" پچیس تیس منٹ یا جتنا وقت اس کو میسر ہو، گاتے گا۔ لیکن "بول" کے لئے اس کو یہی ایک "بالموا آجا" ہی کافی ہو گا۔ (ویسے اگر وہ چاہے تو مزید مصرعے بول بھی سکتا ہے۔) اس

کے بعد" دُرت" کی باری ہو گی۔ جس کی لَے اور رفتار" بلمپت" کی دھیمی اور سُست رفتار سے تیز تر ہے۔ (بلمپت" اور" دُرت" کبھی ایک ہی تال مثلاً بارہ ماترہ کے اکتالہ میں گاتے جائیں گے اور کبھی دو مختلف تالوں میں یعنی اگر" بلمپت" اکتالہ میں گایا جاتے گا تو" دُرت" سولہ ماتروں والی تتالہ میں گایا جائیگا۔) بہر حال اس دُرت" کے لئے بھی" راگیا" کو صرف ایک مصرعہ

درکار ہوگا مثلاً" گھگھرنا بھرن دے" یعنی اگر اچھا راگیا ایک راگ گانے میں ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ بھی صرف کرے تو اس کے لئے یہی دو بول کافی ہوں گے۔ وہ اور بات ہے کہ وہ انہی دو بول سے متعلق چند اور مصرعے اضافہ کرے۔ یہی حال بلوچی" زھیرنگ" کا ہے جس کے لئے ہندوستانی راگ کی طرح چند بولوں کی ضرورت ہے اور انہی مصرعوں میں دو چار اور بڑھاتے جائیں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

" زھیرنگ" گانے کے لئے اس فنِ شاعری میں کہے ہوتے خاص مصرعہ یا نظم کے حصّے استعمال ہوتے ہیں جن میں اکثر فراق، جدائی، درد، رنج وغم کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ بلوچی عام کلاسیکی گوّیے اپنے کسی بھی گاین میں" زھیرنگ" بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح" زھیرنگ" بالکل علیحدہ اکیلا بھی گایا جاسکتا ہے۔

یہ تھی" زھیرنگ" کی پہلی قسم جس کو بلوچی گوّیے یا کلاسیکی گانے والے گاتے ہیں۔ اسی" زھیرنگ" کی ایک دوسری قسم بھی ہے جو اس سے زیادہ سادہ ہے۔ اس دوسری قسم میں الفاظ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے بلکہ ہم اتنا کہہ دیتے ہیں کہ یہ قسم الفاظ اور اس کے ترنّم آمیز زیروبم پر مبنی ہے۔ اس میں" آلاپ" بلمپت اور" دُرت" کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف اسی رِقّت آمیز سُر میں اُن الفاظ کو اُتارنا ہے۔ مثلاً" راگ ایمن، میاں کی ٹوڑی، کیدار یا مالکونس" جیسے لطیف راگوں کی رِقّت آمیز لَے میں اگر کوئی اچھی غزل رنگیں کرکے گائی جاتے تو اس میں اسی راگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بلوچی" زھیرنگ"

کی دوسری قسم بالکل اسی طرح ہے۔ یہ دوسری قسم کا "زھیریگ" اکثر تنہائی میں گایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک عورت کپڑے سیتی جا رہی ہے۔ (مشین سے نہیں ہاتھ سے) اور ساتھ ساتھ "زھیریگ" گاتی جا رہی ہے۔ اسی طرح کوئی عورت چکی چلاتی ہے تو بھی "زھیریگ" گاتی ہے۔ کپڑے سینے والی عورت کی آواز تو صرف اس کے نزدیک تک ہی محدود ہوتی ہے مگر چکی چلانے والیاں جفاکش عورتیں ہوا کرتی ہیں۔ یا تو وہ غریب گھرانے کی عورتیں ہوتی ہیں یا پھر امراء اور سرداروں کے گھروں میں کام کرنے والی بُردہ ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ لونڈیاں افریقین نسل کی ہوا کرتی ہیں اور افریقی نسل کی آواز عام طور پر اچھی ہوا کرتی ہے۔

سرداروں اور امراء کے گھروں میں کھانا زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لونڈیاں رات کے پچھلے پہر کے شروع ہوتے ہی جاگ جاتی ہیں اور گندم لے کر چکی پیسنے بیٹھ جاتی ہیں۔ عام طور پر چکی گھروں سے ذرا فاصلے پر ہوتی ہے۔ کیونکہ دن کو عام عورتیں بھی اس کو استعمال کرتی ہیں۔ تو یہ لونڈیاں آستینیں چڑھا کر غلہ پیسنا شروع کر دیتی اور اس کے ساتھ اپنی جذباتی اور پُرسوز بلند آواز میں "زھیریگ" گانا بھی شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی آواز انتہائی پُرسوز اور دردناک ہوتی ہے اور یہ عام واقعہ ہے کہ گاؤں کے اکثر لوگ ان کی آواز سے جاگ کر ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ پاکستانی بلوچستان میں آج کل یہ چیز تقریباً ختم ہو رہی ہے لیکن ایرانی بلوچستان میں ابھی تک کہیں کہیں یہ چیز بالواقع موجود ہے۔

علاوہ ازیں سفر کی لمبی راتوں کو آسان کرنے کے لئے "ساربان" "زھیریگ" گاتا ہے چرواہا بھی دامنِ کوہ میں اسی "زھیریگ" کا سہارا لیتا ہے۔ اسطرح کسی خوش آواز اور ترنم سے آشنا گانے والے کو لوگ اپنی مخصوص اور نجی مجلسوں میں بُلا کر اُس سے اس قسم کا "زھیریگ" سنتے ہیں۔ کیونکہ عام طور پر یہ دوسری قسم کا "زھیریگ" عام گانے بجانے کی محفلوں میں نہیں گایا جاتا۔

گزشتہ تمام رنج آلام یکسر بھول جاؤں گا
اور خوشیوں کی ایک نئی دُنیا بساؤں گا !!

لیکن مُلّا بہادر اومرزئی کا "زھیرلچہ" سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہونے کے علاوہ واقعی بلند تر مقام رکھتا ہے۔ بہادر اومرزئی کا ایک بیٹا ناراض ہو کر ہندوستان چلا جاتا ہے۔ پھر دوسرا بیٹا اس کو منوانے کے لئے جا کر واپس نہیں لوٹتا۔ اُن کی یاد میں مُلّا بہادر ایک "زھیرلچہ" کہتا ہے جس کو سُن کر اس کا تیسرا بیٹا اپنے دو بھائیوں کو منوا کر لانے کے لئے کمر کس کر گھر سے روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی "زھیرلچہ" سے اقتطاف پیش کرتا ہوں اس طویل "زھیرلچہ" کی ابتداء خدا کی حمد، نعت نبی اور اولیاء اللہ کی منقبت سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنی بے بسی کی حالت بتا کر خُدا، رسول اور اولیاء اللہ سے التجا کر کے کہتا ہے ؎

آپ ہی میرے اس لاعلاج درد کا مداوا کریں
میرا لختِ جگر آپ ہی کی پناہ میں ہے !
وہ میری ایک امانت ہے جو آپ کے سپرد ہے
وہ کہ جس کی عمر صرف بیس سال ہے ـــ
جس کے سر کے بال لمبے ہیں اور چہرے کے بال نکل ہی رہے ہوں گے اور ....
میرا متکبر سر اب غم سے جھک گیا ہے !
اس نوجوان کی یاد بُری طرح بیقرار کر رہی ہے
غم کے چھُرے میرے دل میں پیوست ہو رہے ہیں
اے بیٹے! تیری امی کی حالت اب مجھ سے دیکھی نہیں جاتی
وہ ساری ساری رات فریاد و فغاں میں گزارتی ہے

"زهیرنگ" کی پہلی قسم میں بلوچ کلاسیکی گویے کسی بھی شاعر کے پرسوز اشعار میں کچھ مخصوص مصرع یا جوگ بند (STANZA) چن کر گاتے ہیں۔ یا پھر مخصوص لکھے ہوئے "زهیرنگ" ہی کو گاتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہی بلوچی دوگال (دوھے) وغیرہ گاتے جاتے ہیں جن کا ذکر اسی ضمن میں پہلے ہوا ہے۔ اور دوگال کے نمونے اُسی عنوان کے تحت دیتے گئے تھے۔ اب قسم اول کے "زهیرنگ" میں استعمال ہونے والے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

ایک شاعر ملا حسن کا بیٹا ناراض ہو کر بصرہ عراق چلا گیا اور لوٹنے سے انکار کر دیا تو غم زدہ والد نے ایک "زهیرنگ" کہا اس کے چند مصرعے نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

"زهیر" میرے اندوھگیں دل کو چین لینے نہیں دیتے
کالی ناگن راتیں اسی کشمکش میں گزر جاتی ہیں
غم نے میرے پُر غرور سر کو نڈھال کر دیا ہے
کیونکہ میرا خوددار لخت جگر مجھ سے دُور چلا گیا ہے
اور میرے دشمن اسی وجہ سے شادکام ہیں!

آگے چل کر کہتا ہے :-

اگر میرا دلبند صحیح سلامت واپس آجائے
اور اسکے آنے کی بامراد اور شادماں خوشخبری صحیح نکلے
تو میں اسکی پیشوازی کے لئے خوشیوں کی للکاروں میں آگے بڑھونگا
اور اس پر عطر کی بارش کروں گا!
اس کے موزے دار پیروں کو چوموں گا!!
اس کے "نوخط" چہرے کے بوسے اور بلائیں لوں گا

تمہارے بھائی بھی تمہارے غم میں گھُلے جارہے ہیں
اُن کی آنکھوں سے آنسو اُبل اُبل پڑتے ہیں!

مُوتک

ابتداء میں لفظ "مُوتک" کے بارے میں اس لئے لکھنا ضروری ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر بلوچ اور بلوچی سے یکسر ناآشنا نام نہاد محققین اِس لفظ کو بھی باقی الفاظ کی طرح "عربی" نہ بناڈالیں۔ جیسے کہ "زھیربگ" کے باب میں کہا گیا ہے "موتک" کو عربی بنانے میں اُن کو بڑی آسانی ہوگی اور وہ بھی ہم نے ان کے لئے مہیا کر دیا ہے۔

یہ لفظ اوستا میں ۔ ۔ ۔ (اَمَیوَا) ہے اور پہلوی (زند) میں یہ لفظ مو، فارسی میں "مویہ" بلوچی میں "مُوتک" یا "مُودگ"۔

بلوچی "موتک" کی تعریف وہی ہے جو عربی میں "مرثیہ" یا "مرثاۃ" کی ہے اور یہی عربی کا لفظ اردو میں بھی رائج ہے۔ یعنی کسی کی موت پر اُس کی خوبیوں کو بیان کرنا اور اُس کی تلافی پر اپنے غم و غصہ یا رنج و غم کا اظہار کرنا۔

عام طور پر عورتیں ہی ماتم کرتی ہوئی "مُوتک" کہتی اور بین کرتی ہیں۔ عموماً چند ایک منظومات سے اقتطاف (اقتباس) شدہ کچھ مصرعے ہوتے ہیں۔ جو کسی زمانے کے نامعلوم شعرا کی تخلیق ہیں۔ اب ان شعراء کی پوری نظمیں تو دستبرد زمانہ سے نہ بچ سکیں۔ لیکن "مُوتک" کے یہ چند مصرعے چونکہ متواتر استعمال ہوتے رہے ہیں اس لئے وہ ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ ورنہ یہ کوئی علیحدہ چیزیں بالکل نہیں ہیں مثلاً۔

میری بخت کو سیمرغ نہیں لوٹا سکا
بھلا اس دور کے مُلّا کہاں لوٹا سکیں گے

یا یہ دو مصرع:۔

ہوا کتنی بھی چلے (قبر میں) تمہارے دل کو کوئی ہوا نہیں لگتی
بارش جتنی بھی برسے تمہارا دوپٹہ نمناک تک نہیں ہو گا

ان نامعلوم شعراء کی منظومات کے علاوہ بلوچستان میں مُلّا بہادر راد مرزئی کے "موتک لچّہ" اور "زَھیر لچّہ" سے اقتطاف کرکے عورتیں بین کرتی ہیں۔

اب اس عملی صورت سے ہٹ کر ہم بلوچی ادب میں دیکھیں گے کہ اس صنف سخن کا وہاں بھی خاص مقام ہے مگر جس طرح پُرانے ادب کا اکثر حصّہ ضائع ہو چکا ہے۔ یہ صنف سخن بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس لئے اُسی نام نہاد پُرانے ادب کے سرمایہ میں آج ماسوای چند ایک "موتک لچّہ" کے اور کچھ نہیں ملتا۔ مثلاً ڈیمز کی تالیف "پاپولر پوئٹری" میں صرف ایک ہی "موتک لچّہ" یا "مرثیہ" ہے جو نواب جمال کی وفات پر کہا گیا ہے جو کم وبیش (۱۶۴) ایک سو چونسٹھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ مگر اس میں نواب جمال خان کی سخاوت کی توصیف اور جمال خان لغاری کی تاریخ وفات ۱۸۸۱ء میلادی ہے جس کا شاعر پنجو بنگلانی ہے۔ ڈیمز کے مطابق اس نے یہ نظم خود شاعر ہی کی زبان سے سُن کر نقل کیا ہے ۱۸۸۴ میں۔

اس کے مقتطفات پیش ہیں۔

میر جمال خاں کی اور تعریف کرتا ہوں!
رہتی دُنیا تک اس کی نشانیاں اور قصّے باقی ہیں!

....

دو ہزار روپیہ مولویوں کو دے دیا
خوشی خوشی گھر کی طرف واپسی کے سفر میں
اس نے تین ھزار روپے خرچ کئے — !
رندوں کے علاقے تک جمال خان کی شہرت پہنچ گئی

جمال خان کی موت پر تمام بلوچوں نے افسوس کیا
پھر بہشت میں حوروں وغیرہ کے ذکر کرنے کے بعد شاعر کہتا ہے ؎
کاش کہ اولیاء، سید اور مومن دُعا کرتے۔
تو جمال نہ مرتے
مگر اللہ بے نیاز ہے اور سب سے طاقت ور ہے

....

اے اللہ! غم بار بار اٹھانا پڑتا ہے
غموں کے بعد تیری مہربانی اور بخشش بھی مل جاتی ہے
جمال خان تم ایک راج کے مالک تھے، لوگ تمہارے
سلام کو آتے تھے ....
وہ قاتلوں کو حکومت کی جیلوں سے چھڑالاتا تھا
اس کا لنگر صبح سے شام تک چلتا تھا
عام لوگوں کو وہاں خیرات ملتی تھی
علی الصبح خیرات مانگنے والوں کو اس نے گھوڑیاں
اور اونٹ بخشے
آج تمام چوٹی کے علاقے کو جمال خان کی موت کا سوگ ہے

لیکن آج تک جتنے "موتک لچہ" ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ان سب میں سے قابلِ ذکر وہی مُلّا بہادر او مرزئی ہے جس کا "زہیر لچہ" ہم نے "زھیریگ" کے زیرِ عنوان دیا ہے۔ لچہ سے پہلے اس کا پس منظر جاننا بھی ضروری ہے۔ جیسے کہ "زھیریگ" کے باب میں کہا گیا تھا۔ مُلّا بہادر او مرزئی کے تین بیٹے تھے۔ (۱) داد کریم (۲) تاج محمد اور (۳) یوسف۔ مُلّا بہادر کو اپنا بیٹا داد کریم بڑا پیارا تھا۔ اس نے اُس کی مرضی سے "منڈ"

میں ایک اچھے رند گھرانے میں شادی کا پیغام بھیجا۔ ویسے تو رشتہ قبول ہوا مگر جہیز میں بہت ہی بڑی رقم کا مطالبہ کیا گیا۔ مُلاّ غریب آدمی ہوتے ہوتے یہ مطالبہ پورا نہ کر سکا۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ اس لڑکی کو کسی دوسرے سرمایہ دار شخص سے بیاہ رہے ہیں تو دادکریم نے قسم کھائی کہ اگر ایسے ہوا تو اس پر اس مُلک کا پانی حرام ہے۔ چنانچہ وہ ہندوستان چلا گیا۔ کافی مدت کے بعد جب وہ نہ لوٹا تو اس کا دوسرا بیٹا تاج محمد بھی یہ سوگند یاد کرکے چلا گیا کہ جب تک اپنے بھائی دادکریم کو واپس منوا کر نہ لاؤں اس گھر کا پانی میرے پر حرام ہے۔ جب یہ نہ لوٹا تو مُلاّ بہادر نے اپنے دونوں بیٹوں کی یاد میں اپنا مشہور "زھیر لچہ" کہا جس کے اقتباسات زھیرگ کے باب میں دیئے گئے ہیں۔

اس "زَھیر لچہ" کو سن کر اس کا تیسرا بیٹا بھی وہی قسم کھا کر چلا گیا۔ اور اچانک اس بیٹے کی موت کی خبر آگئی جس کی واپسی کا وہ اس قدر بے قراری سے منتظر تھا۔ دادکریم کی موت کی خبر آنے پر مُلاّ بہادر نے اس پر "موتک لچّہ" (مرثیہ) کہا۔ اس موتک لچّہ یا مرثیہ سے چند بند نمونے کے طور پر پیش ہیں:-

شیر ببر کی طرح نڈر دادکریم نے
بچھوّ جیسے ڈسنے والی تلوار کمر میں باندھ لی
اور دُور دراز کے سفر پر روانہ ہو گیا
یہاں تک کہ وہ ہندستان پہنچ گیا
اور وہاں موت کی تلخ شربت کا پیالہ نوش کیا
آفریں ہے اُن ماؤں کے دِلوں کو کہ
جِن کے بیٹے ھندستان میں سپاھی ہیں
اور ھندی، سندھیوں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہیں
مائیں ان بیٹوں کے لئے اور بیٹے ان ماؤں کیلئے

"کپوت" کی مانند پہروں "کوکو" کرتے ہیں
اور رام شدہ "شاتل" کی طرح نالہ کش ہیں
جب کبھی بچے کھیلتے کھیلتے اچانک "امی" کہہ کر چلاتے ہیں
تو جیسے میرے دل کو ڈاتنیں نوچ کرلے جاتی ہیں

بعد کے شعراء میں سے ملا اسماعیل پلابادی (وفات ۱۹۵۷) نے کیچ کے میر مہراب خان گچکی کے بیٹے میر احمد خان کی وفات پر ایک موتک لچہ (مرثیہ) کہا ہے۔

ایک اور شاعر ابراہیم باھوٹ (شیہ کلگی) ہیں جو کراچی میں مقیم تھے اور یہیں وفات پاگئے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب حروں کی تحریک انگریزوں کے خلاف زوروں پر تھی اور سندھ میں اکثر ریل گاڑیوں پر حملہ کرتے تھے۔ تو ایسی ہی ایک ریل گاڑی جو پٹریاں نکلنے کی وجہ سے الٹ گئی تھی۔ حروں نے اس پر حملہ کرکے بہت سے لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ ان مقتولین میں عثمان خان، مستی خان کا بیٹا عبدالعزیز بھی تھا اور اسی طرح سر غلام حسین ہدایت اللہ کا بیٹا انور ھدایت اللہ بھی مارا گیا۔ اسی عبدالعزیز کی موت پر ابراہیم باھوٹ نے ایک مرثیہ کہا۔

"سدو" کی موت پر بہترین مرثیہ (موتک لچہ) کہا گیا ہے۔ اسی طرح عزت اللہ پنجگوری نے اپنی محبوبہ "نیرک" پر جو مرثیہ کہا ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔ ویسے بلوچی پرانے شعری ادب کے دوسرے دور میں کافی موتک لچہ یا مرثیے کہے گئے ہیں لیکن ان کو یکجا کرنا بہت ھی کٹھن کام ہے۔

۱۹۵۷ء میں جب ایک آزاد منش بلوچ صحرانشین کے خلاف ایران کی پوری فوج حرکت میں آگئی تو اس آزاد منش بلوچ دادشاہ اور اس کے بھائی احمد شاہ اور محمد شاہ سے مقابلہ کرتے ہوئے ایرانیوں کے علاوہ کئی ایک بلوچ سردار بھی مارے گئے جن میں سے سردار حسیم خان لاشاری، کریم خان لاشاری، یوسف خان مبارکی اور موسیٰ خان مبارکی قابلِ

ذکر ہیں۔ اس واقعہ کے فوراً بعد ایک شاعر نے اسی سردار جہیم خان لاشاری پر بہترین مرثیہ کہا جو سارے ایرانی بلوچستان میں دادِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔

نازینک اور دوسرے اصناف

یہ لفظ "نازینک" ہے اور "نازینگ" (نا۔ زِے۔ نگ) سے مشتق ہے۔ "نازینگ" کے معانی "حمد، وصف، ستائش" ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ کیونکہ اب "نازینگ" اور "نازینک" مختلف صورتوں اور معنوں میں بھی مستعمل ہیں حالانکہ بنیادی طور پر دونوں ہم معنی ہیں۔

"نازینک" اُس نظم کو کہتے ہیں جو دُولہا یا دُلہن کے وصف و ثنا میں کہی جائے۔ یہ ان گھریلو شادی بیاہ کے گیتوں کی فہرست میں آتا ہے جو روایتی طور پر کسی قوم میں باقی رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں "ھالو" بھی آتا ہے۔ چونکہ ان میں شعری اَدب کا حصّہ محدود ہے اور اکثر وھی گیت، سَوت وغیرہ یہاں بھی استعمال ہوتے ہیں اس لئے ہم اُن کی تفصیل میں نہیں جاتے البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ "نازینک" اور "ھالو" میں فرق ضرور ہے مگر دونوں خوشی کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔

"نازینک" اور "ھالو" گانے والی مخصوص عورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو وہ وھی گیت یعنی "سَوت" جیسے اشعار پڑھتی ہیں، نہیں تو وہ کسی بھی حماسی نظم کو لے کر بالترتیب اس کو شروع سے آخر تک "نازینک" یا "ھالو" کے روپ اور سُر میں گاتی ہیں۔ اس سلسلے میں "لاڑو" کے بارے میں بھی کچھ کہنا ضروری ہے۔

کچھ لوگوں نے "لاڑو" کی بھی عجیب تاویل کی ہے اور گویا ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ اس کو ایک علیحدہ صنفِ سخن یا صنفِ موسیقی قرار دے۔ حالانکہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے "لاڑو، لاڑے، لاڑی یا ئے لاڑو" تو محض ایک مصرعہ کے اوزان کی خاطر کہا جاتا ہے۔ یہ سب ایک ھی چیز "لاڑو" ہیں جو مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں کی وجہ

سے یہ اشکال پا گئے ہیں ۔ یہ ان عربی بحُور کی طرح ہیں جو ہر قسم کے " سَوت " گیت وغیرہ کے ساتھ ہم آہنگی کی خاطر کہے جاتے ہیں ۔ اگر ان کو ہم ایک صنف سخن یا صنف موسیقی کا نام دیں تو پھر ہم کو عربی کے بحُور کو بھی "بحُور" کی بجائے کوئی اور نام دے کر کوئی ایک صنف سخن یا صنف موسیقی کہیں وگرنہ جس طرح عربی اوزان بحُور کا یہ بحر " مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل " ہے بالکل اسی وزن اور بحر میں " لڑے لاڑے لڑے لاڑے لڑے گو " ہے اور ان کا استعمال بھی عام ہے۔

مثلاً " بلوچی زھیرنگ " میں یہی کلمات " سارے گاما " کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ اور بلوچی " سَوت " میں تو یہ عام مستعمل ہے اور تقریباً ہر سَوت کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ اور " سَوتی " (سَوت گانے والا) اور ہم نوا اس کو ضرور کہیں گے ۔

" نازینگ " ہر اُس منظوم کو ترنم کے ساتھ گانے کو کہتے ہیں جو کسی کی تعریف، نعت اور ستائش کے بارے میں ہو۔ مثلاً نعت، منقبت، یا قصیدے کے گانے کو بھی " نازینگ " کہتے ہیں۔

اسی طرح بچے کو بہلانے یا سُلانے کے لئے جو بھی مترنم چیز گائی جاتے وہ بھی " نازینگ " ہے۔ یاد رہے کہ یہ نازینگ (نا۔ زےں ۔ نک) یہاں مصدر ہے ۔ اس کو غلطی سے " نَازینک " نہ سمجھا جاتے ۔

سِپَت

سِپَت (سِ ۔ پَ ت) کا لفظ عربی کی " صفت " سے ماخوذ ہے یا اُس کی بلوچی شکل ہے ۔ اس کے معنی بھی وہی ہیں جو عربی کے ہیں ۔

بلوچی معنوں میں " سِپَت " وہ حمد و نعت اور دعائیہ اشعار کا نام ہے جو زچہ اور بچہ کے لئے کم از کم چھ دن یعنی چھٹی تک عورتیں جمع ہو کر گاتی ہیں ۔

کچھ لوگ نا آشنائی کی وجہ سے بلوچی قدیم منظومات کی ابتداء میں دی ہوئی حمد و نعت کو سِپَت کہتے ہیں جو سراسر غلط ہے ۔ بلوچی شاعری کے دوسرے دور کے

بعد جب فارسی اور عربی کا اثر بلوچی پر پڑنے لگا تو یہ رواج پڑ گیا۔ لیکن ہم اس کو نہ "صفت" کہتے ہیں اور نہ ہی "سِپَت"۔ بلوچی میں ان کو "سرنامہ" یا "سرنامگ" کہتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کسی بھی موضوع پر نظم کو انہی حمد، نعت و منقبت سے شروع کرتا ہے اور اصل موضوع کو شروع کرنے سے پہلے نظم ہی میں اکثر کہتا ہے کہ "رندچہ اِے سرنامگاں" یعنی ان "سرنامگ" کے بعد۔ اس لئے کسی نظم کی ابتداء میں ایسی چیزوں کو "سِپَت" کہنا سراسر غلط ہوگا۔

کچھ لاعلم لوگوں کو نہ جانے کیا پڑی ہے کہ جو کسی چیز سے متعلق لاعلم اور انجان ہونے کے باوجود اس کے بارے میں عجیب و غریب تاویلات کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔

مثلاً اسی سِپَت کے بارے میں ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "سِپَت، نہ حمد ہے، نہ نعت ہے، نہ منقبت ہے۔ اور نہ محبوب کی وصف کا بیان۔" اب ایسے لوگوں کو کون ہدایت کرے۔ اگر ہم کہیں کہ "سِپَت حمد بھی ہے، نعت بھی ہے۔ اور منقبت بھی تو وہ کس بساط پر اس پر بحث کر سکیں گے جب ان کو بلوچی زبان کے الفبا تک کی خبر نہیں۔ اور اسی طرح یہی شخص پھر کہتا ہے کہ "سِپَت، بلوچی لوک شاعری کی ایک صنف ہے۔"

لیکن ہم پھر کہیں گے کہ یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ بلکہ "سِپَت" بالکل کوئی صنف شاعری ہے ہی نہیں اور آج تک اس "سِپَت" کے متعلق کوئی پرانی چیز دستیاب تک نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی نظم کوئی ثبوت کے لئے پیش کر سکتا ہے۔

ان صاحبان نے جو منظومات مثال کے طور پر "سِپَت" کے نام پر دیئے ہیں ان میں سے ایک بھی سِپَت نہیں ہے۔ یہ سب یا تو "نازینک" ہیں یا "لوری"۔ اگر نہیں تو کسی قدیم نظم سے لئے گئے چند مصرعے ہوں گے۔ البتہ موجودہ دور کے کچھ جدید شعراء

نے کچھ ایسی چیزیں اردو ھندی کی لوریوں کی پیروی میں بلوچی میں کہی ہیں ان میں کچھ بلوچی لوریوں کے اشعار ملا کر زبردستی ان کو "سِپَت" کا نام دے رکھا ہے جو بنیادی طور پر غلط ہیں۔

ایک صاحب نے تو یہاں تک کمال کر دیا کہ بلوچی زبان اور بلوچی لوک شاعری کے موضوع پر مثالیں دیتے ہوئے اپنی لکھی ہوئی ایک اردو کی "سِپَت" نمونے کے طور پر بلوچی اصناف سخن کے سلسلے میں پیش کر دی ہے گویا بلوچی لوک شاعری میں اردو زبان میں کہی ہوئی "سِپَت" کا موجود ہونا بھی قومی روایت ہے یا اس کی نظر میں بلوچ عورتیں اردو زبان میں "سِپَت" گاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "سِپَت" اسلام کے بعد کی چیز ہے جیسے کہ اس کے نام سے عیاں ہے مگر بلوچوں کے معاشرے اور روایات میں کسی خاص مقام کی مالک بھی نہیں۔ مثلاً جس طرح روایتی لوریاں بلوچی زبان میں ملتی ہیں۔ روایات میں "سِپَت" کہیں نہیں ملتی۔ پرانی سے پرانی "سِپَت"، جو کہیں دستیاب ہوتی ہیں۔ وہ سب کے سب دوگال (دوھے) اور رباعی کی طرح دو سے لے کر چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ مزید براں یہ "سِپَت" قدیم بھی نہیں ہیں۔ اگر کوئی "سِپَت" دو یا چار مصرعوں سے زیادہ ہو بھی تو یقین ماننے کہ وہ جدید دَور کی ایجاد ہے۔

"سِپَت" کا طریقہ یوں ہوتا ہے کہ ایک یا دو عورتیں اُسی ایک یا دو مصرعوں کو ترنم کے ساتھ گاتی ہیں اور باقی عورتیں انہی مصرعوں کو دُھرائیں گی۔ کئی ایک مرتبہ اسی طرح کہنے اور دھرانے کے بعد اس کو چھوڑ کر کسی دوسری "سِپَت" کے دو یا چار مصرعوں کو اسی طرح گانا شروع کر دیا جائے گا۔

ذیل میں کچھ "سِپَت" بالترتیب اور نمبروار لکھے جاتے ہیں۔ ہر ایک نمبر کے آگے ایک مکمل "سِپَت" لکھی ہوئی ہے۔ یعنی یہی دو چار مصرعے والی ہر "سِپَت" اپنی

ذات میں مکمل ہے۔

۱: سپت ءُ ثناءِ ھُدا لائک انت
دُرّیں رسول لائک انت من سپتے جناں

ترجمہ :۔ (صفت اور ثنا کے لائق خُدا ہے رسول اکرم لائق ہے
میں صفت گاتی ہوں۔)

۲:۔ بی بی فاطمہ آپ پیغمبر زادی ہیں۔ ہمارے ننک (بچّہ) کے سامنے تشریف رکھ
ہم تن من آپ پر قربان کریں گے ہمارے ننک کے سامنے تشریف رکھ

۳:۔ ہمیں تو ننک کا وہم و گمان تک نہ تھا!
لیکن خدا نے ہمیں اچانک یہ ننک بخشا!
میں رسول اکرمؐ پر قربان جاؤں....
ہمیں اس "ننک" کا وہم و گمان تک نہ تھا

مندرجہ بالا امثلہ سے عیاں ہے کہ یہ "سپت" بالکل نئی چیزیں ہیں۔ ان میں عربی الفاظ کی کتنی بہتات ہے۔ کچھ تو ایسی "سپت" بھی ہیں کہ ان کو بلوچی تک نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً یہ "سپت" ؎

جنّت ءِ چراگ ءُ مسجد ءُ محراب منبر
دُرّیں ابابکر ءُ عمر عثمان حیدر

البتہ کچھ ایسی "سپت" بھی ہیں جو خالص بلوچی زبان میں ہیں مگر ہماری تحقیق کے مطابق ایسی تمام "سپت"، زگری فرقے کے ادعیہ (دعاؤں) سے ماخوذ ہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں ان کے ذکر و تذکار اور ادعیہ کی لمبی نظموں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ اِکّے دُکّے مصرعے بھی انہی سے مستعار لئے گئے ہیں۔ ان مصرعوں میں جہاں کہیں "محمدؐ" کا نام آیا ہے۔ یا صرف "واجہ" استعمال ہوا ہے اس سے مراد

زگریوں کے ہاں ان کے پیشوا " محمّد مہدی " ہے لیکن مسلمان اس سے "نبی محمد" مراد لیتے ہیں مثلاً ۔

۱:۔ ترمپ کاینت چہ سَرمُوناں واجہ ءِ گنجیں دراں
گل زمین ءَ ایر نند اَنت کہ گوش ءَ مرواردانت

۲۔ من نہ رواں چیر زمین
[من ءَ] ھجتّ بارت زیر زمین

۳:۔ چنکی گیت چنگ جنان ءَ   دریں محمد ءِ نام ءَ گراں ءَ

۴:۔ واجہ تئ بور کجا بستگ   ھمود ءَ کہ دودان رتلگ

۵:۔ دُرَ چک ءِ توبی ءِ ساھگ ءَ نندراں
جَنّت ءِ پُلاّں پہ گلے سِنداں ——— !

یہ نمونے جو اوپر دیئے گئے ہیں۔ دراصل یہ سب زگری فرقے کے ذکر اور دعاؤں کی لمبی نظموں سے لئے گئے ہیں۔ ان میں جہاں "واجہ" کا نام آتا ہے اس سے بھی زگری اپنے مہدی سے مُراد لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں "محمد جان" "دُرّیں محمد" واجہ محمد" کے استعارے خالص زگری فرقے سے متعلق ہیں۔ اسی طرح زمین کو "گل زمین" پہلی بار انہوں نے کہا ہے۔ (جملہ معترضہ کے طور پر کہتا ہوں کہ خود بلوچی زبان آج جس قدر اسی زگری فرقہ کے لوگوں کے ہاں محفوظ ہے اور کہیں بھی نہیں۔)

مطلب یہ کہ "سِپَت" جتنے بھی ہوں سب اسی طرح دو چار مصرعوں تک محدود ہیں۔ اگر کوئی "سپت" کے نام پر کوئی ایک لمبی نظم یا کسی حد تک بڑی نظم جو آٹھ دس یا بارہ مصرعوں پر مشتمل ہو کوئی پیش کر سکے گا تو وہ یقیناً بعد کی خود ساختہ ہوگی یا پھر لوریوں وغیروں سے اکٹھا کیا ہوا مصرعوں پر مشتمل ہوگی۔ البتہ اگر اس موجودہ جدید دَور میں کسی نے تفنّن طبع کی خاطر کوئی چیز لکھی ہو تو اور بات ہے۔

البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ بلوچ ذگری فرقہ کی تمام عبادت ذکر و تذکار پر مشتمل ہے یہ ذکر و تذکار تمام منظوم ہیں۔ ان میں چھوٹی بڑی مختلف نظمیں ہوتی ہیں۔ ان نظموں میں خدا کی تعریف، مہدی کی توصیف، جنت، دوزخ اور اعمال ثواب و گناہ کا بیان اور اپنی عبودیت اور بندگی کا اعتراف بھی شامل ہے۔

جدید شعری ادب کا آغاز

اب اس بنفسہٖ مختصر بیان کو اور اختصار دے کر بلوچی جدید ادب یا دورِ جدید کی طرف آتے ہیں جیسے کہ علی حاشش الکلام یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس قدیم شاعری کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بلوچی جدید ادب کا قابل ذکر دور تو صرف ۱۹۵۰ء سے آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ نثری ادب کے مقابلے میں جدید شعری ادب کا آغاز چند سال پہلے ہی ہو چکا تھا اس لئے ہم نثری ادب سے پہلے اس شعری ادب کے بارے میں چند باتیں کہیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔

ملنگ بابا کی وفات سے پاکستان تک

اگر ہم یہ کہیں کہ بلوچی جدید شعری ادب کا آغاز ۲۳-۱۹۲۲ء میلادی کے لگ بھگ ہوا ہے تو لوگوں کو اس میں ضرور مبالغہ سا نظر آئے گا۔ اس کا محرک چاہے کچھ بھی ہو مگر زبان کی خدمت کا جذبہ بالکل ہی نہ تھا۔ سب سے پہلے یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ جدید بلوچی شعری ادب غزل گوئی سے آغاز ہوا ہے حالانکہ یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یہ صنف سخن اس سے پہلے بلوچی زبان میں بالکل ناپید تھی۔ اور سب سے پہلے غزل کا آغاز کراچی کے ملنگ بابا (وفات ۱۳۴۴ ہجری) نے کیا۔

ملنگ بابا سے پہلے بلوچی زبان میں کسی نے غزل کہی ہے ہم نے نہ کبھی سنا ہے اور نہ ہی کلام دیکھا ہے۔ بالضبط تو یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ بابا مذکور نے کتنی

عمر اور کس سن و سال میں اپنی پہلی غزل کہی ہے لیکن ہماری تحقیق کے مطابق اس نے کوئی ۱۸ سال کی عمر میں تقریباً ۱۹۲۲ء میں اپنی غزل گوئی کا آغاز کیا ہے۔ بلوچی کے علاوہ اس نے اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ کراچی جیسے ایک شہر میں رہنے کے باوجود اُن کا مجموعۂ کلام آج تک شائع نہ ہو سکا۔ مزید افسوس اس بات کا ہے ان کے مجموعۂ کلام کا قلمی نسخہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملنگ شاہ کو کوئی اولاد نرینہ نہ ہوا۔ دو لڑکیاں ہوئیں جو اس کی وفات کے وقت چھوٹی تھیں اور ان کا کوئی سرپرست نہ تھا اور نہ ہی اس کا کوئی بھائی تھا جو اس سلسلے میں توجہ دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام بھی اسی طرح سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نسل منقطع ہو گئی اور ساتھ ساتھ اس کی شاعری کی پونجی بھی ضائع ہو گئی۔

ملنگ شاہ کی جتنی بلوچی غزلیں آج ہم تک پہنچی ہیں وہ سب کے سب اُنکے عقیدت مند مریدوں کو زبانی یاد تھیں اور عقیدتمندانہ طریقے پر گایا کرتے تھے۔ چونکہ اکثر گانے والے ان پڑھ ہوا کرتے تھے اس لئے ان میں کئی ایک غلطیاں واقع ہوتی گئیں۔ یہ بات یقین سے کہی جاتی ہے کہ اُن کی غزلیں فنی اعتبار سے بھی مکمل تھیں چنانچہ آج جو خرابیاں ان میں اُن گانے والوں کی طرف سے واقع ہوئی ہیں وہ باآسانی پہچانی جاتی ہیں اور ان کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک ان کے مجموعۂ کلام کو یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ــــ وہ جواں مرگ تھے کیونکہ ابھی تک وہ اپنی عمر کی صرف چالیس بہاریں دیکھ چکے تھے کہ کچھ ذہنی پریشانیوں اور کچھ عدم توجہی کی وجہ سے ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ حملے کے بعد ایک طرف تو ان کی پریشانیاں اور ذہنی الجھنیں اور بڑھ گئیں تو دوسری طرف جس دیکھ بھال اور توجہ کی ان کو ضرورت تھی۔ نہیں مل رہی تھی اور وہ اپنی موت

کو اپنے سامنے کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اسی بستر علالت پر اس نے اپنی بلوچی کی وہ مشہور غزل بھی پیشین گوئی کے طور پر کہی جس کی ابتداء یوں ہوتی ہے ؎

من مِراں کبرءَ منیگ ءَ چوک ءُ چار راہ ءَ کن اِت
گریوگ ءِ بدل ءَ منیگ ءَ چاپ ءُ نازینک ءَ جن اِت

(یعنی جب میں مر جاؤں تو میری قبر کسی چوراہے پر بنواؤ۔ رونے دھونے کے بجائے میری میّت پر شادی بیاہ کے گیت گاؤ۔

اگر اُن کی عمر زیادہ ہوتی اور وہ عمرِ طبعی کو پہنچتا تو یقیناً ان کا مجموعۂ کلام بہت ھی ضخیم ہوتا۔ دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں ان کی ایک غزل کا مطلع دیکھئے ؎

یک دو روچی ھست اِے دنیا اعتبارے ھچ نیست
آ کجُ اِنت سُلطان سکندر یادگارے ھچ نیست

(یعنی اس ایک دو دن کی دُنیا پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ——
کہاں ہے سلطان سکندر جس کی کوئی یادگار تک باقی نہیں)

ایک اور مشہور غزل کی ابتداء یوں کرتے ہیں ؎

اپسوز ھزار ارماں گنِداں نہ گنداں دوست ءَ —!
نیست اِشک ءِ درد ءَ درماں گنِداں نہ گنِداں دوست ءَ

یعنی :۔ صد ھزار افسوس اور ارمان کی بات ہے کہ دوست کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ عشق کے درد کا واقعاً کوئی علاج نہیں کہ دوست کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔

ملنگ بابا ؛
جدید شاعری کا پیش آہنگ

جب تک ملنگ بابا زندہ تھے کسی دوسرے جدید شاعر کا نام سننے میں نہیں آیا۔ اُن کی وفات

کے کئی سال بعد دو چار جدید رنگ میں نعت گو شعراء نے ظہور کیا اور پھر دو ایک اور غزل گو شعراء پیدا ہو گئے جن میں عبدالحکیم حقگو اور محمد خان جنگی پیش پیش تھے۔ مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو مرحوم ملنگ بابا کی وفات سے لیکر پاکستان بننے تک ایک خلا سا تھا جس کو کوئی اکا دکا غزل یا نعت کہنے والا شاعر پُر نہ کر سکا۔ البتہ پاکستان بننے کے بعد جب ریڈیو پاکستان سے پہلی بار بلوچی زبان میں نشریات شروع ہو گئیں تو وہ بلوچ جو اس سے پہلے اردو شاعری کرتے تھے یا جن کو شاعری سے لگاؤ تھا اس طرف متوجہ ہو گئے اور بلوچی شاعری کے میدان میں اتر گئے۔

وہ شعراء جو اس سے قبل اردو شاعری کرتے تھے اور ۱۹۴۹ء میں فوراً بلوچی شعر کہنے لگے ان میں بلوچستان کے محمد حسین عنقا، گل خان نصیر اور آزاد جمالدینی قابل ذکر ہیں دوسری طرف کراچی کے محمد قاسم ھوت، قاضی عبدالرحیم صابر، دوست محمد بیکس، اسحاق شمیم، جیسے اردو شعراء کے علاوہ دوسرے شعراء بھی پیدا ہوئے جن میں اسماعیل ساجدی محمد حسین عاجز، محمد حسن تاج، احمد زہیر، احمد جگر وغیرھم بھی میدان میں کود پڑے۔ جس کا انگیزہ (محرک) ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام تھے۔ اس لئے ہم ریڈیو پاکستان کے ممنون ہیں کیونکہ اگر یہ پروگرام اس وقت شروع نہ کر دیئے جاتے تو بلوچی ادب کا جدید دور ۱۹۶۰ء سے پہلے کبھی بھی آغاز نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء کے بعد پاکستانی عوام میں زبان کی وقعت اس کا اثر و رسوخ اور طاقت کا مکمل مظاہرہ ہونے لگا تھا۔ چونکہ بلوچ نوجوان اکثر انہی سالوں میں کالجوں میں گھس گئے تھے یا جن کو اس سے قبل یہ موقع مل گیا تھا اُن میں یہ شعور جاگ گیا، تو ہمیں یقین ہے کہ یہ نوجوان ضرور زبان کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اس طرف ضروری قدم اٹھاتے۔ اس کا ثبوت ہمیں بعد میں اسی صورت میں مل بھی گیا ہے۔ کیونکہ انہی متوقع نوجوانوں میں سے غفار ندیم، کریم دشتی، عطا شاد صدیق آزات، نسیم دشتی جیسے شعراء اور نثر نگار پیدا ہو گئے۔

بلوچی غزل

جیسے کہ کہا گیا تھا بلوچی جدید شاعری کی ابتدا۔ غزل گوئی سے ہوئی تھی اور وہ بھی فارسی کی پیروی میں۔ یہ صحیح ہے کہ اردو غزل کی دیکھا دیکھی میں بلوچ شعراء نے بلوچی غزل کہنی شروع کردی۔ (ویسے ابتداً یہ بلوچ شعراء اردو ھی میں شاعری کرتے تھے۔) لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بلوچی غزل فارسی کی پیروی کرتی ھے کیوں کہ یہ دونوں زبان کا بہت ہی پُرانا رشتہ قائم ہے اور اس حقیقت سے انکار کرنا اَمرِ واقع سے چشم پوشی ہوگی کہ اردو کی غزل گوئی صد در صد فارسی کی نقل ہے اور ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ اردو کی غزل گوئی پاک و ھند سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی ہے ہر ایسے فن کا اپنا جداگانہ مزاج ہونا ضروری ہے لیکن اردو غزل کا مزاج بکلّی ایرانی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں فارسی زبان کی تیار شدہ بندشیں، محاورے، استعارے اور عام الفاظ ھی استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ایک اچھّی اردو غزل میں ماسوائے کا۔ کے۔ کی اور کرنا، جانا جیسے افعال ھندی الاصل کوئی اور لفظ شاذ و نادر ھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ اور بات ہے کہ اگر کسی شاعر نے دیدہ و دانستہ کوشش و کاوش کرکے عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا ہو۔

فارسی الفاظ کے علاوہ عربی کے وہ تمام الفاظ بھی مستعمل ہیں جو فارسی ادب میں رائج ہیں۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے کہ اردو میں فارسی اور عربی کے اکثر الفاظ غلط معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں حتّیٰ کہ کئی الفاظ غلط اِملا میں بھی رائج ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی جدید شاعری بھی اردو ھی کی طرح فارسی غزل کی تقلید میں شروع ہوئی تا ابتدا۔ میں اردو ہی کی طرح غزلوں کا مزاج، انکی بندشیں اور خیالات تک فارسی کی نقل تھے جس کی وجہ سے اپنی ابتداء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک بلوچی غزل کی روح فارسی غزل کی تقلید میں اپنے آپ سے دُور بھٹکتی رھی۔ ۱۹۵۰ء میں کہیں جاکر چند ایک شعراء نے اس کی دستگیری کے لئے ہاتھ بڑھایا تو آہستہ آہستہ وہ اپنا صحیح رُوپ

دھارنے لگی اور غزل جیسی چیز جس سے بلوچی ادب، کلچر اور مزاج قطعاً بیگانہ تھے، اب کوئی اجنبی سی معلوم نہیں ہونے لگی۔ چنانچہ ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ ان تئیس ۲۳ سالوں کی مختصر سی مدت میں بلوچی زبان میں بہت بہترین غزل گو شاعر پیدا ہو گئے ہیں جن کی غزلیں کسی بھی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی غزلوں کے مقابلے میں لائی جا سکتی ہیں۔ البتہ اس حیرت انگیز ترقی کا سب سے بڑا سبب خود بلوچی زبان ہی کی بلاغت و فصاحت اور اُس کی ڈکشن کی ضخامت ہے۔ چنانچہ یہ شعراء اپنے کسی بھی قسم کے بہترین خیالات کو خالص بلوچی زبان میں کسی دوسری زبان کی اعانت کے بغیر مکمل طور پر اظہار کر سکتے ہیں۔!

اس سلسلے میں بلوچی غزل کے بارے میں ہم نہ صرف پُر امید بلکہ مطمئن ہیں۔ علاوہ ازیں یہ صنف سخن سب سے زیادہ مقبول ہے۔ چنانچہ اس میدان میں ہماری نوجوان نسل بھی کافی دلچسپی لے رہی ہے اور ان میں اچھے غزل گو پیدا ہونے کی اُمید بلکہ یقین ہے جن سے ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں۔

اگر ہم ان تمام قابل ذکر شعراء کے کلام کے نمونے یہاں پیش کریں تو ان صفحات میں اس کی گنجائش نہیں ہو گی اس لئے ہم صرف چند ایک چیدہ شعراء کا کلام بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کریں گے:۔

کاروان کس راہ سے گزرا ہے
اور میں کس غبار میں ہوں
دل بہاروں سے نا اُمید نہیں ہے
یہی وجہ ہے کہ میں بیٹھا سوکھے پیڑوں کو تک رہا ہوں
میں اتھاہ سمندر کا غواص ہوں!
بھلا موتی والے صدف کو میں کیسے نہ پہچانوں۔

سایہ بھی کوئی ہمیشگی ساتھی نہیں
دیکھتے میں راتوں کے اندھیرے میں اکیلے سرگرداں ہوں

انور صاحب خان

•

تم تو میری مطلوبہ حیات جاوداں ہو
میں اپنی ھی تلاش میں تیرے پیچھے بھٹک رہا ہوں

مدت ہوتی ہے کہ خواہشات کی بستی اُجاڑ دی گئی ہے
لیکن میں ابھی تک پُرسے پر بیٹھا ہوں ۔

ساتھ تو رہتا ہے مگر مجھے تسلی تک نہیں دیتا
میں تو اپنے سائے سے گلے شکوے رکھتا ہوں

کریم دشتی

•

اس ناداں دل کو دیکھ کہ تجھ سے وفا کا طالب ہے
کبھی سونے کا زیور بھی بغیر ملاوٹ کے ہوتا ہے ؟
ایسا نہ ہو کہ تیرے دہکتے رخساروں کو جھلس دیں !
اپنی زلفوں کو اس طرح چہرے پر خم نہ دے
میں اپنی زندگی یہیں ڈھونڈ رہا ہوں
کیا آبِ حیات تیری آنکھوں کا محتاج نہیں

محمد حسین عنقا

دل کیف و قدح سے سنبھلتا جاتے ہے
اے خدا اُن آساں غموں کو ذرا اور زیادہ کردے
خوشحال ادوار میں سے وہ کونسا دَور ہوگا!
جو ہمارے نصیب میں تمہاری زلفوں کی چھاؤں آئیں

بشیر بیدار

جب دلوں کے مالک کے چہرے سے نقاب ہٹ جاتا ہے
تو بھلا کس کا دِل سینے کے زنداں میں رہ سکتا ہے
غم ہو کہ خوشی تنہائی ناقابلِ برداشت ہے
آجاؤ کہ شریک ہونے سے ہر چیز بٹ جاتی ہے
ساری عمر انتظار میں گذار دی ہے غنیؔ ......!
عہدِ پیری میں همسزانی کیسے ہو سکتی ہے!

غنیؔ پرواز

دل سے نہ اُلجھ عشق کی آہوں کو بھول جا!
ہجومِ غم کو خوشیوں کے تبسّم سے بھُول جا!
یادوں کا عہدِ محبّت کے بھنور کی یاد ہے!
چاندنی راتوں کے، دل کے کراہنے کو بھول جا!
کون بے وفا ہے اور کون باوفا، دل تو بیگانہ ہے
اگر زندگی کے لئے بیقرار ہو تو جاننے اور پہچاننے کو بھول جا

عطاؔ شاد

ختم نہ ہونے والی دنیا جیسی حیاتِ جاوداں چاہتا ہوں
تکمیلِ عشق کی خاطر ایک قابلِ اعتبار عمر چاہتا ہوں!

....

آہ و فغاں نہ کر، یہ تیرے لئے باعثِ زیاں ہے
کیونکہ ایک دردِ بے خود ہے تیماداراور پاسباں ہے

احمد زہیر

جب تک ہم کو تمہاری زلفوں کی گھنیری چھاؤں نصیب نہ ہو
ہمارے دلوں میں ہوک کا خوفناک طوفان امنڈتا ہی رہے گا

....

میں نے اپنی ساری زندگی محبوبہ کی زلفوں کے سائے میں گزاردی ہے
لیکن محبّت اور پیار کے جذبات میں پھر بھی کوئی کمی نہیں آتی

برکت اللہ

قسمت تو پہلے ہی سے روٹھی ہوتی ہے
تو بھی روٹھ گئی ہے اور دُنیا بھی خفا ہے
کوئی بھی قابلِ ملامت نہیں، میری محبوبہ !
میں ویسے بھی پہلے ہی سے برباد ہوں !
مری محبّت سے بیزار ہوکر مجھ سے دُور دُور رہتی ہو
کیونکہ میری زندگی داغدار ہے اور میں مفلس و نادار ہوں
تمہاری محبّت کے نشے میں میں خُدا کو بھول چکا ہوں
تمہیں یقین نہیں آتا کہ پروردگار کو بھی مجھ سے گلہ ہے

اسماعیل ممتاز

میرا دل پھر کسی دلارام کے غم سے دست و گریباں ہے
وہ غم جو خوشیوں کے پیالے میں آمیختہ و ہم رنگ ہے

میرے نصیب کے اندھیروں میں کوئی فرق نہیں آیا
کیونکہ میرے اشکوں کے شیشوں کی روشنی بھی رنگیں ہے
بہاروں کی آمد تیرے ہی فرماں کی مطیع ہے !
گلاب ، سوسن کے پھول تمہارے نطق کے نقش ہیں

غوث بخش صابر

آزاد شاعری کچھ شعراء نے انگریزی آزاد شاعری سے متاثر ہو کر اس طرح کی آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں جو کافی کامیاب ہیں۔

ملکِ محمد طوتی کی نظم "خیام" سے ذیل کا اقتطاف کتنا دلکش ہے۔

خیام تو کہاں ہے ؟ خیام تو کہاں ہے ؟
تُو ہی میرے غم و اندوہ کا علاج ہے
جہالت کی گرج میں تو تُرنّم ہے، نغمہ ہے
بے مہریوں کے ایام میں تو مہر ہے، وفا ہے،
تُو دردوں کا حکیم ہے، بھولے بھٹکوں کے لئے کلیم ہے
(تو رجیم ہی سہی) ــــــــــــــ

میں جانتا ہوں میری محبوبہ! تیری راہ دُور اور میرے پاؤں کمزور ہیں
میں جانتا ہوں کہ میری زندگی گزر جائے گی اور ارمان نہ رہیں گے
جانتا ہوں کہ تو نہیں آئے گی، جانتا ہوں کہ نہیں آؤ گی
تُو شاعر کا خواب ہے ......
تُو تجلی کی چمک ہے ....
تو راتوں کا اُجالا ہے ....
تُو پریم کا پھول ہے ....
تُو ہمارے دل کی ہوک ہے .....
محبوباؤں کی ملکہ ہے .....
تو زیبائی ہے..........

ملکِ محمد طوتی

اکبر بارکزئی نوجوان شاعر ہے۔ بنیادی طور پر غزل گو ہے لیکن آزاد نظمیں بھی اچھی لکھتے ہیں۔ ذیل کی نظم مختصر لیکن مجمل و کامیاب ہے۔ ؎

آج کل میرا دل جیسے ایک ویران بستی کی
ویران مسجد ہے ....
جہاں تیری بیچاری یاد ایک قابلِ رحم مسافر کی طرح آکر
چند لمحوں کے لئے ٹھہرتی ہے
مگر کوئی بھی اس کی طرف دھیان تک نہیں دیتا
آخر، بادلِ ناکام وہ اپنی گٹھری پھر باندھ کر
ایک سرد آہ بھر کر اس بستی سے نکل جاتی ہے
تیری بے چاری یاد
تیری بے چاری یاد

اکبر بارکزئی

نوجوان شاعر بشیر احمد بیدار نے بھی اچھی آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

آنکھیں پتھرا گئی ہیں!
آس کے پیالے ٹوٹ چکے ہیں
اب کس کی راہ دیکھی جارہی ہے
گویا ہر راہ گیر
دل کی دھڑکنیں ٹھنڈی پڑ گئی ہیں
اُمید کے پھول مرجھا گئے ہیں
اب کس کا انتظار ہے

سورج ڈھلتا جاتا اور دل مرجھا جاتا ہے
پر مہر و وفا کا کارواں ابھی تک آنکھوں سے اوجھل ہے
کالی بھیانک راتوں میں چاندنی جو آزادی اور دانش کی علامت ہے،
بیقرار دلوں کے لئے ایک قرار ہے
نہ جانے کب مُرادوں کی منزل نظر آئے گی
دلوں میں صبر باقی نہیں رہا،
رات ڈھل چکی ہے اور چاند کھو گیا ہے
آجا کہ تیری نمود سے، خوشیاں منائی جائیں گی
یہاں کی ماہ رو اس خوشی میں بناؤ سنگھار کریں گی
اور یہ خشک پھٹی ہوئی زمین دوبارہ سرسبز و شاداب ہو گی۔

بشیر بیدار

عطا شاد کا اس دور جدید کے شعراء میں اپنا خاص مقام ہے۔ اگرچہ وہ مغربی طرز پر آزاد نظمیں لکھتا ہے لیکن غزل بھی بڑی اچھی کہتا ہے۔ ؎

مرا دلِ سارنگی کا وہ سُر ہے جو تیرے
گرم بدن میں پھیلے خماروں کی تانوں کو جگاتا ہے
"زھیرنگ" کا وہ ترنم جس کا نام "گوربام" ہے
بوڑھی خواہشات کے لئے
جوان سرِ شب لاتا ہے
فجر کی کلی کی طرح پھول کر گلِ شفق بن جاتا ہے

عطا شاد

گیت جدید اصنافِ سخن میں صنف "گیت" کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ "سوت" خود بلوچی کی ایک پرانی چیز ہے لیکن جدید طرز کے گیت اور اس "سوت" میں بہت فرق ہے۔ یعنی ہندی اور اردو گیتوں کی طرح بلوچی میں بھی مخصوص قسم کے گیت کہے گئے ہیں۔

اس دل کے ہر درد کی دوا تو ہی ہے ۔۔۔ تو پھر کیوں اس بزم سے دور رہتی ہو
میں ساری ساری رات انتظار کرتا ہوں ۔۔۔ رنج و اندوہ سے ہمکنار رہتا ہوں
تیری خاطر کونسی مصیبت میں نے برداشت نہیں کی
اس اُمید پر کہ شاید تم آجاؤ
میں تیرے لئے دربدر ہوں ! ۔۔۔ تمہاری دوری کے غم نے مجھے پیلا کر دیا ہے
تمہارے ساتھ بیٹھنے کو دل ترس رہا ہے ۔۔۔ نہ معلوم تم کہاں ہو
غموں کا وہ دور اب بیتنے کو ہے ۔۔۔ اب کوئی اندوہ باقی نہ رہے گا !
تمہاری ہر ادا پر قربان جاؤں ۔۔۔ اور تو مجھ پر فدا ہو جائے

نازؔ بلوچ کا یہ سوت ملاحظہ ہو ۔

مجھے تمہارے ننگ اور خرام ناز نے مار ڈالا ہے
تری مخمور آنکھوں کو اے مہ جبین میں جانتا ہوں
اے مہ پری کیا تمہیں خبر نہیں
کہ یہ دل تیری یاد میں تڑپ رہا ہے
تم نے تو کاری تیر مارا ہے لیکن میں ابھی تک زندہ ہوں
نازؔ بلوچ

ایک اور مشہور گیت سے اقتطاف ملاحظہ ہو۔

گزری ہوئی شادمانیوں کی یاد ستاتی ہے
تم نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا ہے میں اس کا گلہ نہیں کرتا،
کیونکہ مجھے تیری خاطر عزیز ہے
میں نے کتنے سال روتے گزارے ہیں
لیکن تم میری حالت زار تک پوچھنے نہ آتے، اب اور فریاد نہیں کر سکتا
میری زندگی تباہ کر کے کسی اور کو حیاتِ جاوداں بخش گئے ہیں
کیا یہی محبت کا صلہ ہے
میں تو اپنا دل چیر کر، تمہارے لئے سوغات کے طور پر لایا تھا
شاید ہی کوئی اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ لایا ہو
گزری ہوئی شادمانیوں کی یاد ستاتی ہے!

اگرچہ بلوچی قدیم شاعری میں اپنے ہی طرز پر قومی شاعری بھی کی گئی ہے لیکن جدید شاعری میں اردو کی تقلید میں نئے نمونے کی قومی نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے چند مصرعوں کا اقتباس پیش ہے ۔ ؎

انقلاب زندہ باد — انقلاب زندہ باد
سورج آگ اگلتا ہوا نکلے گا! سرخ گلاب کی طرح سرخ
انقلاب زندہ باد ......
کمر بستہ جوانمرد اپنی موت سے بے پروا جگر سوختہ اور دل کباب
انقلاب زندہ باد ......
پُر غضب، اسلحہ بند، پُر دم اور پُر حوصلہ اور شباب کی تب و تاب
انقلاب زندہ باد.........

بندوق، گن، توپ، بم، دم بدم نعرہ زناں   آگ، دھواں اور شعلے
انقلاب زندہ باد........
گل خان نصیر

میں تجھ پر نثار مجھے ایک مرتبہ تو آزما کے دیکھ
اے مقدس ماں، ہم تمہارے دودھ کے مرہون ہیں
اپنا دودھ اُن کو کبھی بھی مت بخش
جو اپنے ہاتھوں تمہاری سرزمین میں آگ لگا دیں
اسماعیل ممتاز

اِن دفاترِ پارینہ کو جلا کر کوئی نیا قصہ چھیڑ دو
اور اپنے لئے ایک غیر متزلزل ارادوں والی مجلس منعقد کرو
نئی زمین، نیا آسمان بلکہ ایک نئی دُنیا
نئے ستارے، اور نئے رات دن پیدا کرو
ہم نے غدار قائدین کو ستر اور سات مرتبہ آزمایا ہے
ان کو بھاڑ میں پھینک دو اور اپنے لئے کوئی شریف رہبر تلاش کرو
احمد زہیر

اے میرے وطن میں نے تجھ سا کہیں نہیں دیکھا ہے
کہیں ایسا ثانی نہیں پایا
تیرا پانی شہد و انگبین ہے، تمہاری اونچی پہاڑیاں کس قدر سرسبز ہیں
تیری ندیاں، تیرے نالے میرے دل و جگر کی ٹھنڈک ہیں
ملک محمد رمضان

دوسری نئی اقسام کی طرح رُباعی بھی جدید بلوچی شاعری میں ایک اضافہ ہے

نمونے ملاحظہ ہوں۔

سُن اے اندھیرے سے ڈرنے والے ، اے ہر آہٹ پر گھبرا اُٹھنے والے
ہر ایک نئے اندھیرے کے سامنے نکل آ ، ہر دیجورِ شب کے پیچھے چمکتا دن آتا ہے

غنی پرواز

⁂

پیتا ہوں تا کہ مدہوش ہو کر تمہاری یاد بھول جاؤں
جب تو نے اپنا عہد توڑا ہے تو میں کیوں نہ عہد شکن ہو جاؤں
ان ہونٹوں کی تشنگی کبھی ختم نہیں ہو گی
یا تمہارے لبوں کے شہد یا زہرِ قاتل پیوں گا !

اسماعیل تمنّاز

⁂

نہ جانے کب اس غبار سے کوئی سوار نمودار ہو
اور ان پتھریلے میدانوں میں منزل کرے
وہ ایک ایسے خطرناک ٹاٹیگر کی طرح ہو
جو ان آہ و نالوں کو ترنّم بخش دے

لال بخش دجی

⁂

کمزوری سے اس جہاں میں بات نہیں بنتی
یہاں بزدلی سے زندگی نہیں کی جاتی
مَردوں کے لئے تو وہ زندگی ہی غیر مرغوب ہے
جس میں تلخی اور آلام و مصائب نہ ہوں

⁂

یہ وہ آگ نہیں ہے جو خشک کانٹوں کو جلائے
یہ وہ بھاڑ (سیلاب) نہیں جو جنگل بہا لے چلے

مگر عاطش کے دل سے نکلی ہوئی آگ
تیرے سرسبز اور شاداب کھیت ویران کردے گی
عاطش

نئی شاعری یا جدید دور کے شعرا نے اگرچہ مرثیہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی ایسا صنف نہیں کہ بیٹھے بٹھائے اس پر فکر سخن کیا جائے۔ پھر بھی چند ایک شاعروں نے اپنی استطاعت اور رسائی فکر تک اپنے جذبات کا اظہار مراثی میں بھی فکر سخی کی ہے۔ ذیل میں ہدیہ قارئین ہیں۔

اے میرے بھائیو، دوستو اور رفیقو!
صرف آج سے چودہ دن قبل تک میں خوشیوں میں کھیلتا رہا تھا
میں نے اس ایک مضبوط قلعے سے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔
اور یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ خوشیاں دائمی اور ہمیشگی ہیں
مجھے خواب و خیال میں یہ گمان تک بھی نہ تھا
کہ اچانک مجھے وقت نے بری طرح نرغے میں لے لیا
خزاں اور باد سموم اپنے موسم گلوں کو جھلس دیتا ہی ہے
مگر خوشبودار گلوں کو گرم ہوا اس سے بھی جلدی مرجھا دے گی
مجھے گمان تک نہ تھا کہ فلک بے ریا اس طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے گا
کہ میرے منہ کے شہد و انگبین زھر بن جائیں گے
میرے بس کی بات تو ہے ہی نہیں، لیکن مفت میں ہاتھ پیر مار رہا ہوں
ایسے جیسے کوئی خاک میں کھوئی ہوئی چیز کو راکھ میں ڈھونڈ رہا ہو۔
"اب آنسو پونچھ کر آہ و فغان بند کروں گا"
"کیونکہ یہ بادل ہر شخص پر برستا گذر جاتا ہے۔

مرے غم و اندوہ کی کوئی انتہا نہیں اور یہ کبھی آسان نہ ہوں گے
جوانمرد ہمت سے کام لے کر مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہیں

یہ مرثیہ شاعر نے اپنے والد کی وفات کے چوڈن بعد کہا ہے۔ ذیل میں ایک اور مرثیہ کے چار بند ملاحظہ ہوں جو احمد زہیر نے اپنے پہلے اور کمسن بیٹے کی وفات پر کہا ہے۔

مقدس ماں بڑی آرزوؤں سے لوریاں دیتی تھی
شہد وانگبیں سے اس کو بہلاتی تھی
ملک الموت کسی بھی صورت میں دوست نہیں بنتا
یہی وجہ ہے کہ وہ لخت جگر جو کمخواب میں سوتا تھا آج خاک کی گود میں ہے

علاوہ ازیں کچھ شعراء نے لاڑو، ھالو یا نازینک وغیرہ کے نام پر بہت ہی کم ٹنک بندیاں کی ہیں لیکن یہ چیزیں نہ پرانے لاڑو، ھالو یا نازینک کی جگہ لے سکے اور نہ ہی ادبی حیثیت سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔ نازینک کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

میں دل وجان سے اُن پر قربان جاؤں
جن کے "جیگ" "دوتح" ہیں اور خود شرمیلی ہیں
خراماں خراماں چلنے والی دُلھن
میں تیرے "سَواس" کے پھول پر قربان جاؤں
اکٹھے ہو کر اس سرو قد سنگھار کی خاطر
"مسک" اور "مھلب" بھگو لو

لال بخش دجی

"سوت" نے اس جدید دور میں ضرور ترقی کی ہے اور خصوصاً جب سے بلوچی زبان میں کمرشیل ریکارڈ چھپوانے شروع ہوگئے۔ اس کے بارے میں چاہیئے تو یہی تھا کہ ہم گذشتہ ذکر شدہ اصناف سخن کے زیرِ عنوان "گیت" میں کچھ کہتے لیکن ہم نے اس کے بارے میں ایک خاص وجہ سے علیحدہ کچھ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ "سوت" — (گیت) ہیں کہ صرف اور صرف کمرشل ریکارڈوں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ اور پھر ان کو بیاہ کے مواقع پر پُرانے سوت کی طرح گاتے ہیں یعنی یہ صنف سخن کی حیثیت بالکل وہی "پُرانے سوت" کی سی ہوتی جارہی ہے۔ اور بالکل عوامی شکل میں اُتر رہا ہے۔ اور اس قسم کے سوت کے کہنے والے اکثر لوگ نہ تو جدید شاعری سے واقف ہیں اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی قوانین وضوابط سے آگاہ ہیں اور یہ شعراء انہی سوت کے علاوہ کسی دوسری شکل میں دو مصرعے بھی نہیں کہہ سکے لیکن اس نئے فن میں بیسیوں "سوت" بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ کمرشل ریکارڈ سب کے سب کراچی ہی میں چھپتے ہیں اس لئے یہ سوت گو شعراء اکثر یہیں کے ہیں یعنی کراچی ہی کے ہیں۔ ان کے سوت کی ترکیب پرانے سوت اور نئے اردو ہندی گیتوں کی آمیزش ہے۔ یہی وجہ ہے ان میں اکثر سیدھے سادے الفاظ میں بے باکی سے اپنا مافی الضمیر ادا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سوت میں، میرا مطلب ہے اس کمرشل کے نئے سوت میں ردیف اور قافیہ تو ایک طرف کہیں کہیں وزن تک کی پرواہ نہیں کی جاتی کیونکہ یہ اکثر فلمی گانوں کی طرح سُر پر ادھارک ہیں۔

اگرچہ جدید شعراء کی ایک اچھی خاصی تعداد اس "سوت" سے بیزار ہیں اور اس کے خلاف احتجاج بھی کرچکے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ اتنا مقبول ہوچکا ہے کہ اس کی حد نہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس صنفِ "سوت" کے خلاف احتجاج کرنا ویسا ہی ہوگا جیسا کہ اردو یا ھندی شعراء اردو ہندی فلمی شاعری کے خلاف

صدائے احتجاج بلند کریں جو کسی صورت میں باصواب نہیں ہے۔

اسی قسم کے "سوت" کے کمرشیل رکارڈوں کی وجہ سے بلوچی کے اچھے اچھے "سوت" گانے والے پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے یہ کمرشیل ریکارڈ کراچی کے علاوہ اندرون سندھ، بلوچستان، گلف اور ایرانی بلوچستان میں حد سے زیادہ مقبول ہو گئے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان گانے والوں کی کوئی سرپرستی نہیں کی جارہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گراموفون کمپنی ان کے لوٹ کھسوٹ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہی ہے۔ نہ ان گانے والوں کو ان کا صحیح حق مِل رہا ہے۔ اور نہ ہی فروخت شدہ رکارڈوں کی صحیح تعداد بتائی جا سکتی ہے جس کی وجہ سے گورنمنٹ کا بھی بے انتہا نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ اس ترقی کے دَور میں اور گراموفون کمپنی جیسے پرانے اور حق شناس ادارہ نے کس طرح فریبی جال میں پھنسا کر بلوچی سوت کے اس دَور کا آغاز صرف ایک سو روپے کے معاوضہ پر کیا۔ ۱۹۵۴ء میں بلوچی کے سب سے بڑے کلاسیکی گانے والے فیض محمد کو اس قدر بہلایا اور فریب کے دام میں پھنسایا کہ اس کے تین کمرشیل ریکارڈ کے عوض اس کو صرف ایک سو روپے یک مشت اور "فل پے منٹ" کے حساب سے دیا گیا یعنی ایک صفحے کے صرف پندرہ روپے اور پندرہ پیسے۔ حالانکہ یہی تین رکارڈ آج تک ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر بک چکے ہیں۔ (یہ ایک علیحدہ موضوع ہے اس پر علیحدہ خامہ فرسائی کی جائے گی۔)

نثری ادب بلوچی شعری ادب کے بارے میں اس اجمالی گفتگو کے بعد اب نثری ادب کے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔

فصاحت کسی بھی زبان کو فصاحت سے بولنا واقعی ایک قسم کا فن ہے

لیکن یہ فن سیکھا نہیں جاتا بلکہ قدرت کی طرف سے اس فصیح بولنے والے شخص کو ایک ودیعت ہے اور اگر کوئی عمداً اس فن کو سیکھے اور پھر اسی انداز میں بولنے کی کوشش کرے تو ایک اسٹیج ایکٹر یا ریڈیو پر بولنے والا کردار تو بن سکتا ہے مگر فصیح بولنے والوں میں کبھی اس کا شمار نہیں ہوگا کیونکہ اس کی ہر ایک چیز بناوٹ ہو گی اور بناوٹ میں وہ دلکشی نہیں ہے۔

ویسے تو فصیح بولنے کی زبان کو بقول عربی "افتہ الفصحاء" کہتے ہیں۔ اور "فصحاء" وہی فصیح کی جمع ہے اور فصیح کے ساتھ ذہن میں تعلیم یافتہ اور خصوصاً علمی زبان یا ادبی زبان پر حاوی شخص کا تصوّر پر ماننا نتا (چھاجاتا) ہے لیکن کسی بلیغ زبان کے بولنے والے کے لئے یہ ضروری نہیں۔

اگر زبان میں فصاحت و بلاغت فی نفسہٖ موجود ہے تو اس کے ان پڑھ بولنے والوں میں بھی فصیح لوگ پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی فصیح بولنے والا، فصیح لکھنے والا بھی ہو یعنی زبان کی تمام ضروری قوانین کی رعایت کر کے بہترین ادبی زبان لکھ سکے اور اسی طرح اس زبان کو اسی دلکشی اور فصاحت کے ساتھ بول بھی سکے۔ مگر کسی فصیح بولنے والے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ادیب، شاعر یا تعلیم یافتہ بھی ہو۔ اسی طرح کسی اچھے ادیب، اچھے شاعر یا اچھے زبان دان کے لئے ضروری نہیں کہ ایک فصیح بولنے والا بھی ہو۔

بلوچی زبان چونکہ خود ایک نہایت غنی اور پُر بلاغت زبان ہے اس لئے قرون بے سوادی سے ہی اس کی فصاحت و بلاغت قابلِ رشک رہی اور اس کے شعراء کے علاوہ فصیح بولنے والے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ اس وقت کے تمام شعراء ان پڑھ ہوا کرتے تھے لیکن آج تک اُن کے اشعار کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اسی طرح فصیح بولنے والے لوگوں کی

حیثیت شعراء سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مثلاً ایسا شخص کسی بھی مجلس یا اجتماع میں جب
بھی پہنچ جاتا اپنی فصاحت و بلاغت سے فوراً مجلس و اجتماع پر چھا جاتا۔ ایسے
شخص کے بولنے کا انداز، الفاظ کی ادائیگی، آواز کا زیر و بم اور جذبات کے اظہار
کا خاص طریقہ ہوتا تھا۔ جس طرح لوگ کسی مُغنّی یا مُطرب یا شاعر کو یک سُوئی کے ساتھ
سنتے ہیں۔ اُسی طرح اس کی باتوں سے کوئی شخص اپنی توجہ اور ذہن کو نہیں ہٹا
سکتا۔ کسی بھی ایک معمولی واقعہ کو وہ اپنے الفاظ، لہجہ اور اندازِ بیان سے اس
طرح پیش کرتا ہے جس کو سن کر لوگ عش عش کرنے لگیں۔ ایسے ہی لوگوں کے
بارے میں کہا گیا ہے کہ فلاں کی باتوں میں جادو ہے اس کے بارے میں قرآن کریم
میں بھی ذکر ہے کہ " ایسے بیان بھی ہیں جن میں جادو کا اثر ہے ۔"

ان لوگوں میں ایک خاص صفت موجود ہے جو کسی کوشش کی وجہ سے
نہیں بلکہ قدرتی ودیعت ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی بھی عامیانہ لہجے میں
باتیں نہیں کرتے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ خود اس سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ ان میں
یہ صفت خود موجود ہوتی ہے۔ عامیانہ لہجے سے میرا مطلب یہاں ان خود ساختہ
الفاظ کا استعمال نہیں ہے جو کسی معاشرے کی لاأبالیانہ زندگی یا غیر ذمہ دارانہ
اعمال و افعال کے نتیجے پر وجود میں آگئے ہیں جن کو ادبی زبان سے کوئی تعلق
نہیں یا ادباء و فصحاء کے ہاں ان کا استعمال تک مکروہ ہے بلکہ میرا مطلب زبان
کے الفاظ کو صحیح ادا نہ کرنے اور جملوں کو غلط ترتیب دینے سے ہے یا زبان کے
محاوروں کو غلط استعمال کرنا ہے۔ مثلاً انگریزی کے الفاظ "going" ——
(گوئنگ) یا "want" (وانٹ) کو goin (گوئن) اور "wan" (وان)
کہنا۔ اور عربی کے ھٰذا کو "دِہ" اور قُل کو "اُول" کہنا، فارسی کے "می شود" کو
"می شے" اردو کے "اتنا، کتنا" کو "اِتّا، کِتّا" اور اسی طرح بلوچی "گُتگ ئنتگ

اور اُنت اِنت" کو "کُتہ شُتہ" اور "آں ایں" کہنا ہے۔

اسی طرح جملوں کو صحیح ادا کرنا، گرامر کے مطابق ترکیب کرنا، صحیح محاورے استعمال کرنا۔ اور اسی طرح گفتگو میں استعارے، ضرب المثال کا برمحل استعمال کرنا ہے۔ ایسے ہی قسم کے لوگوں میں وہ اشخاص بھی ہیں جو کسی مجمع سے جب مخاطب ہوتے ہیں تو لوگ بتوں کی طرح خاموش ان کی باتیں سنتے ہیں۔ عربوں نے ان لوگوں کو "خطیب" کہا ہے جس کو انگریزی میں " ORATOR " کہتے ہیں۔ اور اردو میں اس کے لئے "مقرر" کا غلط لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ (کیونکہ "مقرر" کے معنی "خطیب" یا ORATOR کے بالکل نہیں ہیں۔) لکھائی پڑھائی عام ہونے سے قبل یہی لوگ زبان و ادب کے سند مانے جاتے تھے۔ یہ لوگ جب بھی کسی مجلس میں بیٹھتے تو لوگ ان کی باتیں سننے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر کوئی واقعہ چند مختلف لوگوں کے سامنے ہوتا اور وہ سب یکساں طور پر اس کے چشم دید گواہ ہوتے تھے اور پھر اس مجلس میں وہ سب کے سب حاضر ہوتے مگر یہ سب کے سب اُسی ایک شخص سے اس کے بیان کرنے کی خواہش کرتے کیونکہ اس کے انداز بیان سے اس واقعہ کا نقشہ لوگوں کے ذہن کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔

ہر قبیلے میں ایسے اشخاص کا ہونا اتنا ہی قابلِ فخر ہوتا جس طرح کہ ایک شاعر کا ظہور پذیر ہوتا اور یہی وہ اشخاص ہیں جن کو ادیب، خطیب، زبان شناس اور مورخ کہا جاتا تھا۔ (فی زمانہ تعلیم عام ہونے کے بعد یہ فنون تقسیم ہو گئے ہیں۔) رفتہ رفتہ ان میں سے ایک اور طبقہ نمودار ہو گیا جو عوامی سطح پر عوام سے متصل ہو گیا۔ اور یہی دوسرے لوگ یا طبقہ ہے جو آگے چل کر اچھے قصہ گو اور بزلہ سنج بن گئے اور انہی لوگوں نے اپنے زور بیان اور قدرت کلام کے بل پر بلوچوں کے واقعی واقعات تک کو رنگ ترنگ چڑھا کر افسانے کی تصویر بنا دی جن کو آج تک ہم لوک کہانیاں

کے نام سے جانتے ہیں۔

زبان کے شعری ادب نے تو بہت ہی پہلے بتدریج اپنے لئے قوانین وضع کر لئے تھے۔ جن کی شاعری میں رعایت انتہائی ضروری تھی اور نظم ایک ایسا فن تھی کہ تحریر میں نہ لاتے ہوئے بھی اس کے قوانین جاری و ساری ہو سکتے تھے مگر نثر کا ایسا ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ نظم تو صرف شاعر ہی کہہ سکتے تھے اور اُسی طبقے ہی کے لئے قانون کی پابندی ضروری تھی اور جب شعری قوانین کی پابندی نہیں کی جاتی، نہ اس کو شاعر کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی کہی ہوئی چیز کو کوئی شعر یا نظم ماننتا۔ اور پھر نظم کے قوانین خود نظم کے ساتھ بھی یاد کئے جا سکتے تھے اور شاعر کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ان منظومات کو بڑی آسانی سے ازبر کرتے تھے اور پھر اگر اس کو ایک شخص غلط پڑھتا تو فوراً اس کی تصحیح کی جا سکتی۔ پھر اگر یہی منظومات کسی ایسے علاقے یا ایسے لوگوں تک پہنچ جاتیں جہاں شعری ادب اور قانون سے آشنا یا شاعر موجود نہ ہوتا تو وہاں ان میں غلطی واقع ہونے کے زبردست امکانات پیدا ہو جاتے تھے۔ پھر نظم میں وزن، ردیف اور قافیہ خود ایک بہت بڑی حد تک اُس کے بڑے محافظ تھے۔

لیکن نثر میں یہ بات مشکل تھی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ نثر کسی ایک خاص طبقے یا گروہ یا ماہرینِ فن کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ پوری قوم یا اس زبان کے بولنے والی مخلوق کے روزمرّہ کے استعمال کی چیز ہے جس سے کوئی بھی فرد مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی لئے ان فصحاء اور خطباء کی پوزیشن یا مقام وہی تھا جو شاعروں کو میسّر تھا اور یہ فنِّ فصاحت یا خطابت بالکل شاعری کی طرح مخصوص فن ہی تو تھا جو ایک خاص طبقہ سے متعلق تھا۔ لیکن اس کی شکل اور کہنے کا طریقہ اور تراکیب وغیرہ شعر کی طرح کسی ردیف، قافیہ یا وزن سے متعلق نہ تھے۔ ویسے تو لوگ نظم و اشعار ہی کی طرح ان خطابات، واقعات، بیانات اور دوسری ایسی چیزوں کو

عموماً بڑی دلچسپی سے حسن کر منظومات ہی کی طرح ازبر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔
لیکن جب تک کسی شخص میں خود کسی حد تک یہی فن خطابت و فصاحت قدرت
کی طرف سے ودیعت نہ ہوتا وہ ان کو یاد تو کر سکتا تھا لیکن قدرتِ بیان نہ ہونے
کی وجہ سے الفاظ، تراکیب، جملات، محاورات اور استعارات کے استعمال میں
بھاری غلطیاں کر جاتا۔ اسی لئے جب بھی کسی زبان کی تاریخ میں وہ دور بھی
آپہنچا جس میں اس کے بولنے والوں کو اپنی تباہی کا خطرہ لاحق ہوا (ان خطرات کا
احساس عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جبکہ کوئی زبان غیر اہلِ زبان کے ہاتھوں غلط تلفظ
غلط تراکیب کے ساتھ مستعمل ہونا شروع ہو جائے)۔ تو اسی نقصان یا خطرے کے
سدّباب کے لئے زبان دان کچھ اصول وضع کرکے ان کے درس و تدریس، تعلم و تعلیم
کی تعمیم میں لگ جاتے ہیں۔ ان اصول و قوانین کے وضع کرنے کے بعد ہر شخص پر
ان پر پابندی سے چلنا لابدّی ہو جاتا ہے۔ اور پھر اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان اصول و
قوانین کی ترویج و تعمیم میں غیر اہلِ زبان کی کاوشیں قابلِ ستائش ہوتی ہیں کیونکہ
انہی لوگوں کو ان قوانین و اصول کی مکمل طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
اس کو ہم فن کے بجائے "علم" کہتے ہیں۔ یعنی کسی زبان کو فصاحت سے بولنا
تو فنّ ہے۔ مگر اس کو صحیح و بلیغ طریقہ پر لکھنا "علم" ہو گیا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ اہلِ زبان کو زبان کی صحت
لفظ و تراکیب اور نحو و صرف سے خود پیدائشی واقفیت ہوتی ہے اور اس کے مزید
سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ نظریہ قطعی غلط ہے۔ جن ادوار میں
زبان بالکل پہاڑوں، دشت و صحراؤں میں خانہ بدوش تھی اس وقت بھی زبان
میں عوام اور خواص بولنے والے موجود تھے اور وہی خواص (زبان کے سلسلے میں)
وہی مقام رکھتے تھے جو آج ایک زبان شناس عالم کا ہے۔ انہی خواص میں شاعر

خطیب، بذلہ سنج، واقعہ گو وغیرہ پیدا ہوتے رہے۔ اب جبکہ ہم نے زبان کے اصول و قوانین کے نظام کے مطابق تعلیم و تعلّم کو "علم" کا نام دیا ہے تو اس "علم" کے اصول کو جاننا بھی انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

جہاں تک بلوچی زبان کا تعلق ہے انیسویں[19] صدی سے پہلے کی کوئی ایسی چیز ہمیں نہیں ملتی جس کی رو سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ زبان کی صحت و سقم کو پہچاننے اور "خذ ما صفا دع ما کدر" کے بارے میں کوئی دستاویز موجود ہے۔ انیسویں صدی میں جب بلوچی زبان کو تحریری صورت میں ریکارڈ کرنے کا کام شروع کیا گیا تو ـــ مستشرقین نے کافی دلچسپی سے مواد جمع کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں ضرورت کے مطابق بلوچی زبان کے صرف و نحو پر بھی کتابیں لکھیں۔ اگرچہ یہ کتابیں قابلِ تعریف ہیں اور اُن کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں لیکن ان کی تمام تصانیف غلطیوں اور غلط فہمیوں یا لغزشوں سے بھرپور ہیں۔

اتنی مدت سے ان تصانیف کا مطالعہ صرف وہی لوگ کرتے رہے تھے جو بلوچی زبان کے اہل نہ تھے۔ اس لئے وہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکے اور جب بلوچی زبان کے نئے دَور کا آغاز ہوا تو ہم نے اہل زبان ہونے ہوئے اپنے آپ کو غیر اہلِ زبان پایا۔ کیونکہ بلوچوں کو ابتدائی بنیادی تعلیم غیر بلوچی زبان میں دی جانے لگی تھی۔ ایک طرف اگر ذریعۂ تعلیم فارسی اور عربی ـــ تو دوسری طرف سندھی اور اردو وغیرہ رہا۔ پھر ان کے معلمین بھی خود ایسی ذہنیت کے تھے جو متعلمین کو ابتداء ہی سے بلوچی زبان سے دُور رکھنے اور اس کو حقیر گردانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس زبان میں بنیادی تعلیم حاصل کرتے تھے اسی زبان کو اپنی زبان پر بھی فوقیت دیتے رہے۔ اور اُسی زبان کے اصول و قوانین، الفاظ و تراکیب کو اپنی زبان کے گلے

میں طوق لعنت کی طرح لٹکانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس عمل کا آغاز فارسی خوانی سے ہوا اور اس کے بعد سندھی اور اردو خوانی کا دَور آیا جو بالکل اسی نہج پر چلتا رہا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ جب بلوچوں کے لئے انگریزی سیکھنے کا دور آیا تو یہی نظریہ بالکل اپنی پرانی روش کے مطابق یہاں بھی کارفرما رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ابتدائی دَور کے فارسی دان فارسی زبان کی پیروی میں اس کے اصول کو بلوچی زبان پر مسلّط کرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ بالکل اسی طرح انگریزی خوان طبقہ بھی انگریزی کے اصول و قواعد کو تقلیداً عقیدت مندانہ صورت میں اپنانے لگ گیا۔

ہمارے موجودہ ادبا میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی بھاری اکثریت ہے۔ اور یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ اتنی تھوڑی سی مدت میں بلوچی ادبی دنیا میں اتنے سارے بلوچی ادبا اور شعراء پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ابھی تک بلوچی ادیبوں میں فصیح و بلیغ بلوچی لکھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ویسے تو ہمارے نویسندے WRITERS ہر موضوع پر خامہ فرسائی کرسکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں لیکن جہاں تک ایک پُرفصاحت اور پُر بلاغت ادبی زبان کے لکھنے کا تعلق ہے۔ یعنی وہ زبان جس میں زبان کے تمام صرف و نحو کی پوری طرح رعایت کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ادبی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہوں تقریباً مفقود ہے۔

یہ بات بھی غیر قابلِ انکار ہے کہ ادیب یا کسی بھی مضمون کا نویسندہ ایک مشین کی طرح ہے۔ جس طرح کہ ہر قسم کی مشین اپنا مخصوص کام کرتی ہے۔ اسی طرح مختلف ادبی لوگ مختلف کاموں میں جُتے ہوتے ہیں۔ ان ادبی مشینوں کو اپنے آلات کے مطابق مختلف مصنوعات بنانے کے لئے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خام

مال کی تیاری ان مشینوں کا کام نہیں۔ بلکہ یہ زبان شناس لوگوں کا کام ہے کہ وہ زبان کے اصول وقوانین مرتب کر کے تیار شدہ خام مال ادیبوں کو سپلائی کریں۔ کیونکہ جب کوئی ادیب کچھ لکھنے بیٹھ جاتا ہے تو اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ زبان کے اصول وقوانین بنانے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے ادیب اچھے سے اچھا مضمون تو لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی لکھی ہوئی عبارتیں، جملے اور تراکیب ادبی اصول وقوانین سے عاری ہوتے ہیں جو ظاہر ہے کہ ایک بہت ہی بھاری نقص ہے کیونکہ مضمون کا مقصد چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں بلاغت وفصاحت کا نشان تک نہیں ملے گا۔ اس سلسلے میں اگرچہ دو ایک مفید کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ہمارے ان ادیبوں کے دل ودماغ پر ابھی تک اپنے مدرسے سے تحصیل شدہ ہر چیز اتنی عزیز ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی زبان کی کتابوں کو نہ جانے کیا سمجھ کر ان کے مطالعہ کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے۔ اس لئے جب تک ہمارے نویسندے اس طرف خاص توجہ نہیں دیتے ان کی تحریریں ان عیوب سے پاک نہیں ہو سکتیں۔ البتہ اب کی نئی نسل نے جو بلوچی کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے ہم اس سے پُر امید ہیں کیونکہ ان میں بلوچی کتابوں کا ذوقِ مطالعہ اپنے پیش روؤں سے زیادہ ہے اور مطالعہ ہی ایسی چیز ہے جو کسی بھی علم کے حصول میں زیادہ ممدّ ومعاون ثابت ہوگا۔

فطری تبدیلیاں اصول وقوانین وضع کرنے سے پہلے زبان چونکہ فطری صورت میں مقید ومحبوس نہ تھی اس لئے وہ اپنے مزاج کے مطابق کچھ فطری تبدیلیوں کو قبول کرتی چلی آرہی تھی۔ اگرچہ ان میں سے کئی ایک تبدیلیاں کچھ عجیب سی لگتی ہیں مگر فطرت کے آگے کسی کی کیا چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصول

قوانین بھی انہی فطری تبدیلیوں کی بنیادوں پر رکھے گئے جو اس وقت تک تبدیل ہوتے ہوتے ہم تک پہنچے ہیں۔

بلوچی زبان میں کیا فطری تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں اس سلسلے میں ہماری بحث ایک مختلف راہ اختیار کرے گی۔ کیونکہ اس سلسلے میں ہمیں تاریخی دستاویزات مسکوکات، کتابیں یا کسی اور قسم کی تحریریں وغیرھا کے مطالعہ کی ضرورت پیش آتی ہے جو متاسفانہ ہمارے یہاں مفقود ہیں۔ پندرھویں صدی سے قبل بلوچی کے جادرے متعلق اس مضمون میں کسی اور جگہ بحث ہو چکی ہے کیونکہ ہمارے یہاں جتنی ایسی چیزیں اس وقت موجود ہیں، چاہے تحریری ہوں یا زبانی، سب کے سب پندرھویں صدی کے بعد کی ہیں۔

خصوصاً تحریریں تو ہمیں صرف انیسویں صدی ہی کی ملتی ہیں۔ ہم جب ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فطری تبدیلیوں کے سلسلے میں بلوچی زبان میں اُس وقت سے آج تک کوئی نمایاں چیز دکھائی نہیں دیتی۔ گویا بلوچی زبان میں جتنی فطری تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں وہ سب پندرھویں صدی سے قبل ہی مکمل ہو چکی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ عام فطری تبدیلیاں کون سی؟ کیسی اور کیونکر ہیں؟ اب جواب سے قبل چند نکات کی تشریح لازمی ہے۔

آج جن جن علاقوں میں بلوچ آباد ہیں ان کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ علاقے جن کو خاص بلوچستان کہتے ہیں ان علاقوں میں ـــ
۱۔ پاکستانی صوبہ بلوچستان ۲۔ ایرانی صوبہ بلوچستان و سیستان ۳۔ ایرانی فرماں داری گل دریای عمان (جو تین فرماں داری یعنی میناب۔ بندرعباس اور بندر لنگہ پر مشتمل ہے۔) ۴۔ ایرانی صوبہ کرمان کے شہر کرمان کے ساتھ اس

کا پورا مشرقی حصہ ۔ ۵۔ افغانی بلوچستان ۔ ۶۔ ڈیرہ جات۔

اس کے بعد دوسرے وہ علاقے ہیں جہاں بلوچوں کی بھاری اکثریت آباد ہے یعنی ۱۔ سندھ، بشمول کراچی ۲۔ صوبہ پنجاب، جہاں محمد اسلم خان بلوچ لانا پوری کے مطابق پچاس لاکھ بلوچوں کی آبادی ہے۔ ۳۔ مرو، جو روسی ترکستان میں ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان، خلیج فارس کی عرب ریاستوں اور سلطنت عمان، اور پھر مشرقی افریقہ میں بلوچوں کی کافی آبادی موجود ہے۔ اور مزید برآں ایران کے صوبے آبادان، ماژندراں اور گیلان کی بھاری بلوچ آبادی کے علاوہ ایران کا کوئی ایسا صوبہ نہیں جہاں بلوچ آباد نہ ہوں۔

باقی علاقوں کو چھوڑ کر ہم صرف پاکستان اور ایران کے درمیان والے علاقوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ایسی طویل و عریض سر زمین میں جہاں جنگ جہانی دوم سے پہلے وسیلہ ذریعہ آمد و رفت صرف اور صرف اونٹ تھا اور اسی جنگ سے پہلے ان علاقوں کے کسی بھی ایک حصے میں ایک اینچ سڑک بھی نہ تھی۔ اور اس وسیع علاقے کی مردمی آبادی بہت ہی کم ہے اور اسی تناسب سے یہ آبادی ملک کے مختلف جگہوں میں ایک دوسرے سے کافی دُور فاصلے پر آباد ہیں۔ مثلاً ایک آبادی کسی دوسری آبادی سے کوئی پچاس سے لے کر دوسو میل تک دُور ہے۔ اور اس پچاس میل کے سفر کے لئے پورے چوبیس گھنٹے درکار ہوتے تھے۔ یعنی اگر کسی کو ڈھائی سو میل سفر کرنا ہوتا تو اس کو پورے پانچ دن لگتے تھے۔ اسی طرح ایک جگہے کی آبادی مواصلاتی نقدان کی وجہ سے دوسری جگہے کی آبادی سے منقطع و منعزل ہوتی تھی اور ماسوای انتہائی ضرورت کے کوئی شخص ایک آبادی سے دوسری آبادی کو جانے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اور اسی

انفصال و انقطاع یا ابتعاد و انعزال نے زبان کے درمیان ایک خلیج ایک خلاء ۔ ایک فجوہ پیدا کر دیا ۔ اگر ایک جگہ زبان پر اپنے ماحول کے مطابق فطری تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوگئیں تو دوسری جگہ اس پر اس کے مختلف ماحول اور اثرات کے مطابق پہلی جگہ سے ذرا مختلف صورت میں کچھ ایسی ہی تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہوگئیں ۔ چونکہ ان دونوں جگہوں کا آپس میں کوئی باقاعدہ ربط و وصل نہیں تھا ۔ اس لئے ہر ایک جگہ کی مختلف تبدیلیاں اپنی جگہوں تک محدود رہیں ۔ یہی واقعہ ساری بلوچ سرزمین میں مختلف جگہوں میں اسی طرح مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ اگر " آھتن " کا لفظ جس کے معنی " آنا " ہے اب ایک علاقے میں اگر اس صورت میں موجود ہے تو باقی مختلف علاقوں میں یہ لفظ " آتن ، یھتن ، آندن ، اودن ، آمتن " اور پھر یکایک " آھگ ، آیگ ، یا ھیگ ، اور یایگ " ہے ۔

دوسری مثال " ریتن " (جانا) سے " ریتگ " رینگ ، رھتگ " اور شد سے شُت ، شوتا ، شُتنگ ، شتے ، شتگئے " بھی ہے ۔ لفظ " شمتی " (آپ کا) مختلف علاقوں میں " شمے ، شمائی ، شومے ، شوے ، شوائی " بھی ہے ۔ اسی طرح " استار " (تارا) ، زیمر " (ہنر) کے الفاظ " استال " اور " زمیل " بھی ہیں ۔

ہم اس سلسلے میں یقین کامل سے تو نہیں کہہ سکتے کہ ان الفاظ میں یہ فطری تبدیلیاں سب سے پہلے کب اور کہاں واقع ہوئی ہیں ۔ البتہ ان الفاظ کے ماخذ و مصدر و منبع کے متعین کرنے میں کچھ زیادہ نہیں ہچکچاتے ۔ کیونکہ ایسے الفاظ کی متعدد بلکہ کثیر مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ یعنی بلوچی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو " اوستا " میں بعینہ یا معمولی فرق کے ساتھ انہی معانی میں موجود ہیں ۔

اوستائی	بلوچی	معنی	اوستائی	بلوچی	معنی
آتھَرَ	آس	آگ	گَرَمَ	گرم	گرم
پَتِرَسَت	پُرس ات	پوچھا	گوز	گوْز	گزرنا
پَتِرَس	پُرس	سوال	پِتَ	پِت	باپ
کو	کے	کون	دھاک	دھگ	ایک نام ہے
نَرَ	نر	مذکر	دْرُو	دروگ	جھوٹ
دُرَعُوشو	دْرَپش	دستہ دار سُوا	دْرُوَنت	د دروگ بند	جھوٹا
سْپِیتَم	اسپیت	سفید	گر	گار	بھولا
ما	ما	ہم	ارَعُدنت	رُدانت	اگتے ہیں
چِت	چے	کیا	رُد	رُدگ	اگنا
زَبَت	زات	جننا	بَرزَ	بُرز	اونچا
پَسُ	پَس	بکری وغیرہ	پچ	پچگ	پکانا
آپَ	آپ	پانی	تف	تپ	گرمی حرارت

مندرجہ بالا سارے الفاظ اوستائی ہیں اور انہی معانی
میں اوستا کی مقدس کتاب میں موجود ہیں۔

اوستائی اور بلوچی کے اس طرح کے ترادف المعانی کلمات سے سارا "اوستا" بھرا پڑا ہے ۔ یہاں میں نے جو چند الفاظ دیئے ہیں ۔ یہ سب کے سب "اوستا" کے مشہور حصے "یسنا" کے "ھا ۹" کے فقرۂ اول سے فقرہ پانزدھم تک سے لئے گئے ہیں ۔

اگر ہم بلوچی کے ان ہی الفاظ کو "اوستا" کے یہی مترادف الفاظ سمجھ کر ان کی اصل شکل تسلیم کر کے بعد کے تغیرات کو "فطری تبدیلیاں" مان لیں ۔ پھر بھی وہی مشکل پیش آئے گی کیونکہ کئی علاقوں میں آج تک یہ الفاظ اپنے وہی پرانے لہجوں میں باقی ہیں جب کہ دوسرے علاقوں میں کچھ تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں ۔ ویسے بلوچی ادب کے اس دورِ جدید میں ان تمام مذکورہ علاقوں کے لہجوں کے امتزاج سے ایک مشترکہ ' ممزوج ' مزدوج ادبی تحریری زبان وجود میں آچکی ہے جس میں ہر لہجے کو فراخ دلی سے خوشامد کیا گیا ہے ۔ اور ساتھ ساتھ ہر لہجے کے استعمال کی پوری پوری آزادی دی گئی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہر علاقے کا نویسندہ اپنے علاقے کے لہجے کے لئے کوشش کرے گا لیکن آج اس تیس سال کی قلیل مدت میں زبان کو بالکل بے طرفانہ اپنے مزاج کے مطابق جو کچھ بھی بھا گیا اپنا گئی اور جو کھلا اس سے کترا گئی ۔

اگر ہم فطری تبدیلیوں کے بارے میں چند ایک مثالیں پیش کریں تو غیر قابل برداشت نہ ہوں گی ۔ مثلاً " ءَ " بلوچی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جو علم نحو کے مطابق حرف اضافت یا دوسرے کچھ لوگوں کے کہنے کے مطابق حرف "جار" ہے اسی کے معنی اردو کے "کا ۔ کے ۔ کی" (بلوچی زبان تذکر، تانیث وغیرہ کے جھگڑے سے

پاک ہے) یہ لفظ جس کسی کلمہ کے بعد آئے گا تو اپنی اصلی شکل وصورت اور آواز میں برقرار رہے گا ، جیسے "کتاب ءِ تاک" (کتاب کا ورق) "جنکّ ءِ پُشک" (لڑکی کی قمیص) " لوگ ءِ دروازگ" (گھر کا دروازہ).
لیکن ضمائر میں فطری تبدیلی واقع ہوئی ہے - مثلاً "آ - آیان - تو - شُما من - ما "[1] کے بعد "ءِ" (کا کے کی) کا استعمال - ان کی شکل دراصل یوں تھی - "آءِ ، آیان ءِ ، شُما ءِ ، من ءِ ، ما ءِ " لیکن فطری تبدیلیاں واقع ہونے کے بعد ان کی صورت اب یوں ہوگئی ہے -
"آئی ءِ ، آیانی ، تئی ، شُمئے ، منی ، مئے "[2] اسی طرح ان ضمائر کے بعد "ءَ" (کو - نے) کے آنے سے بھی حرف "من" اور "آیان" اپنی اصلی حالت میں رہے - اور باقی ضمائر میں فطری تبدیلی آگئی - مثلاً "من ءَ ، مارا ، ترا ، شُمارا ، آئی ءَ ، آیان "[3] ان کی ابتدائی شکل یوں تھی -
"من ءَ ، ما ءَ ، تو ءَ ، شُما ، آءَ ، آیان ءَ "
"اسی قسم کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں لیکن یاد رہے کہ یہ فطری تبدیلیاں تحریری صورت میں نہیں آئی ہیں بلکہ خود زبان کی ابتداء سے آج تک خود بخود واقع ہوتی رہی ہیں جن کی طرف صرف زبان شناس ہی اشارہ کرسکتے ہیں -

---

[1] (وہ ، وہ بہت ، تُو ، آپ ، میں ، ہم)
[2] (اس کا ، اُن کا ، تیرا ، تمہارا ، ہمارا ، میرا
[3] (اُسے ، اُنھیں ، تجھے ، تمہیں ، مجھے ، ہمیں)

قدیم نثری ادب

جس طرح خود بلوچ قوم کی تاریخ ایک حل طلب مسئلہ ہے، اسی طرح اس کا ادب بھی اس کی قوم کے نیک و بد کے مجازات و مکافات کا حامل رہا ہے۔

ویسے ایک فصیح و بلیغ بلوچی نثری ادب کا کوئی حصہ پندرہویں صدی سے قبل کا نہیں مل رہا ہے۔ اگرچہ ایک فصیح و بلیغ زبان میں شعری ادب کی طرح نثری ادب کا موجود نہ ہونا قطعی غیر ممکن ہے۔

جس طرح بلوچی شعری ادب جب تک خانہ بدوش رہا، اپنے اپنے قبیلوں تک محدود رہا۔ بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک خاندان کا ذخیرۂ ادب اپنے ہی خاندان یا زیادہ سے زیادہ ہمسایہ خاندان تک محدود رہتا تھا۔ چونکہ اس وقت کی زندگی ہی ایسی تھی کہ ایک خاندان سے دوسرے خاندان کی صرف ضرورت کے تحت ملاقات ہوتی تھی۔ بعد میں ضروریاتِ زندگی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ قبیلے کی سطح پر رابطہ قائم کریں۔ اس طرح شعری ادب اپنے خاندان سے نکل کر قبیلے تک پہنچ گیا۔ اور ایسے شعراء کا کلام کسی بھی قبائلی اجتماع میں سنا اور ازبر کیا جا سکتا تھا لیکن پندرہویں صدی سے پہلے کا یہی شعری ادب بھی ہم تک ان ہی ذرائع سے نہیں پہنچ سکا۔ جس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شاید اس قوم پر ایسی افتاد پڑی ہو کہ وہ اپنی ہر چیز کھو بیٹھی اور اس کے ساتھ اپنا ادب کا یہ حصہ بھی تھا۔ اس کی مثال کئی ایک متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کی تاریخ سے ملتی ہے جو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گئی ہیں۔

دوسرا سبب یہ کہ شاید پندرہویں صدی سے پہلے اس قوم کی مرکزی

حیثیت صرف خاندانوں کی سطح تک محدود تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو یقیناً ہر خاندان کا ادب
اس کے افراد تک محدود ہو کر ان کے ساتھ دفن ہوتا رہا ہے۔ اس کی مثال دنیا میں
باقی ماندہ ماقبل تاریخ کے وہ جنگلی لوگ ہیں جو آسٹریلیا، افریقہ، برازل اور برصغیر
کے بعض جنگلوں اور صحراؤں میں آج تک اپنی ماقبل تاریخی زندگی گزار رہے ہیں
جن کی اپنی مخصوص زبان ہے اور کہیں کہیں کسی حد تک ان ہی کے زمانے کا لکھنے پڑھنے
کا پرانا طریقہ اب تک باقی نظر آتا ہے۔ چونکہ ان کی زندگی خاندانوں کی بنیاد پر محدود
ہے اس لیئے ان کی ہر چیز ان کے ساتھ دفن ہو رہی ہے اور اگر یہی حال رہا تو ایک
دن وہ ماقد سبق اقوام کی طرح صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیئے مٹ جائیں گے۔

محققین نے اس سلسلے میں ہمیشہ ان پر نظر رکھی ہے اور یہی نتیجہ نکالا ہے کہ
ان کے افراد خاندان کی تعداد بُری طرح کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور یہ خاندان خود کیا
مٹ جائے گا کہ اپنے ساتھ اپنی زبان، اپنی تاریخ، اپنا ادب غرض کہ اپنا سب
کچھ سمیٹ کر لے جائے گا۔

بلوچی نثری ادب موجود ہے۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ بلوچی شعری ادب کی طرح
بلوچی نثری ادب بھی موجود ہے۔ شعری ادب
منظوم ہونے کی وجہ سے بڑی آسانی سے ازبر
کیا جا سکتا ہے۔ اور تقریباً ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ان میں سے کچھ نہ کچھ
یاد کرتا تھا۔ یا پھر کثرتِ استماع سے خود بخود حفظ ہو جاتا تھا۔

اُن اَدوار میں جبکہ دوسری مشغولیات نہ ہونے کے برابر تھیں سب سے بڑا مشغلہ
یہی اشعار سُننا تھا اور اکثر لوگوں کو کثرتِ استماع سے لمبی لمبی نظمیں بڑی آسانی سے یاد ہو جاتی تھیں
اس کی زندہ مثال دوسری زندہ زبانوں کی تاریخ ادب کی طرح

آج تک بلوچوں میں موجود ہے۔ جہاں دیہاتوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں رہنے
والے عام بلوچوں کو اکثر لمبی لمبی نظمیں ازبر ہیں۔ ان لوگوں کی قوتِ حافظہ
اتنی تیز ہوتی ہے کہ سوڈیڑھ سو مصرعوں کی نظم کو دو تین بار سننے کے
بعد بالکل ازبر کر لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کئی ایک
ایسے شخص بھی ہیں جو اتنی ہی لمبی نظم کو صرف ایک بار سُن کر ازبر کر لیتے ہیں۔

بلوچی شعری ادب کی طرح ہر خاندان یا قبیلے کا اپنا نثری ادب بھی موجود
تھا۔ وہ اس طرح کہ اپنی سرگزشت، زندگی کے حالات، واقعات، دلچسپ
باتیں، پرانے قصے، حکمت کی باتیں، پندونصائح وغیرہ اکثر دیوان، مجلس
میں بیان کیے جاتے ہیں جن کی صورت بھی وہی شعری ادب کی طرح زبانی
ہوتی تھی۔ اور اسی طرح سینہ بہ سینہ نقل ہوتے چلے آتے تھے۔

اِس ضمن میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح پندرہویں صدی سے پہلے
کا شعری ادب ناپید ہو گیا ہے اس کے برعکس نثری ادب کا کچھ بیش بہا حصّہ
پائیدار رہا ہے اور یہ سن کر مزید حیرت ہو گی کہ یہ حصّہ آج تک محفوظ ہوتا ہوا ہم
تک پہنچ گیا ہے۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جو چیز نظم میں ہو گی وہ زیادہ پائیدار رہے گی اور
ہر زبان کے محققین نے یہی نظریہ مان کر دوسروں کو بھی منوایا۔ چنانچہ ہر زبان
کی تاریخ میں پُرانے سے پرانا شعری ادب مدلّل ملے گا لیکن نثری ادب ہمیشہ
بعد کی چیز بتائی جاتی ہے۔ لیکن مجھے اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ میرا یقین یہ
ہے کہ شعری ادب چونکہ قبیلوں کے مرد افراد سے تعلق رکھتا تھا اس لیے جب بھی

قبائل میں کسی انقلاب کی وجہ سے انتشار پھیل جاتا یا لوگ بکھر جاتے تو اُن کی شعری ادب کی مجلسیں بھی ماند پڑ جاتیں اور یہ فجوہ (GAP) جتنا زیادہ بڑھ جاتا شعری ادب کے ضیاع کا اتنا ہی قوی امکان ہوتا۔ اس کے علاوہ قبائلی یا خاندانی چھوٹی موٹی لڑائیوں میں اکثر مرد لوگ مارے جاتے تھے اور ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کو شعری ادب کا بیشتر حصہ ازبر ہوتا۔ جس کی مثال ہمیں اسلام کی جہادی زندگی میں ملتی ہے، جبکہ لڑائیوں میں وہ مسلمان جن کو قرآن مجید ازبر تھا، زیادہ تعداد میں شہید ہونے لگے۔ جن کو حفّاظ (حافظِ قرآن) کہتے ہیں، تو اس خطرے کو بھانپ کر فوراً قرآن مجید کے نسخوں کی لکھائی اور حفاظت و تقسیم کا کام شروع کر دیا گیا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پیش بندی کتنی مفید ثابت ہوگئی۔

ٹھیک اسی طرح جب بلوچ قبائل یا خاندان کے وہ افراد جن کو بلوچی شعری ادب یاد تھا جب مارے جاتے تھے تو وہ اپنے سینوں میں لئے ہوئے شعری ادب بھی خاک میں لے جاتے تھے۔ کیونکہ ان کے محفوظ رکھنے کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔

اب دوسری طرف دیکھئے کہ شعری ادب کو جس قدر مردوں سے تعلق تھا اس کے سوا اس حصّے کا تعلق بھی عورتوں سے نہ تھا۔ مگر نثری ادب کو جس قدر مردوں سے تعلق تھا عورتوں کو اس صنفِ ادب سے مردوں کے بہ نسبت دگنا تعلق تھا۔ یعنی قبائل یا خاندان سے متعلق ہر واقعہ، حادثہ، تاریخی سرگزشت یا کوئی ایسی کہانی یا بیان عورتوں کو اتنا ہی یاد ہوتا تھا جتنا کہ مردوں کو۔ اور جس طرح مرد ان کو اپنی مجالس میں بیان کرتے تھے ـــــــ

اسی طرح عورتیں بھی اپنی اجتماعی زندگی کی مجالس میں ان چیزوں کو متواتر دہراتی تھیں۔ بلکہ اس سے بھی سوا عورتیں ان چیزوں میں مردوں سے بھی زیادہ دلچسپی لیتی تھیں۔

قبائل یا خاندان کی عورتوں کی زندگی کے واقعات مردوں سے مختلف تھے۔ قبائل یا خاندانی انتشار کی صورت میں ان میں تشتّط واقع نہیں ہوتا تھا اور لڑائیوں میں عورتیں ہمیشہ بچ جایا کرتی تھیں۔ بلکہ بلوچوں کا کلچر یہی ہے کہ عورتوں پر کبھی اور کسی حالت میں ہاتھ نہیں اُٹھایا جاتا۔ اب جو چیزیں عورتوں کے ہاں محفوظ تھیں وہ زیادہ محفوظ رہتی تھیں۔ یعنی شعری ادب کے علاوہ باقی تمام ادبی سرمایہ جو نثر کا ادب کہلاتا ہے۔ عورتوں ہی کے ہاں محفوظ رہا۔ اور سینہ بہ سینہ چلا آیا۔ اور آج تک چلا آرہا ہے۔

لوک کہانیاں

لوک کہانیوں ہی کو لیجیے جن کو حقیقتاً کسی بھی قوم کی تاریخی اور اجتماعی زندگی کا عکس سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ لوک کہانیاں جو آج کل کچھ عجیب سی لگتی ہیں، کوئی من گھڑت یا خودساختہ چیزیں نہیں تھیں بلکہ اپنی قوم اور مجتمع (معاشرہ) کی صحیح عکاسی کرنے والا نثری ادب یا تاریخ ہیں۔

یہ کہانیاں بالکل حقیقی سرگزشت اور مجتمع کی حقیقی تصویریں تھیں۔ یہ کہانیاں کیسے محفوظ رہیں اس بارے میں کسی بحث و تکرار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ عورتوں کی اجتماعی زندگی ہی ایسی تھی کہ فارغ اوقات میں خاندان کی عورتیں اکٹھے بیٹھتیں تو افراد، خاندان یا قبائل پر گزرے ہوئے تمام واقعات و حادثات جو اُن کی تاریخ کے حصے تھے بیان کرتی تھیں۔ اور یہی تاریخی اور اجتماعی زندگی کے صحیح واقعات چونکہ تحریری شکل میں نہیں

لائے جا سکے اور نہ ہی شعری ادب کی طرح منظوم تھے اس لئے ان کی راوی عورتیں اکثر و بیشتر مبالغہ سے کام لیتی تھیں جو ہر راوی کا خاصہ ہے۔ اور رفتہ رفتہ ان کہانیوں میں عجیب و غریب تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہو گئیں۔ اور بالآخر جب یہ کہانیاں ہم تک پہنچ گئیں تو تعجب خیز اور مدھش شکل اختیار کر چکی تھیں۔ کیونکہ مبالغہ آمیزیوں نے ان کی حقیقی صورت مسخ کر کے افسانوی رنگ دے دی تھی۔ اور آج تک یہی لوک کہانیاں ہمیں اسی مبالغہ آمیز شکل میں مل رہی ہیں جن کو لوگ صرف من گھڑت کہانیاں یا افسانے سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعری ادب کا پندرہویں صدی سے پہلے کا جو سرمایہ ضائع ہوا ہے نثری ادب کا وہی سرمایہ آج تک لوک کہانیوں کی شکل میں عورتوں ہی کی مہربانی سے باقی رہا۔ ان کہانیوں کے علاوہ دوسرے واقعاتی قصے اور داستانیں بھی انہی عورتوں کی مرہونِ منت ہیں۔ تو اس سے ثابت ہو چکا کہ نثری ادب کا سرمایہ ہمارے ہاں شعری ادب سے قدیم اور ضخیم ہے اور آج تک یہ سرمایہ عورتوں کے یہاں زیادہ محفوظ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تحریر میں بہت ہی کم لایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں زبان کے وہ قیمتی حصے جن کو ہم محاورہ، استعارہ، ضرب الامثال وغیرہ کے نام سے جانتے ہیں، بھی ہمارے نثری ادب کے گرانقدر سرمایہ ہیں۔ بالخصوص بلوچی کے ضرب المثل جن کو بلوچی میں "بتل" کہتے ہیں۔ نثری ادب کا ایک انتہائی مجمل و مختصر لیکن جامع ذخیرہ ہیں۔ بلوچی زبان میں کوئی ضرب المثل ایسا نہیں ہے جو اپنی پشت میں ایک پورے اور مکمل واقعے کی نشاندھی نہ کرتا ہو۔ ان میں وہ ضرب المثل بھی شامل ہیں۔ جو پندرہویں صدی سے پہلے کے واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ بلوچی زبان کے ہر ایک ضرب المثل میں

ایک پورے کا پورا واقعہ مضمر ہے ۔ اگر ان ضرب الامثال کو جمع کرنے کے بعد ان میں مضمر تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا جائے تو یہ بلوچی ادب کا بہترین سرمایہ بن سکتے ہیں۔ جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے ان ضرب الامثال میں بیشتر پندرہویں صدی سے پہلے کے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی زبان کا نثری ادب اتنا ہی ضخیم ہے جتنا کہ اس کا شعری ادب بلکہ اس سے ضخیم تر ـــــ اب جس طرح شعری ادب کو تحریری شکل دینے میں اتنی دیر کے بعد توجہ دی گئی ہے نثری ادب کی طرف اس کے مقابلے میں ایک فی صد بھی توجہ نہیں دی گئی ہے ۔

ھخامنشی آثارِ قدیمہ

اب ہم پُرانی تاریخ کے اوراق یا ازبر شدہ واقعات سے ہٹ کر آثار قدیمہ پر ایک نظر ڈال کر ان کی جھریوں میں جھانکنے کی اس لئے کوشش کریں گے کہ شاید ہمیں کوئی ایسی شکن نظر آئے جس کی سلوٹ میں ہمیں اپنے موضوع سخن کی وضاحت میں رشد و ہدایت کا کوئی سررشتہ نظر آئے ۔ اور اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے ان کتبوں اور سنگ بنشتوں کی طرف جاتے ہیں جو ھخامنشی شاہنشاہوں کی یادگار ہیں۔

وہ محققین جو بلوچی زبان سے واقفیت رکھتے ہیں وہ ان کتبوں اور سنگ بنشتوں کے مطالعہ کے بعد یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کتبوں میں بلوچی زبان کے الفاظ کسی بھی دوسری ایران نژاد زبان کے الفاظ سے زیادہ ہیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سنگ نوشتے کس زبان میں ہیں ۔

ان سنگ بنشتوں کے سمجھنے سے پہلے لوگ ہمیشہ یہی کہتے چلے

آرہے تھے کہ بلوچی زبان فارسی زبان ہی سے مشتق ہے یا اس کی شکستہ اور بگڑی ہوئی صورت ہے جس کا ہم تو شروع ہی سے منکر تھے۔ اب جبکہ نئی تحقیق کے مطابق ان یادگاری کتبوں کا گہرا مطالعہ اور ان کے نوشتوں کو حل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ پرانا نظریہ بالکل بے بنیاد اور لغو تھا۔ اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بلوچی زبان، فارسی کی بہ نسبت زیادہ قدیم ہے اور اوستائی زبان سے زیادہ بلکہ بالکل نزدیک ہے۔ جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اوستا کے بعد اس سرزمین کی قدیم ترین زبان بلوچی اور پہلوی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بلوچی زبان اور پہلوی زبان دونوں اوستا کی زبان سے نکلی ہوئی دو مختلف شاخیں اگرچہ ایک ہی لغت الام سے نکلی ہوئی ہیں مگر دونوں کے مزاج تک مختلف ہیں۔ یعنی ہر ایک اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت کی مالک ہے۔ ہم کچھ لوگوں کی تائید میں کسی تحقیق کے بغیر زبردستی یہ تو منوانا نہیں چاہیئے کہ بلوچی زبان ہی اوستائی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے مگر اس بات کا ضرور یقین رکھتے ہیں کہ قدامت میں اوستا کے بعد بلوچی زبان کا ہونا غیر قابل انکار ہے۔ البتہ اگر حقائق اوستائی زبان کو بلوچی زبان کی قدیم ترین صورت ثابت کر دیں گے تو ہم اس کے ماننے سے کوئی پس و پیش نہیں کریں گے۔

اوستائی زبان

اوستائی زبان کے بارے میں عرض کیا جا چکا کہ یہ زبان فقط اور فقط پیغمبر ایران حضرت زردشت کی کتاب مقدس کی شکل میں باقی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ کہیں بھی اس زبان کا ایک لفظ بھی میسر نہیں آتا۔ یہ بھی پُر لطف بات ہے کہ اوستائی زبان کے استاد جن کو اوستائی زبان اور کتاب اوستا پر کامل دسترس حاصل ہے، کوئی ایسی کتاب، کتابچہ یا مضمون مرتب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جو اوستائی

زبان میں ہو۔ اگرچہ اوستا کی مقدّس کتاب اپنی حیثیت سے مکمل اور جامع ہے لیکن اوستا میں اوستائی زبان کے وہ تمام الفاظ موجود نہیں ہیں جن کے وسیلے سے اس زبان میں اپنی طرف سے کوئی اُستاد اسی اوستائی زبان میں کوئی چیز لکھ سکے۔

دکن کالج پونا سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ پوسٹ گریجویٹ کالج خاصتہً لسانیات کی اڈوانس اسٹیڈیز کا مستند انسٹی ٹیوشن ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں اسی کالج میں تھا تو ہوسٹل میں ایک شخص ڈاکٹر این۔ ایس۔ شُکلا سے میری ملاقات ہوگئی۔ یہ صاحب سانسکرت اور اوستائی دونوں زبانوں پر کافی دسترس رکھتا ہے۔ اور پونا یونیورسٹی میں اوستا کے پروفیسر بھی ہیں۔ میری اس شخص سے مل کر خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی اور جب تک میں وہاں رہا ڈاکٹر صاحب سے "اوستا" کے بارے میں مستفیض ہوتا رہا۔ چونکہ میں پہلے ہی سے "اوستا" کے بارے میں اپنی علمیت بڑھانے کی کوشش میں مصروف تھا اس لئے ڈاکٹر شُکلا سے اس سلسلے میں اعانت کا طالب ہوا جو انہوں نے اپنی مہربانی سے مان لیا۔ اور جب تک دکن کالج میں رہا ان سے مستفیض ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس طریقے سے اوِستائی زبان اور اوِستا کے بارے میں میری راہنمائی کی اُس کا میں شکرگذار ہوں۔ اوِستا کے بارے میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی علیت کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ یقین ہے۔ علاوہ ازیں مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجھک نہیں کہ ڈاکٹر شُکلا نے اوِستا کے سلسلے میں مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے میں صرف کتابوں کے ذریعے اس قدیم ترین زبان کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اِس بات کی دلیل مجھے ڈاکٹر صاحب ہی سے مل گئی اور انہوں نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا کہ اوِستا اپنی حیثیت سے اگرچہ مکمل ہے لیکن اس پر

پوری دسترس حاصل کرنے کے بعد بھی اس کا استاد اوستائی زبان میں اپنی طرف سے کوئی نئی چیز لکھ نہیں سکتا۔ کیونکہ کسی زبان کو تحریری استعمال میں لانے کے لیے اس زبان کے تمام اجزاء، ارکان و الفاظ وغیرہ مع صرف ونحو کے مکمل ہونا ضروری ہے اور اوستا کی کتاب اوستائی زبان کی ان تمام ضروریات کو فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اور ہونا بھی ایسا ہے۔ کیونکہ یہ درس وتدریس وتعلیم یا گرامر کی کتاب تو ہے نہیں ۔۔ یہ تنہا کوئی اوستا کی کتاب کا نقص نہیں اور نا ہی اس کتاب کو کوئی نامکمل کہہ سکتا ہے۔ اگر دنیا میں کسی بھی زبان کی تاریخ وہی ہوتی جو اوستا کی ہے تو اس کا بھی یہی حال ہوتا مثلاً دنیا میں ایک مستند ترین کتاب قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر عربی زبان اوستائی زبان کی طرح ایک مردہ زبان ہوتی اور ساری دنیا میں اوستائی کی طرح اس کا ایک بھی بولنے والا باقی نہ ہوتا تو پھر قرآن پاک جو عربی زبان میں مکمل ترین کتاب ہے۔ اس کے بیشتر حصے خدانخواستہ ضائع ہوگئے ہوتے اور باقی بچے حصے اوستا ہی کی طرح رہ جاتے اور پھر تین چار ہزار سال کے بعد اس کا مطالعہ کرکے الفاظ کا حل نکالا جاتا تو اس کے نتیجے میں کوئی شخص عربی زبان کو اس مکمل صورت میں کبھی بھی جان نہیں سکتا کہ اس کو دوبارہ تحریری زبان کی طرح استعمال کیا جا سکے۔ بلکہ اس کی وہی حالت ہوتی جو آج اوستا اور اوستائی زبان کی ہے۔ البتہ اگر اوستائی زبان بولنے والی قوم میں سے صرف ایک خاندان بھی باقی ہوتا تو اس زبان کو تحریری زبان میں لانے کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔

کچھ کتب تاریخ وسیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ اوستا کا رسم الخط خود زردشت کا ایجاد کردہ ہے جو صرف مذہبی کتاب "اوستا" ہی کے لیے مخصوص تھا۔ اور یہ زردشتی مذہب کے لوگ اس رسم الخط کو مقدس سمجھ کر صرف مذہبی

کتاب کے لئے مخصوص کرتے تھے اور اس کو کسی دوسری غرض کے لئے استعمال کرنا
بددیانتی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسم الخط اوستا کے سوا کسی بھی دوسری
کتاب میں یا ضرورت کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔

کچھ دیر کے لئے ہم یہ بھی مان جائیں گے۔ مگر زبان اور رسم الخط دو مختلف
چیزیں ہیں۔ اگر مقدس سمجھ کر اوستائی رسم الخط کسی دوسری غرض سے استعمال
کرنا قدغن تھا۔ مگر جس زبان میں اوستا کی کتاب لکھی گئی ہے وہ زبان بنفسہ
تو کسی دوسرے رسم الخط میں لکھی ہوئی چیز ضرور ملنی چاہیئے۔ لیکن یہاں تو یہ حال
ہے کہ سرے سے یہ زبان ہی کسی دوسری جگہ نہیں مل رہی ہے۔

پہلوی اوستائی زبان کے متعلق اس تمہیدی معلومات کے بعد ہم ذرا
دوسری قدیم ترین زبان پہلوی کی طرف آتے ہیں جو اوستا کے
بعد بلوچی ہی کی طرح قدیم ترین زبان ہے۔ لیکن ایسے جان پڑتا ہے کہ جب پہلوی
زبان رائج تھی تو شاید اس وقت تک اوستائی زبان مردہ ہو چکی تھی جس کی وجہ
سے پہلوی بولنے والے اوستا کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ یا ممکن ہے پہلوی
زبان بولنے والے اس مذہب میں نئے داخل ہو کر اوستا کو سمجھنے کی خاطر اس کو
پہلوی میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس لئے پہلوی علماء نے اوستا کی مقدس کتاب کا
ترجمہ اور اس کی تفسیر پہلوی میں کی جو "زند اوستا" کے نام سے مشہور ہے۔

اب قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلوی ایسی زبانیں جو اوستا کے بعد بڑی اہمیت
رکھتی تھیں۔ کہ کتابِ مقدس اوستا کا ترجمہ اور تفسیر ان زبانوں میں کی گئیں لیکن
آج "پہلوی" بولنے والے بھی باقی نہ رہے۔ اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ بھی
اوستائی زبان والوں کی طرح اپنی یادگار اسی اوستا کے تراجم و تفاسیر کو چھوڑ
گئے۔

ویسے یہ بھی مشہور ہے کہ کچھ کتابیں "پہلوی" زبان میں لکھی ہوئی آج تک موجود ہیں جو اوستا (زند اوستا) سے علاوہ ہیں۔ ایک ایسی ہی چھوٹی سی کتاب مجھے بھی ملی ہے جس کا نام "یادگار بزرگ مہر" ہے اور خود بزرگ مہر سے منسوب ہے۔

یا پھر دوسری بات یہ ماننی پڑے گی کہ اوستائی زبان ایران زمین کے موجودہ علاقوں میں بولی ہی نہیں جاتی تھی اور زرد شت نے کسی دوسرے علاقے سے آکر اس سرزمین پر اپنے مذہب کا پرچار کیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت زردشت شمال مشرق ایران سے موجودہ سرزمین ایران کی سرحدوں کے اس پار موجودہ روس کے کزاختان، کیرغیزیا، تاجکستان، ازبکستان یا ترکمانستان میں کسی جگہ پیدا ہوئے ہوں اور پھر قبائلی اجتماعی ہجرت یا تبلیغی سلسلے میں انفرادی ہجرت کرکے ایران کے شمال مغرب کے علاقوں میں آگئے ہوں۔ اور زردشت کی زبان یہاں کے لوگ نہ سمجھتے ہوں جس کی بنا پر ان کو اس زبان پر دسترس حاصل نہ ہوا ہو اور اسی سبب سے ایران کے شاہنشاہ زردشتی ہوتے ہوئے بھی اس زبان کو سرکاری زبان کا درجہ نہ دے سکے ہوں۔ اور یہی اس کے نابود ہونے کا سبب ہو۔

مگر پہلوی زبان کی بات اور ہے۔ یہ تو ضرور یہاں کے شاہنشاہوں کی زبان ہونی چاہیئے تھی لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ پہلوی اور ایسی دوسری سب زبانیں آج کالعدم ہو گئی ہیں۔ ویسے کچھ علماء اوستا سے موجودہ فارسی تک سلسلہ یوں بتاتے ہیں کہ اوّل اوستا پھر پارسی باستان اور اس کے بعد پہلوی اور آخر میں فارسی۔

زند قبیلہ اگرچہ پہلوی میں اوستا کی تفسیر ہی کو "زند اوستا" کہتے

ہیں اور اسی "پہلوی" کو "زند" بھی کہتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں جس طرح "پہلوی" ایک قبیلے کا نام بھی ہے اور اسی طرح "زند" بھی ایک قبیلے کا علیحدہ نام ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ "زند" قبیلہ جو ایران میں رہتا ہے۔ اس کے افراد آج تک اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ایرانی آج تک بلوچستان کے مشہور سردار میر چاکر شیھک کو "چاکر خان زند" لکھتے ہیں۔ یعنی "رند" کے بجائے اس کو "زند" لکھتے ہیں۔ ایران میں رہنے والا قبیلہ "زند" بڑی مدت تک حکومت کا باغی رہا لیکن آخرکار رضا شاہ پہلوی نے اس کو تسلیم ہونے پر مجبور کرلیا۔

اس قبیلے کا مشہور سردار "کریم خان زند" تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس "زند" کو "پہلوی" شاہنشاہ نے زیر کرلیا۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ "اس قبیلے "زند" کو بلوچ قبیلہ "رند" سے کیا رشتہ ہے۔

ھخامنشی اب ہم زردشت کے زمانے یا اس کے بعد کے ایرانی شاہنشاہوں کے بارے میں کچھ باتیں کریں گے۔ ایران کی تاریخ میں مشہور شاہنشاہوں میں سب سے بڑا ھخامنشی شاہنشاہ کوروش بزرگ (کوروش کبیر یا کوروش اعظم) کا نام آتا ہے۔ یہ کسے معلوم نہیں کہ اسی شاہنشاہ یعنی کوروش نے ایران کی جس عظیم شاہنشاہیت کی بنیاد ڈال دی تھی وہ آج تک چلی آرہی ہے[1]۔ اگرچہ ھخامنشیوں سے دوسرے حکمراں خاندانوں میں شاہنشاہیت منتقل ہوتی رہی۔ مگر اس کے بانی مبانی وہی کوروش ھخامنشی ہے۔ اس کے بعد جس شاہنشاہ نے بڑا نام کیا وہ بھی اسی خاندان کا داریوش کبیر ہے۔

---
[1] کتاب کا مسودہ ایران میں اسلامی انقلاب سے قبل تیار ہوچکا تھا۔

کوروش کبیر نے جس شاہنشاہیت کی بنیاد رکھ دی ہے اسی شاہنشاہیت کو آج ڈھائی ہزار سال سے اوپر گذر چکا ہے ۔ جس کا جشن ابھی ابھی ایران میں کیا بلکہ پاکستان میں بھی منایا گیا تھا ۔ ان شاہنشاہوں کا ذکر کرنا اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ایرانی آثارِ قدیمہ میں جن کتبوں اور سنگ نبشتوں کے ذریعے ایران کی زبانوں کا کھوج لگایا جا رہا ہے وہ سب کے سب تقریباً ان ہی ھخامنشی شاہنشاہوں کی یادگار ہیں ۔ مثلاً ذیل میں ایک مشہور کتبہ ملاحظہ ہو، جو پانچویں صدی قبل مسیح کا لکھا ہوا ہے اور اکثر مورخین نے اس کا حوالہ دیا ہے ۔

ثشی خشایارشَ ، مَنَ ءَ پت ءَ وِشتاشتَ ، وشتاشپَ ھِی ءَپت ءَ اَرْشَمَ ، اَرْشَمَ ھِی ءَپت ءَ آرْیا ارْمَنَ ، آرْیا ارْمَنَ ھِی ءَپت ءَ چِس پِشَ ، چِس پِشَ ھِی ءَ پت ءَ ھخامنشَ ۔

اب اس کی بلوچی ملاحظہ ہو :۔

گشی خشایارش ءَ ، منی پت اَت وشتاسپ، وشتاسپ آئیءِ پت اَت اَرشم ، ارشم آئیءِ پت اَت آریا ارمن ، آریا ارمن آئیءِ پت اَت چس پشَ ، چس پش آئیءِ پت اَت ھخامنش ۔

ایک اور کتبہ کے چند جملے جو اس مضمون کے شروع میں نقل کئے گئے تھے اگر دوبارہ یہاں لکھیں تو زیادہ نہیں بلکہ تجدید ہوگی ۔ یہ کتبہ بھی داریوش بزرگ اور خشایارشاہ کی یادگاری کتبوں میں سے ہے ۔

بگَ وَزْرَک اَھورَمزدا ، ھیہ ایمام بومیم اَدا ، آوَم آسمانم اَدا ، ھیہ مرتیم اَدا ، ھیہ شیاتیم اَدا مرتہیا

بلوچیؔ :-

آھورا مزدا مزن بگ ، آ ئی ءَ اے زمین دات ، آ ئی ءَ آ آزمان دات ، آ ئی ءَ مردم دات ، آ ئی ءَ شاتی دات مردم ءَ -

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کتبوں کی زبان اوستا کے خاندان کی زبانوں میں سے کس زبان سے زیادہ ملتی جلتی ہے ۔جس کا ثبوت اوپر کے بلوچی ترجموں سے ظاہر ہے ۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود ھخامنشی شاہنشاہوں کی زبان کیا تھی ۔کیونکہ ان شاہنشاہوں نے ظاہر ہے کہ اپنی زبان میں کتبے لکھوائے ہوں گے ۔یعنی جس زبان میں یہ کتبے لکھے ہوئے ہیں وہی ان شاہنشاہوں کی زبان ہونی چاہیے ۔ فرض کرلیں کہ شاہنشاہوں کی اپنی زبان اوستائی یا پہلوی تھی تو یہ کتبے ضرور انہی زبانوں میں تحریر ہوتے ۔ لیکن یہ کتبے ان زبانوں میں نہیں ہیں ۔ اگر ہم سمجھیں کہ ھخامنشیوں کی اپنی زبان اس دور میں کوئی اور تھی جس کا نمونہ یہی کتبے ہیں تو یہ سوچنا پڑے گا کہ یہ کون سی زبان ہے ؟ اس کام کے لئے وہی ایک طریقہ کار اختیار کرنا پڑے گا ۔یعنی یہ دیکھنا ہے کہ ان کتبوں میں کس زبان کے الفاظ کی بہتات ہے اور اس کے جملے کس زبان کے مزاج کے مطابق ہیں ۔ تو بے چون و چرا ہم کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کے علاوہ ان جملوں کی ساخت بھی بلوچی جیسی ہے ۔ تو کیا ہم اس بات کو مان جائیں کہ یہ کتبے واقعی بلوچی زبان ہی میں ہیں ۔ اور یہی اس وقت بلوچی زبان کی شکل و صورت تھی جو تبدیل ہوتے ہوتے ہم تک پہنچ کر موجودہ مماثل شکل اختیار کر گئی ہے ۔

اس سلسلے میں ہمیں بلوچی زبان کی مختلف بولیوں کو زیر نظر رکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ بلوچستان کے طول و عرض میں بلوچی زبان کے مختلف لہجوں کی اگر جانچ پڑتال

کی جائے تو ایسی بولی اور ایسا ہی لہجہ بھی ہمیں ملے گا جو انہی کتبوں سے اور زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ بلوچی زبان کا یہ لہجہ موجود ہے اور ایرانی بلوچستان کے چند ایک علاقوں کے علاوہ ایران ہی کے کئی علاقوں میں موجود بلوچ قبائل میں مستعمل ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں مزید ریسرچ کے بعد مکمل گزارش کی ضرورت ہے۔

اب ہم ایک اور نکتۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر ھخامنشی شاہنشاہوں کی زبان کوئی اور تھی مگر انہوں نے کتبوں میں وہ زبان استعمال کی ہے جو ان کی اپنی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ تھی تو اس قسم کی مثالیں ہمیں دوسرے ادوار میں بھی ملتی ہیں اور ہمارا دور یعنی اس بیسویں صدی میں بھی ہمارے سامنے ہے کہ کئی ایک حکومتوں کی سرکاری زبانیں غیر اقوام کی ہیں۔ کیونکہ ان کی اپنی زبانیں اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ ان کی ضرورتیں پوری کرسکیں۔ تو پھر ماننا پڑے گا کہ ان کتبوں کی زبان اُس وقت کی تمام بولی جانے والی زبانوں سے ضرور زیادہ ترقی یافتہ اور مکمل ہوتی ہوگی۔ جس کو شاہنشاہوں نے اپنی زبان پر فوقیت دے کر کتبوں میں استعمال کیا۔!

یہاں ایک اور مسئلہ بھی حل طلب ہے کہ بالفرض اگر یہی کتبوں کی زبان ھخامنشیوں کی زبان ہی تھی اور شاہنشاہوں کی اپنی زبان بھی یہی تھی۔ پھر یہ شاہنشاہ نہ اوستائی تھے نہ پہلوی ــ بلکہ یہ ایران زمین میں رہنے والی کسی اور نسل، خاندان یا قبیلہ سے متعلق تھے۔ تو یہ شاہنشاہ کون تھے اور کس نسل و زبان سے اُن کا علاقہ (تعلق) تھا۔ اس امر کی وضاحت تو پہلے ہی کی جاچکی ہے کہ ایران آج ہی کی طرح عہدِ قدیم سے متعدد الاقوام اور متعدد الالسنہ ملت تھا اور ایسی متعدد اقوام اور متعدد زبان بولنے والی قومیت والے

ملک میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ کسی اقلیت کے فرقے کے ایک شخص نے ملک کی سربراہی حاصل کرلی ہو۔ جمہوری اور پارلیمانی دَور میں آج کے اصولوں کے مطابق پریذیڈنٹ، پرائم منسٹر اسی طرح آپ کو ملیں گے۔ مثلاً مملکت متحدہ برطانیہ میں اکثر و بیشتر وزیر اعظم سکاٹ لینڈ سے متعلق تھے۔ پاکستان ہی کو لیجئے جس کا پہلا گورنر جنرل اقلیتی فرقہ اسماعیلیہ کمیونٹی سے متعلق تھا۔ اور حتیٰ کہ وہ اپنی مادری زبان سے بھی قطعی ناواقف تھا۔

اس ہمارے دَور میں تو تعلیم اور سیاسی قابلیت کے پیشِ نظر ایسا ہوتا ہے مگر پرانے زمانے میں جتّہ بندی، اور طاقت کے بل بوتے پر حکومتیں چھین لی جاتی تھیں ایران میں بھی شاہنشاہیت چھیننے کے ایسے واقعات عام تھے۔ نادر شاہ کون تھا اور اس نے کس طرح ایران کی بادشاہت حاصل کرلی۔ دور کیوں جایئے۔ ایران کے موجودہ شاہنشاہ محمد رضا پہلوی اپنے خاندان کے صرف دوسرے شاہنشاہ ہیں۔ کیونکہ شاہ محمد رضا پہلوی کے باپ رضا شاہ پہلوی نے ۲۵ — ۱۹۲۴ء میں قاجاری شاہنشاہ احمد شاہ قاجار کو معزول کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت شاید دنیا کے کم عمر ترین شاہی خاندان یہی ہے۔ یعنی اس خاندان کو حکومت کرتے ابھی پچاس سال ہی گزرے ہیں —

اس نظریہ یا حقیقت واقعی سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ھخامنشی شاہنشاہوں نے بھی کچھ ایسی ہی حکمت عملی پر چل کر ایران کی شاہنشاہیت پر قبضہ جمالیا ہوگا۔ ھخامنشی شاہنشاہوں کا خاندان ایران کی ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا تھا جو نہایت جری، دلیر اور لڑنے والی قوم تھی علاوہ ازیں ان کی تعداد بھی ایران میں رہنے والی کسی دوسری قوم سے

کسی طرح کم نہ تھی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس قوم کی اکثریت دیہاتوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں زندگی گزارتی تھی۔ شہریوں کے بہ نسبت دیہاتی اور صحرا نشین لوگ ویسے بھی زیادہ دلیر اور لڑاکا ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ خصوصیت آج بھی باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی فوج میں اکثر و بیشتر پہاڑی اور دیہاتی لوگ ہیں۔ اُن زمانوں میں تو اور بھی زیادہ دلیر اور لڑاکا فوجیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ایران کے اُس دور کی حکومتیں بھی اس نظریہ پر عمل کر کے فوج میں صحرا نشین اور دیہاتی لوگوں کو بھرتی کیا کرتی تھیں جن میں سب سے زیادہ پس ماندہ قوم کے افراد کو اوّلیت دی جاتی تھی۔

یہ امر بھی غیر قابلِ انکار ہے کہ ان دیہاتی یا پہاڑی اقوام کے افراد میں کچھ ایسے بھی لوگ ہوں گے جو اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اعلیٰ فوجی رتبوں پر فائز ہو چکے ہوں اور بعد میں اپنی طاقت بڑھا کر فوج میں منظم پروگرام بنا کر ملک کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا ہو۔

بلوچ قبائل اس کے پیشِ نظر اب ہم بلوچ قوم کے بارے میں کچھ حقائق بیان کرتے ہیں جو شاید ہمارے ممد و معاون ثابت ہوں۔

آریائی اقوام کی دوسری بڑی ہجرت میں بلوچ قوم کا سب سے بڑا فرقہ کیسپین ہی کے گرد و نواح میں آکر آباد ہو گیا جو شمالی ایران میں ہے۔ جبکہ سب سے پہلی ہجرت میں اس قوم کا ایک گروہ جنوب کی طرف سیستان پہنچ گیا، جہاں ماقبل تاریخ سے بلوچ قوم ہی کی ایک حکومت یا سرداری قائم تھی۔

ماقبل تاریخ سے اس قوم کے یہی دو مسکن یا مرز بوم مشہور ہیں جس کے

ثبوت میں تاریخی شواھد موجود ہیں۔

اگرچہ سیستان میں اس قوم کی ایک اچھی خاصی سرداری یا حکمرانی پہلے ہی سے قائم تھی۔ مگر کسپین سی کے گرد و نواح میں یہ قوم ایران کی باقی اقوام سے اس لئے پس ماندہ تھی کہ یہ قوم اکثر صحرا اور پہاڑوں میں آزادی سے رہنا پسند کرتی تھی۔

یہ قوم ہمیشہ دیہاتوں بلکہ پہاڑوں صحراؤں اور جنگلوں میں آزاد زندگی بسر کرنے کی عادی تھی۔

اس قوم کے لوگ انتہائی نڈر، لڑاکا اور دلیر تھے۔

آزاد منش اور خودسری ان کی فطرت میں تھی۔

شہری زندگی اور اس کے گیرو دار سے یہ قوم حتی الامکان دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایران کی تاریخ میں ہر ایک شاہنشاہ کی فوج میں دلیری اور بہادری کی وجہ سے یہ قوم ہمیشہ بھاری اکثریت سے بھرتی کی جاتی تھی۔

ایران کی ہر شاہنشاہیت اس قوم کی خودسری اور آزاد منش رویہ سے ہمیشہ نالاں تھی وغیرہ وغیرہ۔

ایرانی شاہنشاہوں کی مسلح افواج میں بلوچوں کو صرف اس غرض سے بھرتی کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ خطرناک حد تک لڑاکو تھے اور ان کو بہت بڑی تعداد میں بھرتی کیا جاتا تھا۔ خود بلوچ قوم بھی فوج کے سوا کسی دوسری پابند نوکری کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ اس کی مثال آج تک ہمارے سامنے ہے۔ آج بھی بلوچ قوم کے ہزاروں افراد دوسری حکومتوں کی مسلح افواج میں جنود مرتزقہ (MERCENARIES)*

کی طرح کام کر رہے ہیں ۔

شاہنامہ اور بلوچ

فردوسی نے اپنے شاہنامے میں بلوچ قوم کی مردانگی اور شجاعت کی بے انتہا تعریف کی ہے اور کیخسرو کی افواج میں ان کے ہونے کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے ۔ اسی طرح فردوسی نے دوسری جگہ بلوچوں اور گیلانیوں کے متحد ہو کر نوشیرواں سے لڑائی کرنے کا بھی ذکر کیا ہے ۔ فردوسی ہی کا حوالہ دیتے ہوئے سپہبد امان اللہ جہانبانی اپنی تصنیف " سرگزشت بلوچستان و مرزہای آن " میں زیر عنوان " قدیم ترین اطلاعات تاریخی بلوچستان " صفحہ ۵۸ میں لکھتے ہیں ۔

" غیر از مورخین یونانی کہ با نظر سطحی اوضاع این سرزمین را شرح دادہ اند فردوسی نیز در شاہنامۂ خود اشارہ بقوم بلوچ کردہ و مردان آن قوم را در لشکریان کیخسرو بشجاعت و مردانگی ستودہ و ہم چنین در جای دیگر اتحاد و اتفاق بلوچہا را با اقوام گیلانی و جنگ آنان با نوشیروان برشتۂ نظم در آوردہ است می گوید ۔ "

سپاہی ز گرد ان کوچ و بلوچ — سگالیدۂ جنگ مانند قوچ

کہ کس در جہاں پشت ایشاں ندید — برہنہ یک انگشت ایشاں ندید

درفشی بر آورد ہ پیکر پلنگ — ھمی از درفشش بیازید جنگ

پھر لکھتے ہیں :-

" راجع بہ نژاد اقوام بلوچ آنچہ مسلّم است از نژاد

آرین هستند وی بقول مورخین ایرانی ابتدا در کرانہ
ھای دریای خزر (کیسپین سی) اقامت داشتہ اند"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ قوم کو ایرانی تاریخ میں تمام پرانے شاہنشاہوں کی فوجی طاقت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی جس کی حقیقت سے خود ایرانی جو بلوچوں کے بدترین دشمن ثابت ہوئے ہیں منہ نہیں موڑتے۔

آگے چل کر بلوچوں کی مہاجرت کے بارے میں آقائی جہانبانی لکھتے ہیں :-

"بنا بنظرِ ہماں مورخین طوایف بلوچ بہ تدریج ازراہِ کرمان
و سیستان بمکران و قسمتاری دیگر مہاجرت کردہ۔"

سیستان

البتہ سیستان کے بارے میں ہماری رائے مختلف ہے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ سیستان میں بلوچ قوم اپنی آریائی مرزبوم سے پہلی ہجرت سے بھی پہلے سے آباد تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت بلوچ نژاد رستم ہے۔ جس کی تسلیم شدہ بہادری اور شجاعت اور طاقت سے کوئی ایرانی شاہنشاہ کبھی بھی بے نیاز نہیں رہا۔

ویسے بھی سیستان عہدِ قدیم سے ایک مشہور تاریخی ملک رہا ہے۔ اس سلسلے میں فردوسی کے شاہنامہ کا ہر داستان اسی سیستان کے حاکم یا سردار یا فرماں روا رستم کا مرہونِ منت ہے۔ درحقیقت اگر رستم اور سیستان کا نام شاہنامہ فردوسی سے خارج کیا جائے تو سارا شاہنامہ ایک کھوکھلی اور ڈھکوسلی چیز باقی رہ جائے گا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ فردوسی نے رستم کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کس طرح تعصّب

کی بنا پر اس کو حتی الامکان محض ایک روزسند پہلوان دکھایا اور اس کے کارناموں
کو حتی الامکان میدانِ جنگ تک محدود رکھا۔

ایران زمین کے سب سے پرانے مذہب زرتشتی کی مقدس کتاب اوستا میں
ان تمام شہر، قصبوں، نہر، دریاچہ اور پہاڑوں وغیروں کے نام تفصیل سے
مذکور ہیں۔ جو اُس وقت کے وسیع وعریض سیستانی حکومت کے علاقوں
میں شامل تھے۔ مثلاً اوستا کے "ابان یشت" کے "کردۂ دھم" کے فقرہ ۳۷
ہے۔ "گرشاشب پہلوان و دلیر در کرانہ دریاچۂ "پیشینگہ" صد اسب و
ہزار گاؤ و دہ ہزار گوسفند پیش کش" اناھیتا کرد"

دوسری جگہ "آبان یشت" "کردۂ بیست و پنجم فقرہ ۱۰۸ یوں ہے۔
"کی گشتاشپ بلند ہمت در برابر آب "فرزداں" صد اسب و
ہزار گوسفند پیش کش اناھیتا کرد۔"
اس فقرے میں "فرزداں" بھی سیستان کے ایک دریاچہ کا نام
ہے۔
پھر "زامیاد یشت" "کردۂ نہم کے فقرہ ۶۶ اور ۶۷ میں دیکھئے۔
"فرتی کہ از آنِ کسی است کہ شہریاری وی از آنجا ی کہ
زود "ھیرمند" دریاچہ "کیانسی" را پدید میآورد، برخاستہ
است، آنجا کہ کوہ "اوشیدم" جای دارد و از گرداگرد
آن آب بسیار از کوھسار ازیر میشود [وردوہای]"
"......... خواسترا، ھوسپا و فردثا و خوارنگھیتی
زیبا، اوشتوئیتی توانا و اور وذا دارندۂ چراگاہ ھای

بسیار وارزی و زر تومیتی و هیبرمند باشکوہ و فرهمند کہ خیز
آبہای سپید برانگیزد و سرکشی کند [بہ هُوی دریاچہ "کیانسی"]
روان میشود و بدان فرو میریزند"۔

ان دونوں فقروں میں جتنے دریاچہ، پہاڑ یا ندیوں کے نام آئے
ہیں وہ سب سیستان ہی کے علاقے کے ہیں۔ اگرچہ چند ہزار سال قبل مسیح
والے نام اب باقی نہیں آرہے ہیں مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ "ھیبرمند" کا
پرانا نام ابھی تک باقی اور مشہورِ عالم ہے۔

مزید برآں اوستا میں یہ بھی مذکور ہے کہ آریاؤں نے کس طرح ان
علاقوں میں آکر یہاں بسنے اور رہنے کا انتظام کیا۔ ظاہر ہے کہ یا تو وہ ان
علاقے کے لوگوں کے ساتھ صلح و آشتی کی بنیادوں پر متفق ہو کر یہاں آباد
ہوئے اور نہیں تو پھر لڑ بھڑ کر ان جگہوں کو ہتھیا لیا۔ کسی بھی صورت میں ہم
کہہ سکتے ہیں کہ "آرین ویج" سے پہلی ہجرت جو شاید پہلے جنوب اور پھر مشرق کی
جانب کی گئی اس میں بلوچ قبیلے بھی شامل تھے۔ باقی قبائل نے اپنی ملک
گیری اور پھر آگے بڑھنے کا کام جاری رکھا ہوگا مگر بلوچوں کو شاید سیستان
کا علاقہ یا آب و ہوا یا اس کے باشندے پسند آئے یا ممکن ہے کہ وہ اپنے
اصلی مسکن سے بہت دور رہنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اور یہاں باقاعدہ
طور پر آباد ہو کر اپنی مملکت کی بنا ڈالی ہو۔ اور پھر دوسری اس سے بھی بڑی
ہجرت میں وہ باقی اقوام و قبائل کے ساتھ مغرب کی طرف بحر قزوین کے
کناروں پر "البانے، مازندران، البرز اور گیلان" کے علاقوں میں آباد
ہو گئے۔

اکثر مورخین بلوچوں کے سیستان کی آمد کو بعد کی چیز بتاتے ہیں۔

اور کہتے ہیں کہ جب بلوچ قوم نوشیروان کے ظلم وستم سے پریشان ہوکر شمال ایران سے ہجرت کرنے لگے تو پہلے وہ کرمان آئے اور پھر سیستان اور پھر سندھ و پنجاب تک پہنچ گئے۔ کچھ اور یہ کہتے ہیں کہ دریای مازندراں سے ہجرت کرکے دو راستوں میں کرمان اور سیستان کی طرف روانہ ہو گئے دریای خزر یا مازندراں (کسپین سی) سے مستقیماً مشرق یا جنوب مشرق کی جانب دشت لوط یا نمکزار کا ناقابل عبور علاقہ پڑتا ہے اس راستے سے مستقیماً سیستان کی طرف ہجرت کرنا تو آج بھی خودکشی کے مترادف ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نوشیروان کے ظلم و تعدی سے بیزار ہوکر بلوچ قبائل کرمان آگئے اور پھر کرمان ہی سے کچھ قبائل سیستان چلے گئے۔ لیکن یہ بات قطعی غلط ہے کہ اس سے پہلے سیستان میں کوئی بلوچ نہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نوشیروان کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے بلوچ اسی سیستان میں آباد تھے۔ ہم اگر صرف شاہنامہ کے رستم سیستان کے بارے میں تحقیقات کریں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خود زردشت کی بعثت سے سینکڑوں سال پہلے سیستان ایک خود مختار بلوچ مملکت تھا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کے لئے مزید تحقیق درکار ہے۔ اس لئے ہم دوبارہ اپنے موضوع سخن کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

تو جن جن بلوچوں کو اُن ایرانی شاہنشاہوں کی افواج میں نوکری مل گئی وہ شہری زندگی اور اس کی ہر چیز سے مانوس ہوتے گئے اور پھر ان میں قابل اور لائق فوجی افسر بھی پیدا ہوئے جن کو کافی اعلیٰ عہدے ملتے گئے جس کی وجہ سے اُن میں یہ طاقت پیدا ہوگئی اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ان کے کسی قابل جرنیل کی سرکردگی میں بغاوت ہوگئی اور شاہنشاہ کو معزول کرکے وہی جرنیل تخت پر قابض ہوگیا اور اپنے شاہی خاندان کا نام

اپنے دادا ھخامنش کے نام ھخامنشی رکھدیا جو آئندہ چل کر ان کے شاہنشاہی گھرانے کا نام بن گیا اور اس نئے گھرانے کی حکومت کا عہد ایران کی تاریخ کا زرّیں عہد کہلاتا ہے۔

کوروش وداریوش

اس ھخامنشی گھرانے کی شاہنشاہیت کا بنیان گزار اور عظیم ترین شاہنشاہ "کوروش" کے نام سے کون واقف نہیں ــ اس کے زمانے میں ایرانی شاہنشاہیت کی سرحدیں مشرق میں دریائے سندھ، مغرب میں یونان سے پرے، شمال میں روس اور مشرقی یورپ کو لپیٹ میں لے کر، جنوب میں تمام ساحلی علاقوں کے علاوہ افریقہ میں سرزمین مصر کو بھی آغوش میں لے چکی تھیں۔ اور پھر داریوش نے ان حدود کو اور بڑھا دیا تھا۔

اب کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی کوروش کبیر خود دراصل اسی جنگجو اور بہادر قوم بلوچ کا ایک فرد تھا جس نے موقع پا کر مذکورالصدر طریقہ کار پر عمل کر کے ایران کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں نہ صرف قوی امکان ہے بلکہ حقایق اس کی پوری طرح تصدیق کرنے میں ہمارے ساتھ ہیں اس لئے ہم یہی سمجھتے ہیں ھخامنشی خاندان کے سارے شاہنشاہ بلوچ تھے کیونکہ ایرانی شاہنشاہیتوں میں فوج کی بھاری اکثریت بلوچ قوم کے افراد پر مشتمل تھی اور اسی قوم کے اعلیٰ افسروں نے بالآخر کوروش جیسے بہادر دانشمند اور مدّبر کمانڈر کے زیرِ فرمان اور زیرِ قیادت ایرانی تخت پر قبضہ کر ہی لیا۔ جیسے کہ عیاں ہے ایران میں اپنے نام کے ساتھ اپنی قومیت لکھنے کا نہ تب رواج تھا اور نہ اب ہے۔ البتہ اپنے قبیلہ یا خاندانی نام ضرور لکھتے آرہے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوروش کبیر بلوچ تھا اور ھخامنشی قبیلہ یا خاندان

بلوچ قوم سے متعلق تھا تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ھخا منشی شاہنشاہوں کی یادگاری تمام کتبے ان کی اپنی زبان یعنی بلوچی میں ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں بلوچی زبان کی صورت ہی یہی تھی جو بعد میں ترقی کرتے کرتے آج کی موجودہ شکل اختیار کر گئی ہے۔

اگر ھخا منشی، بلوچ شاہنشاہوں نے اپنے تمام یادگاری کتبے اپنی ہی زبان، بلوچی میں لکھوائے تھے تو اس وقت کی سرکاری زبان بھی یہی ہو گی مگر اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ بلوچ قوم شہروں میں کم اور دیہاتوں میں زیادہ تعداد میں رہتی تھی۔ اور ھخا منشی بلوچوں نے شاہنشاہی افواج کی طاقت کے بل بوتے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا تھا اور شہری لوگ تو وہی تھے جو پہلے وہاں وہ رہے تھے جو ظاہر ہے کہ غیر بلوچ اقوام پر مشتمل تھے اگر ھخا منشی تاجداروں سے قبل یا قبضہ کے بعد کچھ مزید بلوچ خاندان شہروں میں آکر آباد ہو گئے تو بھی دوسری تمام مختلف اقوام کے مقابلے میں اقلیت میں رہے۔ اس لئے شاہنشاہ کتنا بھی طاقت ور ہوتا اس وقت کے حالات کے مطابق وہ اپنی زبان زبردستی ملک پر تھوپ نہیں سکتا۔ خصوصاً ایک زبان کے عام کرنے کے لئے جن ذرائع کی ضرورت تھی وہ موجود ہی نہ تھے اس وقت نہ اسکول تھے نہ مکتب اور نہ جرائد اور مجلّات ــ باقی رہی درباری زبان ــ اگر اس وقت کی درباری زبان بلوچی رہی ہو گی تو اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ ہر شخص لازمی طور پر بادشاہِ وقت کی زبان کو جاننا، اس میں بات کرنا یا لکھنا فخر سمجھتا ہو گا۔

ایک خصوصیت اس قوم بلوچ میں یہ بھی ہے کہ وہ جہاں بھی کہیں جا کر کسی ملک پر قبضہ کر کے حاکم بن جاتی تو بجائے اس کے کہ اپنی زبان ان

محکوم اقوام کے سر زبردستی تھوپ دے اس کے برخلاف انہی محکوم اقوام کی زبان اپنا کر ان میں مزنح ہو جاتی تھی ۔ اس کا بین ثبوت آج بھی ہمارے سامنے سندھ کے بلوچ حکمرانوں کی محکوم سندھ کی سندھی زبان کے ساتھ سلوک سے واضح ہے ۔ یہاں کے سابق بلوچ حکمراں خاندان نے اسی طریق پر عمل کرکے اپنی بلوچی زبان تک کو چھوڑ کر خود بھی سندھی زبان کو اپنایا اور آج ان کی ساری بھاری آبادی بلوچی زبان سے ناآشنا ہے ۔ اسی قسم کی دوسری مثال ملتان میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں کی بلوچ آبادی آج سرائیکی زبان بولتی ہے اور اس سے زیادہ بین ثبوت پنجاب میں ہے ۔

اسی طرح وہ بلوچ قوم جو پندرھویں[۱۵] صدی میں فاتحانہ انداز میں ہندوستان کی سرحدیں پار کر گئی اور بعد میں مراعات یافتہ کئی ایک بڑے قبیلے کے خاندان بمعہ ان کے سردار میر چاکر کے پنجاب میں سکونت اختیار کر گئے ۔ یہاں بھی اس غیور قوم نے تعصب کو پاس پھٹکنے نہ دیا اور خوشی خوشی سرزمین پنجاب کی زبان کو اپنی زبان سمجھ کر اپنا لیا ۔ چنانچہ آج پنجاب میں کوئی پچاس[۵۰] لاکھ بلوچ آباد ہیں ۔ اور کوئی ایک درجن سے زائد منتخب شدہ بلوچ پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں ۔ لیکن آپ کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً تقریباً یہ تمام بلوچ آبادی پنجابی اور سرائیکی زبانیں بولتی ہے ۔ جو بلوچ قوم کے متعصب نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔

بلوچ قوم کا خاصہ ہے کہ وہ کسی قوم کا پیدائشی حق، چاہے محکوم قوم ہی کیوں نہ ہو، کبھی نہیں چھینتی ۔ اور یہی وجہ ہے کہ خود بلوچ ایسے کرنے والی قوم کو کبھی نہیں بخشتی ۔ اگر کوئی اس کا حق چھیننے کی کوشش کرے تو ممکن ہے کہ مجبوری کی بنا پر وہ وقتی طور پر خاموش رہے لیکن وہ اپنے اوپر ظلم کرنے

کو قیامت تک نہیں بخشتی بلکہ ہمیشہ اس سے بدلہ لینے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتی ہے۔ بلوچی ضرب المثل مشہور ہے ؎

بیر بلوچانی داں دوسد سال ءَ ستھیں آھوگے دو دنتانیٔ

اس کا لفظی ترجمہ یوں ہے کہ:۔

بلوچ کا ثار (انتقام) دوسو سال تک ویسے ہی جوان ہے جس طرح دو دانت والا جوان ہرن۔ مطلب یہ کہ بلوچ کے انتقام کی عمر کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ سدا بہار اور ہمیشہ جوان ہے۔ یعنی انتقام کی آگ قیامت تک ٹھنڈی ہونے کا نام نہیں لیتی۔

یا پھر ایسے بھی کہ جس وقت ھخا منشی بلوچ تخت پر قابض ہو گئے تو اس وقت جو زبان رائج تھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا مگر اپنے یادگاری کتبے اپنی ہی زبان میں لکھوائے۔ ویسے تو کچھ علماء نے ان نوشتوں اور کتبوں کو "فارسی باستان" منوانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اگرچہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے لیکن ہم اس سلسلہ میں ایک بات ضرور کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ یہ نام خود ساختہ ہے۔ کیونکہ "پارسی" لفظ دراصل زردشتی مذہب کے ماننے والوں کے لئے مستعمل ہوا ہے جو اصل میں "پارسا" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "مومن" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زردشتی مذہب کو وہ خود "دینِ پارسان" کہتے ہیں۔ یعنی "مومنوں کا دین" زردشت کے بعد لوگوں کی زبان باقی ہم عصر زبانوں میں خلط ملط ہو کر ایک نئی شکل اختیار کرنے لگی۔ لیکن کچھ لوگوں نے خصوصاً زردشتی علماء نے اپنی زبان کو ان آلائش سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے اور آخر کار اوستائی زبان میں تبدیلی واقع ہو گئی۔ ورنہ دراصل یہی زبان

جس کو "فارسی باستان" کہتے ہیں اسی اوستائی زبان سے مستقیماً مشتق ہے۔ اور اس زبان کو اس وقت کے لوگ "زبان پارسایان" کہتے تھے۔ کیونکہ ایران میں اور متعدد اقوام بھی بستے تھے اور ان زردشتیوں کی زبان میں اپنے مذہب کی وجہ سے ایک خاص موڑ ایک لچک پیدا ہوگئی تھی۔ بعد میں یہی نام "پارسائی زبان" اور آخر میں "زبانِ پارسی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اگرچہ یہ فارمولا کسی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت صرف ثانوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زبان کا نام ہی کچھ اور ضرور ہوگا جو "اوستا" ہی کی طرح دشمن عناصر کی بداعمالیوں کے طوفان کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اور بالآخر اس کا نام بھی اوستائی زبان ہی کی طرح عالمِ لاعلمیت میں گم ہوگیا۔ ازمنۂ قدیمہ میں ایسی کئی جابر قومیں گزری ہیں جنھوں نے اپنی فتوحات کے گھمنڈ میں یا تعصب یا بدطینتی کی وجہ سے ہر مفتوح یا کمزور قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹانا اپنا فرض سمجھا۔ ایسی جابر و ظالم اقوام نے کئی ایک ترقی یافتہ قوموں کو ان کے نام اور ان کی تاریخ سمیت کالعدم کر دیا۔ لیکن کئی ایک ایسی مظلوم اقوام کے آثار باقیہ نے ان کی ہستی اور وجود کا ثبوت دوبارہ فراہم کر دیا۔ مگر ہر ایسی قوم کے متعلق معلومات ہمیشہ نامکمل اور محدود ہوا کرتی ہیں۔ اور کبھی ایک دفعہ ایک قوم دو ناموں یا دو قوم ایک نام سے یاد کی جاتی رہیں۔ اور اسی طرح زبان اور دوسری چیزوں کے متعلق ایسی ہی غلطیاں یا غلط فہمیاں سرزد ہو جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ آثار باقیہ ہی کے ذریعہ تحقیقات کرنے میں کتنی بار محققین کے نظریہ "اوستا" کے متعلق تبدیل ہوتے رہے۔ ٹھیک اسی طرح بلوچی زبان اور بلوچ قوم سے متعلق بھی یہی ہوتا رہا۔ اور ہمارے موجودہ موردِ بحث "فارسی باستان" بھی انہی ظلم و ستم اور غلطی اور غلط فہمی کا

شکار ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی "فارسی باستان" کوئی نام نہیں ہے لیکن لاعلمی اور تعصّب نے مل کر اس کو یہ عجیب و غریب نام دے دیا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ظلم و تعدی سے "سانسکریت" زبان کو کئی سو یا ہزار سال گمنامی میں رکھنے کے بعد اُس کو "پُرانی ہندی" کے نام سے روشناس کرائی جائے ۔ اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ "فارسی باستان" از خود کوئی ایک حقیقت ہے ۔ لیکن کسی دوسری زبان کو "فارسی باستان" کا نام دینا تو سراسر ظلم و زیادتی ہے ۔ کیونکہ "فارسی باستان" تو اُس فارسی کو کہتے ہیں کہ جس میں عربی کے الفاظ مستعمل نہ ہوں ۔ آج بھی اگر ماڈرن فارسی سے عربی کے الفاظ نکال دیتے جائیں تو یہ خالص فارسی یا فارسی باستان بن جائے ۔

فارسی باستان

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بات پر تمام محققین متفق ہیں کہ " اوستا " کے بعد بلوچی اور پہلوی زبانیں سب سے قدیم ہیں ۔ مگر جب انہیں ھخامنشی بلوچ شاہنشاھوں کے یادگاری کتبوں کی تحریریں ملتی ہیں تو صرف پہلوی اور فارسی زبان اُن میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ گویا وہ زبردستی ان تحریروں کو پہلوی یا فارسی منوانے کی سعی کرتے ہیں ۔ اور جب وہ اس سلسلے میں ناکام ہو جاتے ہیں ، تو فوراً ایک نیا نام "خود ساختہ" کر کے ان کتبوں کو اس سے منسوب کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ یہ " فارسی باستان " — (پرانی فارسی) زبان میں لکھی ہوئی ہیں ۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ کسی محقق نے کبھی اس طرف توجہ نہ دی کہ ایک اور زبان بھی اسی آریائی یا اوستائی زبانوں کی ردیف میں موجود ہے جس کی اغلب صفات اسی نام نہاد —

"فارسی باستان" میں موجود ہیں۔ نہ جانے اس کا نام "فارسی باستان" کیوں رکھا گیا جبکہ اس کی عبارت اور اس کی بندش اور ترکیبیں "فارسی" سے مختلف ہیں اور موجودہ بلوچی زبان سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ یہی نام نہاد "فارسی باستان" دراصل وہی "بلوچی" ہے مگر لاعلمی اور پھر تعصّب اس حقیقت پر ہمیشہ دغل کا پردہ ڈالتا رہا۔ اس لئے ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سنگ نبشتے اور کتبے جو ھخامنشی بلوچ شاہنشاہوں کی یادگاریں ہیں جو تمام کے تمام انہی کے ھخامنشی بلوچ شاہنشاہوں کی اپنی زبان یعنی "بلوچی زبان" میں لکھی ہوئی ہیں اور یہی بلوچی زبان کی قدیم ترین تحریریں ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ دو ڈھائی ہزار سال قبل کی لکھی ہوئی یہ تحریریں آج کی "بلوچی زبان" کے ساتھ حیرت انگیز حد تک مقاربت رکھتی ہیں۔ باقی رہا نام "فارسی باستان"۔ تو حقیقت میں یہ ایک "نام نہاد" نام ہے۔ البتہ ہم یہ ماننے کو تیار ہیں کہ "پُرانی فارسی زبان" کو "فارسی باستان" کہا جائے۔ لیکن اس کی مثال میں ان ھخامنشی بلوچ شاہنشاہوں کی تحریروں کو پیش کرنا زیادتی ہوگی۔ ویسے ہر ایک زبان کی پُرانی تحریر جدید تحریر سے مختلف ہے۔ لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ موجودہ تحریر اس قدر مختلف ہو کہ اس کو آپ قطعی طور پر پڑھ نہ سکیں۔ اگر ایک زبان کئی صدیوں کے بعد ایک ایسی شکل و صورت اختیار کر جائے کہ اصل ماخذ یا زبان سے نمایاں طور پر علیحدہ نظر آئے یا اس کے سمجھنے میں دشواری پیش آ جائے تو اس زبان کو ضرور کوئی نیا نام مل جائے گا۔ وگرنہ اس میں معمولی تبدیلیاں آ جائیں تو اس کو "پُرانی" اور "نئی" کی اصطلاح سے فرق کرنا پڑے گا۔ البتہ ہم اس حقیقت کو ضرور مانیں گے کہ فارسی جدید میں عربی کلمات کی بہتات ہے۔ اور "درمیانی فارسی" میں عربی الفاظ نہیں ہیں یعنی

خالص فارسی ہے جبکہ "فارسی باستان" (پُرانی فارسی) میں خالص فارسی کے علاوہ کچھ پہلوی، بلوچی اور اوستائی الفاظ بھی شامل ہوں۔ اس لئے ہم دوبارہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ "اوستا" کے بعد "بلوچی" ہی قدیم ترین زبان ہے اور یہ کہ ھخامنشی تمام شاہنشاہ کوروش کبیر سے لے کر داریوش سوم تک بلوچ ہی تھے اور انہوں نے جتنے بھی سنگ نوشتے اور کتنے یادگار چھوڑے ہیں سب کے سب پرانی بلوچی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور بلوچی زبان کے لئے مدلل ثبوت فراہم کرنے کو بالکل کافی ہیں۔ ہمیں نہایت خوشی ہے کہ ہم نے پہلی مرتبہ اس امر کا انکشاف کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہر محقق ہم سے اتفاق کرے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ بلوچ دشمنی اور تعصب کا نقاب اتار کر پھینک دے۔

جب تک ھخامنشی بلوچ شاہنشاہ ایرانی تخت و تاج پر حکمران رہے۔ ان کی قوم یعنی بلوچ قوم پر کسی نے زیادتی کرنے کی جرأت نہیں کی۔ حالانکہ یہی ھخامنشی بلوچ تاجدار اور دیگر ذمہ دار شخصیتیں اور افسران اعلیٰ، ایران کی باقی اقوام میں اسقدر ضم و مدغم ہوگئے کہ ان کا علاقہ اپنی قوم سے بھی منقطع ہوگیا ہوگا۔ مگر کسی متعدد الاقوام ملت اور حکومت میں جب تک اس میں شامل اقوام کو اس کے صحیح اور جائز حقوق نہیں ملتے وہ مطمئن نہیں ہوں گی۔ اور ہمیشہ حکومت کے لئے پریشانی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب ھخامنشی بلوچ شاہنشاہیت کے خاندان کی ۲۲۹ سالہ حکمرانی کا انقراض سکندر مقدونی کے ہاتھوں ۳۳۰ قبل مسیح میں عمل میں آیا جبکہ ھخامنشی بلوچ خاندان کا آخری شاہنشاہ داریوش سوّم سکندر مقدونی کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ واقعہ سکندر کے اسی یلغار کے دوران ہوا جبکہ وہ ہندوستان فتح کرنے کے لئے جارہا تھا۔

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ تقریباً ہر ایک مستند مورخ اور بالخصوص

ایرانی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ داریوش سوم کی شکست کی سب سے بڑی وجہ خود ایرانی قوم کی دھوکہ بازی تھی کیونکہ وہ تمام خاندان جو اپنے آپ کو ایرانی تخت و تاج کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے ھخامنشی بلوچ تاجداروں کے خلاف در پردہ ہمیشہ ان کی تباہی کا پروگرام بناتے رہتے تھے اور سکندر جیسی جنگجو شخصیت نے ان سے برابر کام لیا۔

ھخامنشی حکمرانوں کے انقراض کے بعد جب دوسری قوم، قبیلے یا خاندانوں کی نسلیں حکمران خاندان بن گئیں تو ان شاہنشاہوں نے بلوچ قوم پر انتظام کے نام پر انتقاماً دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور اس خودسر اور آزاد منش قوم کو اس کی فطرت کے خلاف رام کرنے کی کوشش شروع کی۔ مگر بلوچ قوم اس کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھی۔

یہ پہاڑی اور صحرانشین قوم "ہمیں کچھ نہ دو ہم سے کچھ نہ لو" کے نظریہ پر رہنا چاہتی تھی۔ جو ان غیر بلوچ ایرانی شاہنشاہوں کی مرضی کے خلاف تھا۔ کیونکہ اس طرح حکومت بلوچوں کے علاقے اور اس کے کسی دوسرے معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لئے بلوچ قوم پر دوبارہ آہستہ آہستہ دباؤ ڈالنے اور اس کو تسلیم کروانے کے پروگرام پر عمل کرنا شروع کر دیا گیا۔ اور بلوچوں کو اس امر پر مجبور کیا جانے لگا کہ وہ ایرانی حکومت کے قوانین کو مان کر اس کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔ لیکن اس بلوچ قوم اور ایرانی حکومت کے نظریوں میں بعد المشرقین تھا اور یہ کسی طرح بلوچوں کے لئے قابلِ قبول نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اس عمل کو ایک ایسا غلط دباؤ تصور کرنے لگے جو ان کی پُرامن زندگی میں خلل انداز ہو رہا تھا۔ اور قدرتی طور پر اس کا کچھ نہ کچھ ردالفعل بھی تھا۔ چنانچہ بلوچ اقوام نے اس کے جواب میں اپنی صفوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اور جب ایرانی

حکومت نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ابتدائی کارروائی کی تو بلوچوں نے مشتعل ہو کر اپنے علاقوں کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لیا اور کسی غیر بلوچ کے وہاں آنے تک کو گوارہ نہیں کرنے لگے۔ اور جب اس کا عملی مظاہرہ کیا گیا تو حکومت نے مزید سختی کرنے کا اپنے آپ کو مجاز سمجھا۔ دوسری طرف بلوچ قوم نے بھی بغاوت کی شکل اختیار کی۔ اور علناً حکومت کی مخالفت میں ہتھیار ڈال دیئے۔ ھخامنشی بلوچ شاہنشاہوں کے خاندان کا ۳۳۰ قبل مسیح میں انقراض ہوگیا اور اب یہ زمانہ خسرو پرویز نوشیروان کا تھا جس کو ساری دنیا نوشیروان عادل کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس نوشیروان "عادل" کا عہدِ حکومت ۵۳۱ سے ۵۷۹ میلادی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ بلوچ قوم ۸۶۱ سال کی لمبی مدت تک اپنے تدبر اور امن پسندی کی وجہ سے ایرانی حکمرانوں کے ظلم و ستم کا شکار ہونے کے باوجود اپنے علاقوں (مازندران، گیلان، البرز) میں رہ رہی تھی۔ کیونکہ جس دن سے بلوچ ھخامنشی حکمرانوں کو سکندر مقدونی نے نابود کر دیا اُسی دن سے نئے حکمران بلوچ قوم کے خلاف انتقاماً میدانِ عمل میں کود پڑے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ کون سا ظلم، کون سی تعدی یا کون سا عمل تھا، جو بلوچوں نے ان ایرانیوں کے خلاف کیا جس کی بناء پر تقریباً ہر ایک ایرانی شاہنشاہ ان بلوچوں سے اس کا انتقام لینے کے درپے رہا۔ تو جان لیں! ہجرت سے قبل یعنی آرین ویج (خوارزم اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ) سے ہجرت سے قبل یہ قوم بلوچ وہاں اپنے مسکنِ اصلی میں بھی قبائل کی صورت میں اپنی انہی خصوصیات کی بناء پر باقی قبائل کی مغضوب تھی۔ اور دوسرے قبائل ان سے گھلنے ملنے سے کتراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آرین قوم کی پہلی ہجرت میں جبکہ پورے کے پورے قبائل سیستان سے ہوتے ہوئے موجودہ افغانستان کے راستے ہندوستان کی طرف بڑھتے

چلے گئے تو بلوچ قبائل مزیدان کا ساتھ نہ دے سکے یا ان غیر بلوچ قبائل نے کچھ حالات ایسے پیدا کئے کہ یہ بلوچ قوم ان کی ہمراہی نہ کر سکی اور سیستان ہی میں رہ کر بعد میں اپنی ریاست یا مملکت قائم کی۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ بلوچ اقوام سیستان کے علاقوں میں اس پہلی ہجرت سے بھی پہلے موجود تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پہلی ہجرت میں بلوچوں کو سیستان میں باقی رہنے کا جواز مل گیا یا انکو اپنے بھائیوں کی خواہش کے مطابق وہاں بود و باش اختیار کرنا پڑی۔ یعنی اس پہلی ہجرت سے بھی قبل اس سیستان میں بھی بلوچ قبائل موجود تھے جن کے ساتھ انہوں نے مل کر اپنی سیستانی مملکت کی بنیاد ڈالی اور اس مملکت کا مشہور ترین بلوچ حکمران وہی شاہنامہ فردوسی کا رستم زال ہے جس کے باپ دادا اس سرزمین سیستان کا بلا شرکت غیرے حکمران رہ چکے تھے۔ اور آج تک قدیم یا جدید کسی ایرانی باستان شناس اور تاریخ دان نے بھولے سے بھی سیستان کو ایرانی قدیم حکومت میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

آرین اقوام کی دوسری ہجرت میں جب بلوچ بھی ان کے ہمراہ مغرب کی طرف بڑھے اور شمال ایران میں آباد ہونے شروع ہو گئے تو بھی ان اقوام نے بلوچوں کی فطرت سے واقفیت ہونے کی بنا پر ان کو علیحدہ اپنی ہی طرز پر رہنے دیا۔ اور بالکل ممکن ہے کہ بلوچ قوم اپنے اصلی آریائی مسکن آرین ویج میں بھی اسی قسم کی دیہاتی اور پہاڑی زندگی بسر کرتی رہی تھی۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے اسی لئے یہاں آکر بھی انہوں نے اپنی وہی زندگی دوبارہ اختیار کر لی اور ظاہر ہے کہ گھوڑے، بھیڑ، بکریاں اور گلے کے ریوڑ رکھنے والے کو پہاڑی، دیہاتی چراگاہوں ہی میں زیادہ سہولت مل سکتی ہے بعد میں جب ایران میں ان آرین اقوام کی منظم حکومتیں قائم ہوتی شروع ہو گئیں۔ تو انہوں نے اس قوم بلوچ سے اُن کی فطری صلاحیت اور جذبات کی بنا پر فوجی خدمات حاصل کرنی شروع کیں۔ بلوچ چونکہ فطری طور پر جنگجو اور لڑاکا رہے۔ اور

پھر اس کی فطرت میں صرف اسی ایک پابند کام کا نام آزادی ہے۔ اسی لئے وہ ایرانی شاہنشاہوں کے افواج میں خوشی خوشی بھرتی ہوتے رہے۔ دوسری طرف ان شاہنشاہوں کو بڑے بڑے طاقت ور دشمنوں سے پالا پڑتا تھا۔ اور یہی بلوچ ایک ایسی قوم تھی جو اُن کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکتی تھی۔

جس طرح کہ پہلے صفحوں میں ذکر کیا گیا ہے اسی فوجی راستے سے جب بلوچ جرنیلوں کی قیادت میں ایران کی حکومت ۵۹ ھ قبل مسیح میں هخامنشی بلوچ تاجداروں کے ہاتھ آگئی تو باقی ایرانی اقوام دانت پیستے رہ گئیں۔ لیکن وہ اس فوجی طاقت کے آگے بے بس تھیں۔ جیسے کہ معلوم ہے یہ بلوچ هخامنشی شاہی خاندان ۳۳۰ قبل مسیح تک پورے ۲۲۹ سال تک ایران کی شاہنشاہیت کے سیاہ و سفید کے مالک رہے اور ایرانی شاہنشاہیت کی محدود سرحدوں کو اپنی فتوحات و یلغار سے اتنا وسیع و عریض کر دیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان هخامنشی بلوچ تاجداروں سے قبل ایرانی حکمران آپس ہی کی چپقلش اور جھگڑوں میں مشغول رہا کرتے تھے۔ مگر هخامنشی بلوچ حکمرانوں کی ہر دلعزیزی، طاقت اور حسن انتظام کی وجہ سے ایران کے داخلی سرکش سردار یا حاکم وغیرہ کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ اور وہ طوعاً و کرھاً تسلیم ہو گئے تھے۔ پھر هخامنشی بلوچ شاہنشاہ نے جو فتوحات کے سہرے اپنے سر باندھے ان کو سن کر آج بھی تاریخ عالم ششدر و حیران ہے۔

اگرچہ ایرانی اقوام ان هخامنشی بلوچ شاہنشاہوں سے بظاہر راضی اور خوش تھیں مگر درپردہ متفقہ طور پر ہمیشہ اس خاندان کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں جو کبھی بارآور نہ ہو سکیں۔ اور جب سکندر مقدونی کے ہاتھوں هخامنشی بلوچ شاہنشاہوں کا آخری تاجدار داریوش سوم مارا گیا تو شاہنشاہیت دوسرے خاندانوں میں منتقل ہو گئی اور سکندر مقدونی کی موت کے بعد جب ایران دوبارہ

آزادی کی سانس لینے لگا تو ان ایرانی حکمرانوں نے داخلی نظم و ضبط کی تکمیل یا ترتیب دینے کے بعد اوّلین فرصت میں بلوچ قوم سے انتقام لینے کی ٹھان لی کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق یہ سرکش قوم کبھی ایرانی حکومتوں کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اور پھر سب سے بڑا ظلم اس قوم نے یہ کیا کہ ایرانی تخت و تاج پر زبردستی قبضہ کرلیا اور مزید برآں پورے ۲۲۹ سال تک بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔ ان ایرانی اقوام کی نظر میں یہ حکمران بلوچ غاصب تھے۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ اتنی مدّت کی حکمرانی کے بعد بھی یہ قوم اپنی مخصوص روایات اور نظریات سے بالکل دست بردار نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ایرانی حکمرانوں نے اس خودسر اور بقول انکے "وحشی" قوم کے خلاف انتقامی کاروائی ضروری سمجھی۔ اتنی مدّت تک وہ یہی کوشش کرتے رہے کہ جلد از جلد اس قوم کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔ لیکن اسی فوجی طاقت کے ڈر سے وہ ایسا نہیں کرسکے۔ بعد میں انہوں نے سب سے بڑی حکمت عملی یہ کی کہ آہستہ آہستہ اس قوم کے افراد کو شاہنشاہی افواج میں کم زور بنادیا یا تعداداً کم کرنے لگے۔ تاکہ دوبارہ وہی گزشتہ واقعہ دُھرایا نہ جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں یہ ایرانی حکمران اس سلسلے میں بھی کس قدر ناکام و نامراد ہوئے۔ کیونکہ خسرو پرویز نوشیروان کے عہد حکومت تک یعنی کوئی آٹھ سَو سال کی طویل مدّت میں بھی وہ ہر لحاظ سے اپنی اس کاروائی میں ناکام رہے۔

اور آخر کار یہ مذموم کاروائی نوشیروان "عادل" نے اپنی غیر دانشمندانہ حکمت عملی سے کام لے کر سرانجام دینا چاہا اور ہزاروں حیلے بہانے کرکے بلوچوں کے خلاف وحشیانہ اور غیر انسانی طریقے سے کاروائی شروع کی یعنی اپنی شاہنشاہیت کی پوری فوجی طاقت لے کر اس پُرامن قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے قتل عام کا حکم صادر فرمایا۔ اسی مذموم اور غیر انسانی فعل کی وجہ سے ایران کا بھی

نوشیروان عادل بلوچوں کے ہاں نوشیرواں رستر (درندہ) یعنی نوشیروان ظالم کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس قتل عام کے جواز میں فردوسی نے کئی راتیں جاگ کر اپنے شاہنامہ میں اس بلوچ قوم پر " فردِ جرم " ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی بناء پر نوشیروان کے قتل عام کی کاروائی کو سراہتے ہوئے صفحے کے صفحے سیاہ کرتے ہوئے بلوچ دشمنی نے اس کو کبھی یہ سوچنے کا موقع نہ دیا کہ اس کی یہ کتاب آئندہ زمانوں میں ایک سند کی حیثیت اختیار کر جائے گی اور اس وقت ایسے بے باک پرکھنے والے بھی پیدا ہوں گے جن کی آنکھوں کے سامنے اُس (فردوسی) کی متعصب ذہنیت صاف آئینے کی طرح چمک اُٹھے گی۔

اگر بلوچ قوم ایک ایسی ہی زور مند اور طاقت ور شاہنشاہیت کی حیثیت سے نوشیروان کے مدِ مقابل نکلتی تو نوشیروان کی یہ فوجی تیاری اور پھر یہ قتلِ عام والی کاروائی قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن ظلم یہ ہے کہ ایک طرف بقولِ فردوسی کے کچھ وحشی ـــ صحرا نشین، کوہ نشین، چور ڈاکو ہیں اور دوسری طرف پوری ایرانی شاہنشاہیت۔ اور اس پراگندہ قوم کے مقابلے کے لئے جس قسم کی تیاری نوشیروان نے کی تھی، وہ قابلِ شرم ہے کیونکہ ایسی تیاری تو بلوچ ھخامنشی کوروش نے بابل پر حملہ کرنے کے وقت بھی نہیں کی تھی۔ اور پھر بھی اس ناکام کاروائی سے بقول فردوسی نوشیروان کی خوشی کی انتہا نہ رہی ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کی فوجی ہمہ گیر کاروائی اور قتلِ عام کے نتیجے میں اس قوم بلوچ کا ایک فرد بھی زندہ باقی نہیں رہا۔ بقول فردوسی ؎

بلوچے نماند آشکار و نہاں !

یعنی چاہے ظاہراً یا چھپا ہوا ایک بلوچ فرد بھی باقی زندہ نہ رہا۔ یعنی نوشیروان عادل نے سب کو بمعہ عورتوں اور بچوں کے تہ تیغ " عدل " کر دیا۔ اب ہم چند منٹ

کے لئے فردوسی اور اس کے "عادل" نوشیروان کی شیخیوں کو ایک طرف رکھ کر حقائق کی طرف جاتے ہیں۔

نوشیرواں نے بلوچوں کے خلاف یہ کاروائی کیوں کی۔ اس کے اسباب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم بالخصوص اس کاروائی کے نتیجے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ایران کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ لوگ گفتار کے غازی ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی فواج میں ہمیشہ ضرورت سے پانچ گناہ زیادہ تعداد رکھی جاتی رہی ہے۔ یہ شاہنشاہ خود اپنی اور اپنی اقوام کی بہادری اور جرأت کی حالت سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ ہمیشہ نفری تعداد میں کرتے تھے اس کی بین مثال ہم کو آج کی ایرانی حکومت سے بھی ملے گی جس کی مسلح افواج کی طاقت اس سے پانچ گنا بڑی حکومت کے لئے کافی ہے۔ لیکن وہ ابھی تک اس کو اپنے لئے ناکافی سمجھ کر اس میں اضافہ کرتی جارہی ہے۔ البتہ نوشیرواں اس میں ڈرنے سے اس لئے حق بجانب تھا کہ بلوچ قوم فطرتاً خود جنگجو قوم تھی، اور مزید برآں وہ ہمیشہ شاہنشاہی افواج میں ریڑھ کی ہڈی رہی۔ اور تیسری بڑی چیز یہ تھی کہ صحراؤں اور پہاڑوں میں گوریلا جنگ ان کے لئے فطری چیز تھی جبکہ شاہنشاھی فوج کے لئے یہ موت کا پیغام تھی

نوشیرواں نے تعصب کی وجہ سے آنکھ بند کر کے جس زبردست کاروائی کا حکم صادر فرمایا تھا، اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ یعنی کوہ البرز میں قلعہ بند بلوچوں کے مقابلے میں نوشیروانی افواج کے دانت کھٹے ہوگئے اور پہلے ہی حملے میں ان کو معلوم ہوگیا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن نوشیروان کی ضد اور اس کی بلوچ دشمنی کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور اس کاروائی کو آگے بڑھادیا۔

بڑی مدت کی جنگ و جدل کے بعد یہ فوجی کاروائی ناکام ہوتی چلی جارہی تھی

کہ اچانک بدطینتی نے نوشیروان کو بدترین طریقۂ عمل پر چلنے کے لئے اکسایا۔ یعنی اس نے اپنی شاھی افواج کو حکم دیا کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں لڑنے والے بلوچوں کو مغالطہ میں ڈال کر ان علاقوں میں چوری چھپے پہنچ جائیں جہاں کہ ان کی عورتیں اور بچے رہتے ہیں ۔ اور وہاں پہنچ کر ان کا قتل عام کر دیں ممکن ہے کہ اس طرح سے اس قوم کی ہمت پست ہو جائے اور وہ تسلیم کرنے پر راضی ہو جائے۔

چنانچہ اس حکم پر عمل شروع ہو گیا۔ اور جب ایرانی شیر دل افواج نے بہروپ اختیار کر کے بلوچ خاندانوں تک رسائی حاصل کی تو وہاں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ کیونکہ سارے مرد لوگ پہاڑوں میں محاذ پر تھے ۔ تو اس عادل نوشیروان کی شیر دل افواج نے بڑی دلیری اور مردانگی سے بلوچ عورتوں اور بچّوں کا قتل عام کر کے عدل و انصاف اور انسانیت کے نام بلند ترین جھنڈا گاڑ دیا۔ اب جبکہ بلوچوں کو اس کی خبر ملی تو وہ زخمی شیر کی طرح ان بزدل شاہنشاہی افواج پر ٹوٹ پڑے اور ان کو بالکل اسی طرح تہ تیغ کر ڈالا جس طرح کہ ان شیر دل افواج نے بلوچ عورتوں اور بچّوں کو بے دردی سے قتل کیا تھا۔

اس فاجعہ کے بعد بلوچوں نے اپنی عورتوں اور بچّوں کو مازندران کی سرحد کے اُس پار گیلان میں بھیج دیا۔ جہاں بلوچوں کے گیل قبائل آباد تھے۔ اور اس جنگ میں "گیل" قبائل بھی باقی بلوچ قبائل کے دوش بدوش ہی شاھی افواج سے لڑ رہے تھے۔

اس قتل عام کے واقعہ کے بعد بلوچ آپے سے باہر ہو گئے ۔ اور

اپنی موت کی پرواہ کئے بغیر بے جگری سے شاہنشاہی فوج پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہے۔ اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر تو پہلے ہی ان افواج کو پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن اب میدان میں اتر کر اُس شاھی افواج کی کمر توڑ ڈالی۔ اور آخر کار جس "عادل نوشیروان" نے یہ ٹھان کر کاروائی شروع کی تھی کہ البرز پہاڑ اور صوبہ مازندران سے بلوچوں کو نکال باہر کرنے یا تہ تیغ کرنے کے بعد وہ یہی کاروائی گیلان میں بھی کریں گے۔ کیونکہ اس مدافعتی جنگ میں گیلانی بلوچ بھی اپنے مازندرانی بلوچ بھائیوں کے دوش بدوش لڑتے رہے۔ لیکن صرف البرز کی کاروائی نے "عادل نوشیروان" کی شاھی فوجی طاقت کو ملیا میٹ کر دیا۔ اب نوشیروان کو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ اگر اس کاروائی کو اور آگے بڑھائے تو شکستِ فاحش کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس کے علاوہ ابھی تک بلوچوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ نوشیروان کی افواج کی حالت قابلِ رحم ہے اور نوشیروان ان کو دھوکے میں رکھ کر مزید کاروائی کی دھمکی دے کر کسی نہ کسی سطح کی مصالحت کا خواہاں ہوگا۔

نوشیروان کو چونکہ کچھ زرخیز علاقوں کی ضرورت تھی اور مازندران اس کی نظر میں تھا اس لئے کچھ مازندران کے شہر نشین بلوچ آبادی کی وساطت اس جنگ کو خاتمہ دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ دیہات نشین اور صحرا یا پہاڑوں میں رہنے والے بلوچ اس پر راضی نہ ہوئے۔ مگر شہری بلوچ نوشیروان کے فریب میں آکر صلح پر راضی ہوگئے۔ کیونکہ ان کو خوف تھا کہ شاہی افواج اگر شہروں پر حملہ کر کے ان دیہاتیوں کے خاندانوں کی طرح ان کی عورتوں اور بچوں کا قتل عام کرے تو یہ لوگ بے دست پا ہوں گے اور ایسی کاروائی واقعی قابلِ برداشت نہیں ہوگی۔ نوشیرواں نے تو جلد از جلد مصالحت کے لئے زور ڈالا تاکہ اس کی افواج کی نابودی کا بھانڈا

نہ چھوٹے۔ اسی فریب دھی اور فریب خوردگی میں مصالحت ہوگئی اور نوشیروان کو
مازندراں میں کسی حد تک عمل دخل کا جواز مل گیا۔ اور اسی صلح نامہ کے موجب
گیلان کی کارروائی بھی منسوخ ہوگئی۔ حالانکہ اس کی طاقت نوشیروان میں خود
بھی نہ تھی۔ اور وہ ایک اتنی بڑی غلطی کبھی نہ کرتا۔

صلح و صفائی کے بعد کوہ البرز میں رہنے والے بلوچوں کو یہ بات نہایت
ناگوار گزری اور انہوں نے دل سے کبھی بھی یہ صلح قبول نہیں کی بلکہ ان کا رد
عمل یہ ہوا کہ وہ اپنے خانوادوں سمیت گیلان روانہ ہو گئے۔ جہاں بلوچ قبائل آباد
تھے اور یہی گیلانی اسی جنگ میں ان کے دوش بدوش کوہ البرز کی گھاٹیوں
سے دشمن پر آگ برساتے رہے۔ اسی البرزی بلوچ قبائل میں سے کچھ تو گیلان
ہی میں رہ گئے اور باقی قبائل آہستہ آہستہ جنوب کی طرف روانہ ہوتے گئے
چونکہ یہ ایک اجتماعی مہاجرت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس لئے یہ بلوچوں کی جنوب
طرف ہجرت کے نام سے مشہور ہوگیا۔

ان بلوچ قبائل نے ایران کے ان علاقوں کو چھوڑ کر جہاں دوسری ایرانی
اقوام کے قبائل آباد تھے۔ کرمان جیسے علاقے میں رختِ سفر کھول دیا جہاں
وہ بلا شرکت غیرے آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ اور پھر کرمان سے بعد
میں جنوب اور پھر مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

شاہنامہ میں فردوسی نے جس طرح سے نوشیرواں کی افواج کی تعریف لکھی
ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد خود ایرانی لوگ شرم سے پانی پانی ہوجاتے ہیں
لیکن فردوسی جیسے ایک عظیم شاعر کا ذہن تعصب نے ماؤف کر رکھا تھا۔ البتہ
نوشیرواں کی روح کو فردوسی کا احسان ماننا چاہیئے کیونکہ فردوسی نے نوشیرواں
کے قتل عام کا جواز اور کامیابی کے ساتھ ساتھ بلوچ قوم کو صفحہ ہستی سے

مٹا کر اس کا ایک فرد تک باقی نہ رہ جانے کی من گھڑت کہانی کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کر کے اس مشہور عالم " عادل " نوشیروان کی لاج رکھ لی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح بلوچ اقوام میں یہی " عادل " نوشیروان بنام " نوشیروان رستر " مشہور ہے۔ " رستر " بلوچی زبان میں عموماً درندہ اور خصوصاً چرخ ( ) کو کہتے ہیں۔ کئی علاقوں میں یہ بھیڑیا اور جنگلی سوٗر کے لئے مستعمل ہے۔

ایک بات جسے میں یہاں بتانا ضروری سمجھتا ہوں جو شاید بلوچ قوم کے لئے نئی ہو۔ یا ممکن ہے کہ میری نظر سے اس کا ذکر کسی کتاب وغیرہ میں نہیں گزرا ہے۔ وہ یہ کہ جنوب ایران میں آج تک دو ایسی قومیں ہیں جن کی ایک اچھی خاصی آبادی ابھی تک خانہ بدوش زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہ اجتماعی صورت میں رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْف کے مصداق پر گرمیوں میں سرد علاقوں میں آتی ہے اور سردیوں میں گرم علاقوں کا رخ کرتی ہے۔ ان کے پاس بھیڑ، بکریاں، گائے وغیرہ کے ریوڑ ہوتے ہیں جن کے دودھ سے یہ شیلانچ، مکھن، گھی وغیرہ بناتے ہیں۔ اور اون اور بال سے غالیچے، چغے، خورجین، دریاں اور دوسری ایسی چیزیں بناتے ہیں۔ یہ جن جن شہروں کو جاتے ہیں، وہاں کی شہری آبادی سے ذرا دور اپنا پڑاؤ ڈالکر ڈیرا لگا دیتے ہیں اور پھر اپنی مصنوعات شہر میں بیچنے کے لئے لے آتے ہیں علاوہ ازیں شہر کے تاجر پیشہ لوگ انکے ڈیرے پر جا کر گھی، شیلانچ، اون، کھال، بال، غالیچے اور دیگر مصنوعات کے علاوہ بھیڑ، بکریاں، گائے وغیرہ خریدتے ہیں۔ انکی عورتیں بہترین غالیچہ باف ہوتی ہیں۔ ان دو قوموں میں سے ایک تو معروف قوم " ترک " ہے مگر دوسری قوم بلوچ ہے اور خالص بلوچی زبان بولتی ہے لیکن عام طور پر وہاں کے لوگ انکی بلوچیت سے واقف نہیں ہیں کیونکہ وہ بلوچی زبان صرف آپس کی گفتگو ہی میں بولتے ہیں جس کو وہاں کے لوگ انکی کوڈ CODE زبان کہتے ہیں یعنی اشارہ و کنایہ کی زبان۔ اور دوسری بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو " کرمش " کہتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کے ہاں اسی " کرمش " کے نام سے مشہور ہیں۔

اب یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان کا نام "گرش" کیوں اور کیسے ہے۔ تو اس میں کوئی شک کی گنجائش ہمارے یہاں باقی نہیں رہتی کہ ھخامنشی شاہنشاہ کوروش کبیر چونکہ خود بلوچ تھے اس لئے اس کی نسبت سے یہ قوم "کوروش" سے بگڑ کر "گرش" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ ویسے بھی "کوروش" کا تلفظ "کرش" ہی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ساری قوم اسی نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اگر مزید تحقیقات کی جائے تو ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

بلوچ قوم کے جن قبائل نے جب شمال ایران سے ہجرت کی تو جنوب ایران میں آگئے۔ اور کرمان میں مسکن گزین ہوگئے تو کرمان کے علاوہ گرد و نواح کے تمام علاقوں پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔ ظلم و ستم کی انتہا۔ دیکھیئے کہ ایرانی حکمرانوں نے جب دیکھا کہ یہاں یہ قوم اپنی مرکزیت قائم کر رہی ہے تو ان کو دوبارہ اس قوم سے خطرہ محسوس ہوگیا چنانچہ ایک بار پھر اس قوم کی مرکزیت توڑنے اور اس کو رام و تسلیم کرنے کی کوشش میں انتقام اور قانون کے نام پر اس قوم پر وہ جور و ستم روا رکھا گیا۔ جن کو سن کر انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ اور آخر کار ان کی مرکزیت کو توڑنے میں کامیاب ہوگئے تو بلوچ قوم کے کچھ زیادہ خودسر قبائل ایک بار پھر ہجرت کی صورت مشرق کی طرف روانہ ہوگئے اور آزاد علاقوں میں پانی اور چراگاہ کی تلاش کرتے کرتے مکران کی سرزمین پر آبادیاں بساتے ہوئے، ویران علاقوں میں قصبے اور گاؤں بناتے اور پرانے قصبوں پر قبضہ کر کے ان کو اور زیادہ آباد بناتے ہوئے سیلاب کی صورت میں مشرق کی جانب بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ موجودہ بلوچستان کی انتہائی مشرقی علاقوں میں میر چاکر رند اور گوھرام لاشاری اور دیگر بلوچ سرداروں کی جب سرداریاں قائم ہوگئیں تو ان کے شعراء نے اسی ہجرت کے بارے میں اپنے مسکن اصلی سے

لے کر اُس وقت تک کی آخری فرودگاہ تنک کے خاص خاص مرحلوں اور حالات کو نظم کر دیا۔ یہ پندرھویں صدی کا زمانہ تھا اور اسی کے بارے میں ایک نظم سے مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے اپنی کتاب " بلوچی دل پسند منظومات" کی ابتدا کی ہے جس کی ابتدا کے چند اشعار کا ترجمہ یوں ہے۔

۱۔ ہم اللہ کے شکر گزار ہیں، جو مالک الملک ہے۔

۲۔ سارا جہاں خاک وگل (برباد) ہو جائے گا اور وہ خود باقی رہے گا۔

۳۔ ہم یا علی کے مرید ہیں اور امامؑ کا دین برحق ہے۔

۴۔ ہم پاک نبیؐ کی اُمت ہیں جو سارے جہان کا سردار ہے۔

۵۔ ہم میر حمزہ کی اولاد ہیں اور ہمیشہ بازی لے جانے والے ہیں۔

۶۔ حلب سے اُٹھے ہیں اور یزید سے لڑائی کی۔

اس نظم کے چھٹے مصرعہ میں ذکر ہے کہ " از حلبءَ پاد کائیں گول یزیدءَ جیڑ دیں ۔" یعنی ۔" حلب سے اٹھے ہیں اور یزید سے لڑائی کی ۔" اس نظم کے اس مصرعہ کو کئی ایک مورخوں نے اور اس طرح دوسرے عام بلوچوں نے اپنا ماخذ بنا کر بلوچوں کے اصل مسکن کو شام کا تاریخی شہر " الپو" موجودہ " حلب" منوانے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ذہن میں صرف لغزشِ ذہن وزبان وقلم کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس بلوچ شاعر نے یہ نظم کہی ہے اس کا نہ تو نام کسی کو معلوم ہے نہ حیثیت ۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ یہ شاعر پندرھویں صدی سے پہلے کا بالکل نہیں ہے کیونکہ اس نظم میں وہ چاکر تنک کا نام بھی لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بلوچ قوم واقعی حلب " سے آئی ہے

جس کا جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہوگا۔ جس کے شواھداب تو ساری دنیا پر ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور وہ پُرانا نظریہ اس جدید تحقیقات نے چکنا چور کر دیا ہے پھر بھی ہم اس کے بارے میں اطمینان کی خاطر دو باتیں کریں گے۔

جن بلوچوں نے شروع شروع میں اس نظریہ کو اپنایا تھا وہ محض خوش عقیدگی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہا ہے کہ وہ "حلب" سے آئے ہیں بلکہ اسی نظم میں شروع کے مصرعوں میں اپنا مذہبی عقیدۂ راسخہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ "مامریدوں یا علی ہ" یعنی ہم حضرت علی کے مرید ہیں — اور "اولادمیریں حمزہ ءِ گیں" یعنی ہم امیر حمزہ کی اولاد ہیں۔ اور حمزہ سے ان لوگوں کی مراد امیر حمزہ بن عبدالمطلب عم بنی محمد ہے اور انہی خوش عقیدہ بلوچوں میں یہ کہانی بھی مشہور ہے کہ رسولِ اکرم کے زمانے میں ایک دفعہ امیر حمزہ شکار کھیلتے کھیلتے دُور نکل گئے اور پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں کہ اچانک ان کا کسی دیو سے سامنا ہوا جس نے ان کو للکارا۔ لڑائی ہوئی۔ دیو مارا گیا۔ تب معلوم ہوا کہ وہ کوہ قاف کے علاقے میں ہیں۔ قصّہ مختصر وہاں کوہ قاف میں ایک پری زاد لڑکی سے ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور اس لڑکی سے اُن کو ایک بیٹا ہوتا ہے۔ اس بیٹے سے جو قوم پیدا ہوئی وہی بلوچ قوم ہے۔

م ا:- جہاں تک اس کا عقیدے کا تعلق ہے وہ تو ظاہر ہے ایرانی شیعہ عقائد سے متاثر ہو کر اپنایا گیا ہے اور یہی عقیدہ ہی اب اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ نظم بنی امیہ کی خلافت کے انقراض کے بعد عباسی خلفاء کے زمانے یا اس سے بھی بعد میں کہی گئی ہے جو اس نظم کے زمانے کے بارے میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چاکری دور میں کہی گئی ہے اور اسکی کوئی ایسی چیز حقیقت نہیں بن سکتی جو تاریخ سے اختلاف رکھے۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ ایران میں فارسی زبان میں ایسی سینکڑوں من گھڑت یا مبالغہ آمیز کہانیاں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ جن میں جنگ نامہ حضرت علی، داستان امیر حمزہ وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ اگر ہم بلوچوں کی اس من گھڑت کہانی کو صحیح مانیں تو پھر ہمیں میر چاکر کے لڑکے شہداد کی پیدائش کا وہ خود ساختہ قصّہ بھی صحیح ماننا چاہیئے جو ڈیمز کی اسی کتاب میں مذکور ہے جو بلوچی غیرت کے لئے کھلا چیلنج اور اس کی شرافت کے منہ پر تھپیڑ ہے۔

یہ امیر حمزہ والی کہانی بھی انہی فارسی کتابوں کی راہ سے بلوچوں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان پڑھ اور انجان بلوچ آج تک اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو کتاب چھپی ہوئی ہو وہ غیر قابلِ تردید ہے۔ اب جبکہ انہوں نے امام علی کے عقیدت مندوں میں اپنا شمار کیا اور امام کے دین کو برحق کہا اور حمزہ کی اولاد ہونے کا دعویٰ بھی کر بیٹھے تو پھر ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا کہ ہم "حلب" کے رہنے والے ہیں۔ کیونکہ بلوچستان یا مکران کے پرانے عرب حکام میں سے ایک نہیں کئی حمزہ ہو گزرے ہوں گے۔ جن میں سے ایک "حمزہ حلبی" بھی تھا۔ اور انہوں نے اپنے حمزہ کو بھی اسی طرح حلب سے منسوب کر دیا اور اس نظم میں ذکر شدہ "حلب" کو بھی وہی دمشق کا حلب قرار دیا۔ پھر ایک قدم اور آگے یہ کہ چونکہ حمزہ بن عبدالمطلب قریش تھے اس لئے بلوچوں کے نامور قبیلے رند اپنا جدِ امجد حمزہ بتاتے ہوئے یہ بھی دعویٰ کرنے لگے کہ ہم "قریش" ہیں۔ چنانچہ ایک بلوچی نظم کا مصرعہ ہے۔ ۔ رند قریش انت ءُ حمزہ ءِ اولاد"۔ یعنی رند جو ہیں وہ قریش ہیں اور حمزہ کی اولاد ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ رند قبیلہ میں کوئی شخص حمزہ نامی ہو گزرا ہو مگر وہ یقیناً حمزہ بن عبدالمطلب بالکل ہی نہیں۔ اور نہ ہی وہ "قریش" قبیلہ سے متعلق تھا۔ اگر ایسے نہیں ہے تو اس کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے۔ تو آیئے ہم اس عقدۂ کشائی کی کوشش کریں گے

یہ ممکن اور صحیح ہو سکتا ہے کہ رند قبیلے کے جدِ امجد کا نام حمزہ ہو اور یہ نام آج تک بلوچوں میں عام ہے۔ اگر حمزہ کو ہم ایک بلوچ فرد مانیں گے تو پھر "قریش" کا کیا ہو گا۔ لیکن پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ لفظ یا نام "قریش" نہیں بلکہ حقیقت میں یہ وہی "کُرِش" ہے یہ اسی قبیلے کا نام ہے جس کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا ہے۔ جو ایران کے جنوب میں رہتا ہے۔ جن کی زبان بلوچی ہے اور اپنے آپ کو بلوچ کہتے ہیں۔ لیکن خاندانی نام ان کا وہی "کُرِش" ہے اور وہاں اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ یقیناً بلوچوں کے کسی ایک شخص کا نام "حمزہ کرش" تھا جس کو خوش عقیدہ لوگوں اور مذہبی دیوانوں نے "حمزہ کرش" سے "حمزہ قریشی" کر دیا۔

زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہی بلوچ جو آج تک ایران کے جنوب میں خانہ بدوش زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایرانیوں کے ہاں "کرش" کے نام سے جانے جاتے ہیں جو خود اپنے آپکو "کُرِش" کے علاوہ "بلوچ" بھی کہتے ہیں اور بالکل صاف بلوچی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ کیونکہ "کُرِش" ان کے قبیلے کا نام ہے اور "بلوچ" اُن کی قوم کا نام ہے جس کے بارے میں میں عرض کر چکا ہوں کہ "کوروش کبیر" کے قبیلے سے متعلق ہیں۔ اس لئے یہ یقین کرنا چاہیئے کہ جس لفظ کو لوگ "قریش" لکھتے ہیں وہ حقیقت میں یہی "کُرِش" ہے جس کو خوش عقیدہ لوگوں نے مذہب اسلام سے عقیدہ اور وابستگی کی خاطر "قریش" بنا دیا۔

"حمزہ اور قریش" کے بعد تیسرا حل طلب مسئلہ لفظ "حلب" ہے جو شاعر نے اسی نظم میں استعمال کیا ہے اور پھر کچھ مورخوں نے انہی منظومات کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ "حلب" یا "الپّو" نہیں ہے جو دمشق میں واقع ہے۔ یہ بات تو اب نئی تحقیق ثابت کر چکی ہے کہ بلوچوں کا مسکن اصلی شمال ایران میں دریائے مازندران کے آس پاس ہے۔ یہ وہی دریا ہے جس کے متعدد نام ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ کیسپین سی، بحر خزر، بحر قزوین، اور پھر اس کا قدیم ترین نام "ھیرکانی" ہے۔ ہمارے محققین نے نہ جانے کس وجہ سے اس جگہ کے نام کی تلاش انہی علاقوں میں نہیں کی ہے جو تین آسانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ مجھے ایک پرانا نقشہ ہاتھ آچکا ہے جس میں کوروش کبیر، داریوش، سکندر مقدونی اور سمرامیس کے زمانے کے ایران کو بتایا گیا ہے اور اس زمانے کے نام بھی اسی نقشے میں لکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسی دریای مازندران یا کیسپین سی کا پرانا نام "ھیرکانی" اسی نقشے میں بھی لکھا ہوا ہے۔ اور اس دریا کے مغربی کنارے ایک جگہ کا نام "البانی" یا "البانے" لکھا ہوا ہے جو کوہ قاف (قفقاز) کے دامن میں واقع ہے۔ یہ خطہ آج کل روسی آذربائیجان کے علاقے اور مشہور شہر "باکو" سے ذرا پرے ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے چونکہ بلوچ کا اصل مسکن بھی اسی جگہ ہے اس لئے ان کو امیر حمزہ کی اولاد ثابت کرنے کے لئے یہ آسان ترین طریقہ تھا کہ ان کو کسی نہ کسی صورت میں یہاں پہنچا کر ایک پری زاد سے اس کی شادی رچوانی چاہیئے تھی۔ چونکہ کوہ قاف یا قفقاز کے رہنے والے لوگ قوی ہیکل اور عظیم الجثہ تھے اس لئے ایرانیوں نے ان کو دیو کا نام دیا تھا اور اسی طرح اس علاقے کی عورتیں بڑی حسین ہوتی تھیں جن کو پری کا نام دیا گیا۔ ویسے بھی ایرانی تاریخ میں شمال ایران خصوصاً

مازندران، جو اسی علاقے سے ملتا ہے، کے دیو مشہور ہیں۔ چنانچہ ایرانی شاہنشاہ ان دیوؤں سے ہمیشہ پریشان تھے اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے کے مصداق پر ہمیشہ بلوچ نژاد سیستانی رستم کو اُن سے مقابلہ کرنے کے لئے بلاتے تھے۔ حالانکہ حقیقت میں یہاں کوئی "دیو وغیرہ نہیں تھا بلکہ یہی البانی بلوچ یعنی مازندرانی اور گیل یا گیلانی بلوچ اقوام کے افراد تھے۔ کیونکہ "البانیہ" کے علاوہ اس بحر خزر کے جنوب اور جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں یہی دو علاقے مازندران اور گیلان تھے۔ اور ابھی تک ہیں۔ یہ تینوں جگہ بلوچوں کے مسکن تھیں۔ خصوصاً مازندران تو بلوچوں کا گڑھ تھا اور مازندران اور ایران کے علاقے کے درمیان مشہور کوہ البرز ژاوستا کا "برزین کوہ" اور بلوچی زبان کا بھی "برزین کوہ" یعنی "اونچا پہاڑ" سدِ سکندری کی طرح حدِ فاصل کی حیثیت سے واقع ہے۔ ایرانی شاہنشاہوں اور ان کی افواج کے لئے کوہ البرز کا پار کرنا یا دشتِ مازندران میں قدم رکھنا تباہی کے مترادف تھا۔ اس وقت کے آب و ہوا اور منعزل زندگی کی وجہ سے بلوچ قوم اپنی نژادی قد و قامت کے ساتھ قوی ہیکل تھے۔ یہ تو بعد میں امتزاج خون اور تبدیلی آب و ہوا نے ان سے یہ صفت بھی چھین لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی تاریخ اور شاہنامہ فردوسی ان کو "دیو" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چونکہ مازندران اور گیلان کی سرحدات ملی ہوئی ہیں اس لئے بلوچ "البانیہ" سے ان علاقوں میں آکر ان کو اپنا لیا اور پھر ایسا گڑھ بنا لیا کہ شاہانِ ایران ان کو نہیں ہٹا سکے۔

اب یہی لفظ "البانیہ" کو جو پندرھویں صدی سے پہلے کے بلوچ اپنے تذکروں میں صحیح تلفظ اور معنی کے ساتھ بیان کرتے رہے تھے۔ بعد میں اسلامی عقیدت مندوں نے آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی لانی شروع کر دی اور اس کے

ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی عرب ثابت کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو گئے جو احساس کمتری کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ اور پھر پندرھویں صدی کے اس شاعر نے بھی شاید "البانے" ہی کا لفظ استعمال کیا ہو جو پھر بگڑ بگڑا کر انیسویں صدی میں لوگوں کی لغزشِ زبان سے "البانے" سے "الب" اور پھر "حلب" بن گیا۔ جس کی سب سے بڑی پشت پناہی مذہب کے عقیدت مندوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ کر رہے تھے جو احساس کمتری کے شکار ہونے کی وجہ سے اپنی نسل کو عار سمجھ کر عربوں کی نسل میں شامل ہو کر اپنی عزت و آبرو اور صحیح النسل کی سند پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اور جو لوگ اِن اشعار اور منظومات کو یاد کر کے سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے ۔ اسی مذہبی عقیدے کی بنا پر اس کو واقعی "حلب" سمجھنے یا کہنے لگے جو صرف ایک لغزشِ زبان کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔جس کی وجہ سے یہ لفظ "البانے" سے "البان"، پھر "البا" اور آخر میں "حلب" بن گیا اور پھر عربی رسم الخط والوں نے اس کو اپنے رسم الخط میں "حلب" لکھنا شروع کرا یا۔ عربوں میں یہ چیز عام ہے ۔مثلاً بلوچ، کیچ، بمپور، پہرگ، گالک "جگال"، جتّ " کے بلوچی الفاظ آج ہمیں عربی کتب تاریخ و سیَر میں "بلوص، کج، بمبور، فہرج جالق، زدجال، زط۔" کی شکل و صورت میں ملتے ہیں ۔

اب اگر ہم اس صحیح لفظ "البانے" یا "الب" کو اسی مصرعے میں لکھ دیں تو معانی کے علاوہ شعری نکتۂ نظر سے بھی صحیح آئے گا۔ مثلاً ؎ از "الب" پاد کائیں گوں یزیدءَ جیڑ دیں ۔" یا کہ ؎ "از لبانے پاد کائیں گوں یزیدءَ جیڑ دیں ۔" (یعنی ہم "البانے" سے اٹھے ہیں اور یزید سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں)

اس مصرعہ میں دوسرا متنازعہ فیہ لفظ "یزید" ہے۔ بھلا "البانے" میں یزید کون تھا۔ اب یہ بات قطعی ہے کہ یہ یزید بن معاویہؓ تو بالکل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی عرب عملدار کا نام "یزید" ہو جس نے بلوچوں کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔ یا کہ بعد کی صفاری، دیلمی یا سلجوقی وغیرہ حکمرانوں نے اس قوم یا قبائل پر ناجائز ظلم کیا ہو۔ خصوصاً محمود غزنوی نے خلف بن احمد کی گرفتاری اور سیستان کی فتح کے بعد اپنے بیٹے مسعود کو بلوچوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا جس نے بلوچوں کے ساتھ وہی ظلم ڈھانے کی کوشش کی جس کی مثال نوشیروان کے ظلم و ستم سے ملتی ہے۔

اس کے علاوہ بلوچ قوم چونکہ پختہ مذہبی عقیدہ کی مالک ہے[1] اسی لئے اس کے عقیدے میں "یزید" سے بدتر کوئی شخص نہیں تھا جس نے حسین ابن علیؓ سے لڑائی لڑی تھی۔ اس بنا پر بلوچ ہر ظالم و جابر بلکہ بے دین شخص تک کو یزید کہتے ہیں۔ اور آج تک "یزید" کا لفظ انہی معنوں میں لیا جاتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں شاعر نے بھی ان ظالم و جابر اقوام کے لئے "یزید" کا لفظ استعمال کیا ہے جنہوں نے اس قوم پر زیادتیاں کی ہیں۔ تو اس رو سے اس نظم کا مصرعہ یوں

---

[1]:۔ شروع ہی سے کم تعلیم اور شہروں میں رہنے والے تھے جس کی وجہ سے اسلام اور اس کی تاریخ کے بارے میں ان کی معلومات کا واحد وسیلہ ہے ایرانی اور انکی زبان فارسی تھی اور یہ ظاہر ہے جب ایرانیوں نے عباسیوں سے گلوخلاصی حاصل کی تو دوبارہ اپنی زبان کی طرف توجہ دی اور شیعہ عقائد کے مطابق اسلام اور اس کی تاریخ کو نئے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا اور بلوچوں کو اسلامی تاریخ اسی لحے سے آشنا ہوئی اس لئے شیعہ عقائد کی پیروی میں یزید کو قاتل حسینؓ اور مجرم بنالیا جس کی ایک کورانہ تقلید کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں۔

ہونا چاہیئے۔

۵ از البانے پاد کائیں گوں یزیداں جیڑویں

(یعنی ہم البانے سے اٹھے ہیں اور یزید نما دشمنوں سے ہماری لڑائیاں ہوتی رہی ہیں) ویسے ایرانی حکمرانوں میں "یزدگرد" نامی بادشاہ بھی ہو گزرے ہیں اور بلوچوں نے ہمیشہ ایرانی حکمرانوں بادشاہوں کے لئے بھی ایک نام "سمبل" (SYMBOL) کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہوگا اور بعد میں اسی مذہبی عقیدت مندی کی وجہ سے لوگوں نے اس لفظ "یزد" کو "یزید" میں تبدیل کر دیا۔ اگر اس مصرعہ کو ہم یوں لکھیں ؎

ازالبانے پادکائین ءُ گوں یزداں جیڑویں

یا کہ ؎ از اَلَبَ پادکائین ءُ گوں یزداں جیڑویں ۔"

لیکن جیسے کہ ابھی ابھی یزید اور شیعہ عقائد اور ان کا بلوچوں پر اثر کے بارے میں کہا گیا ہے۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانے میں یہ نظم کہی گئی ہے اس وقت تک "یزید" کے بارے میں ایرانیوں میں زبردست نفرت پھیل چکی تھی اور انہوں نے انتہائی کوشش اور محنت سے عام بلوچوں کے ذہنوں میں بھی "یزید" دشمنی کا نظریہ ڈال دیا تھا اور جب ان اشعار یا منظومات کا دور آیا تو شاعروں نے اسی "یزد" یا "یزدگرد" وغیرہ کی جگہ "یزید" کہہ ڈالا۔ ورنہ شاعر کا اصل مقصد وہی نوشیروانی ظلم وستم ہے جس کی تعریف فردوسی اپنے شاہنامے میں کرتے ہوئے ذرا شرمایا تک نہیں۔ کیونکہ مصرعہ صاف ہے ؎

اَز اَلَبَ ءَ پاد کائیں گوں یزیداں جیڑویں

(یعنی ہم "البانے" (کیسپین سی کے کناروں سے) اٹھے ہیں اور متواتر ان "یزیدوں" (یعنی یزید نما ایرانی شاہنشاہوں) کے ساتھ ہماری لڑائیاں

ہوتی رہی ہیں)

اسی نظم میں شاعر آگے چل کر کہتا ہے ؎

کلبلاؔ، بمپور ماں نیام ءَ، شہر سیستان منزلیں

(یعنی کلبلا، پھر درمیان میں بمپور ہے، اور سیستان کا شہر ہماری منزل ہے)

اب لوگوں نے اس لفظ کلبلاؔ کو انہی گزشتہ "حمزہ، حلب اور یزید" کے الفاظ کے مطابقت میں "کربلا" کے معنوں میں لیا ہے۔ بلوچی میں حرف "ر" کا "ل" سے بدل جانا عام ہے۔ مثلاً "استاد، برادر، زیمر" کے الفاظ کو "استال، برادل زیمل" بھی تلفظ کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لفظ "کربلا" سے کلبلا بن گیا ہے۔ لیکن اس لفظ کو "عراق" کا "کربلا" سمجھنا قطعی غلط اور گمراہ کن ہے۔ کیونکہ "کربلا" کے بعد کئی نہایت مشہور و معروف اور تاریخی اہمیت کے حامل بلکہ تاریخ ساز شہر آتے ہیں جن کو نظرانداز کرنا بالکل ناقابل اعتبار ہے۔ اگر شاعر کا مطلب یہ ہوتا کہ "ہم کربلا سے نکلے اور درمیان میں بمپور واقع ہے اور پھر سیستان آگئے" تو یہ کچھ عجیب سا لگے گا۔ کیونکہ "کربلا" سے نکل کر ان کو عراق کے مشہور شہروں کے علاوہ ایران کے مشہور شہروں سے بھی گزرنا پڑے گا۔ اور کم از کم فارس کے شیراز کا نام تو لیتے۔ مگر یہ تو ممکن نہیں کہ اتنی لمبی مہاجرت اور مسافرت میں ان سب جگہوں کو پھلاند کر وہ صرف بمپور کا نام لیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بلوچ "البانے" سے نکلے تو نزدیک ہی جب مازندران اور گیلان میں آگئے تو ایرانی شاہنشاہوں سے لڑائی ہوتی رہی اور جب مازندران اور گیلان سے روانہ ہوگئے تو جنوب ایران آگئے اور منتشر ہوئے۔

ایک طائفہ یا کچھ طائفے تو کرمان ہی میں آکر آباد ہو گئے۔ (جن سے بعد میں یہاں بھی وہی سلوک رکھا گیا جو نوشیروان نے اُن کے مسکن اصلی میں ان کے

ساتھ رکھا ۔) اور دوسرے طائفوں نے اپنا سفر جاری رکھا ۔ اس بنا پر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ جس طرح " البانے " کو لوگوں نے بگاڑ کر " حلب " بنا دیا ہے اسی طرح اس لفظ کو بھی توڑ مروڑ کر اپنے ذاتی نظریئے کے مطابق " کربلائے معلّی " بنا دیا ہے جس کے بارے میں تحقیق کی اشد ضرورت ہے ۔

اب آیئے کہ اس شہر، قصبہ یا جگہ کے نام کو پُرانے نقشوں میں تلاش کریں ۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک قابل قدر نقشہ ہاتھ آگیا ہے ۔ یہ نقشہ مشہور مستشرق میجر موکلر نے بنایا ہے ۔ میجر موکلر کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے ۔ اس نے بلوچستان اور بلوچی زبان پر بھی کافی تحقیق کا کام کیا ہے ۔ مضامین کے علاوہ اس کی کتاب " بلوچی گریمر " تو بہت ہی مشہور ہے ۔

یہی میجر موکلر جو بعد میں کرنل بن گئے، لکھتے ہیں :۔ کہ انہوں نے (متحدہ) مکران کے ساحلی علاقوں کے ان ناموں کی تحقیق و تصدیق کی خاطر گوادر سے جاسک تک کا سفر کیا تاکہ اُن تمام بنادر و مقامات کا صحیح جائے وقوع اور نام معلوم کرلیں جن سے سکندر مقدونی کا سمندری بیڑہ نیارکوس کی کمان میں ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے گزرا ہے ۔ اور جن کا ذکر مشہور یونانی مورخ " آریان " (ARRIAN) نے کیا ہے ۔

آریان کے علاوہ ان کا ذکر ٹولمے (PTOLMEY) اور مارسیان (MARCIAN) نے بھی خاص طور پر کیا ہے ۔ ان مشہور مورخین کے بعد ان مقامات کی تحقیق و تصدیق کے بارے میں ڈاکٹر ونسنٹ (DR. VINCENT) اوٹر (OTTER) کمپ تھارن (KEMP THRNE) اور مُولر (MULLER) جیسے مورخین نے بھی کافی کام کیا ہے ۔ کرنل موکلر نے ان تمام مورخین کے کام کی روشنی میں ان مقامات و بنادر کے نام و محل وقوع کی دوبارہ تصدیق

کی خاطر ۱۸۷۶ء میں بھی گوادر سے جاسک کا سفر کیا۔ اور دقیق ترین طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس متحدہ مکران کے تمام ساحلی علاقوں کے اُن تمام ناموں پر تحقیق کی جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ہر میل تو کیا ہر فرلانگ بلکہ اس سے بھی کم فاصلوں کا دقیق اور اکیدطور پر ناپ کرنے کا انتظام کیا تاکہ کسی قسم کا معمولی شبہ باقی نہ رہے۔ اب ہم کرنل صاحب کا وہی نقشہ اپنے سامنے رکھ کر تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ اس نقشے میں انہوں نے ہر بندر اور ہر مقام کا ہر وہ نام لکھا ہے جو مذکور مورخین نے اپنے اپنے تحقیقی سفر کے نتیجے پر اپنے اپنے نقشوں میں دیئے ہیں۔ موکلر کے اس نقشے میں متحدہ مکران کے موجودہ کلمت (پُرانا "کلما") سے شروع ہو کر باآلی نامی ایک بندر تک، جو موجودہ بندر عباس سے ۱۰۰ سو میل مشرق میں ہے، کے نام تفصیل سے دیئے ہیں۔ اسی نقشے میں اِسی باآلی نامی بندر سے کچھ میل مشرق میں، ساحل پر ایک اور نام "کارپلا" (KĀR PELLA) لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بہت ہی پرانا ہے۔ یہی نام اور اس کا مقام ہمارا مطرحِ بحث ہے۔ اسی جگہ ایک پہاڑی بھی ہے۔ جہازرانوں نے بعد میں جہازرانی کے سلسلے میں اس کو خاص مقام کا درجہ دے کر اس کا نام "کوہِ مبارک" رکھا ہے اور یہ نام آج تک رائج ہے۔ موکلر کی تحقیق کے مطابق یہی "کوہِ مبارک" ہی وہ جگہ ہے جس کو اس سے پہلے کے تمام مذکور مورخین نے اتفاقِ رائے سے "کارپلاّ" لکھا ہے۔ اور یہ "کارپلاّ" اسی ساحل کی مشہور بندر جاسک سے صرف چھبیس ۲۶ میل مغرب میں ہے۔

ہمیں کرنل صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس جگہ کے نام کی تحقیق کر کے ایک بہت ہی بڑے متنازع فیہ مشکل کو حل کر دیا ہے۔ جی ہاں! یہی وہ "کارپلاّ" جس کا ذکر اس بلوچ شاعر نے اپنی اُس مشہور نظم میں کیا ہے۔ اب ہم

اس نام کو لے کر اپنا بحث پھر شروع کر دیتے ہیں۔ اور دوبارہ اس نظم کے اسی مصرعہ کو ایک نظر دیکھتے ہیں ؎

کلبلاؔ، بمپوؔر ماں نیام ءَ شہر سیستان منزلیں

اس مصرعہ سے بھی یہ عیاں ہوگیا کہ "بمپوؔر" کا محل وقوع "کلبلاؔ" اور "سیستان" کے درمیان ہے۔ اب ہم اس کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ شاعر کے قول میں کتنی صحت ہے۔

اگر ہم شاعر کے کلبلاؔ کو "کربلائے معلّی" تصور کریں تو سیستان اور اس کے درمیان بمپوؔر کا ذکر کس قدر مضحک ہوگا۔ کہاں عراق کی سرزمین اور درمیان میں جنوبی ایران کا وسیع و عریض علاقہ اور پھر کہاں مکران کے شہر بمپوؔر کا ذکر اور پھر اس کو "کربلا" اور "سیستان کا درمیانی پوزیشن دے کر جگہوں کی نشاندھی کرنا۔ البتہ اگر ہم "بمپور" کو "کارپلا" (موجودہ کوہ مبارک) اور "سیستان" کے درمیان کہیں تو کتنا بالصواب ہوگا اور شاعر کا قول بھی کتنا صحیح ہوجائے گا اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کیونکہ اگر ہم نقشے کو سامنے رکھیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ "بمپوؔر" کا محل وقوع "کارپلا" (کوہِ مبارک) کے شمال، شمال مشرق اور سیستان کے جنوب میں دونوں کے درمیان ایسی جگہ پر ہے کہ بلحاظ قدیم کاروانی سفری منازل بھی تقریباً نصف فاصلے پر ہے۔

حاصل بحث یہ کہ جن مقامات کے نام شاعر نے "حلبؔ" اور "کلبلا" لکھے ہیں وہ حقیقت میں یہی "البانے" اور "کارپلا" ہیں جو ہر لحاظ سے اس الجھے ہوئے مسئلے کا حل ہیں۔ یہی وہ "البانے ہے جو بگڑ کر پہلے "البا" بنا اور پھر "البا" سے "اَلب" اور آخر میں "اَلب"۔ اسی طرح یہ وہی "کارپلاؔ" ہے جو ایک دفعہ "کرپلا" بن کر آخر میں کربلا بن گیا..... جس کو بلوچوں کے کچھ لہجوں میں "کلبلا" بھی

کہتے ہیں۔ اب ہم ان مصرعوں کی تصحیح یوں کرتے ہیں ؎

از اَلبّا پاد کائیں گوں یزیداں جیڑوین
کرَبلا، بمپور ماں نیام ءِ شہر سیستان منزلیں

یعنی "اَلبّا (البانے) سے ہم اُٹھے ہیں اور یزید نما دشمنوں سے ہماری لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور ہجرت کرکے کربلا (کاربلّا یا موجودہ کوہ مبارک) گئے اور بمپور کے درمیانی علاقے سے گزر کر سیستان پہنچے جو (پہلے ہی سے) ہماری منزل ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیستان بھی ما قبل تاریخ سے ان بلوچوں کا مسکن رہا ہے اور اپنی پہلی ہجرت میں بھی "آرین ویج" سے کئی قبائل یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ جس طرح کہ اس مضمون میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ویسے یہ علاقہ آریا قوم کی پہلی ہجرت سے پہلے بھی ان کا مسکن تھا کیونکہ یہ آرین ویج کے نزدیک تھا اور جہاں بھی "آرین ویج" کے اہم شہروں یا مقامات کا نام آتا ہے تو ان شہروں و مقامات میں وہ علاقے اور مُدن کے نام بھی آتے ہیں جو سیستان کی مملکت میں شامل ہیں۔

آریا قوم کی آبادی جب بڑھتی گئی تو وہ سب سے پہلے گرد و نواح کے زرخیز علاقوں میں پوری طرح چھا گئے۔ جب یہاں کسی صورت ان کے لئے گنجائش نہ رہی یا قبائل میں آپس میں اقتصادی یا دوسری کسی بنیاد پر ان بن ہونے لگی تو اُن کے لئے پھیلنے اور اپنے لئے چراگاہیں ڈھونڈنے کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس پہلی ہجرت والے بلوچوں کو سیستان کا علاقہ بھا گیا اور ویسے بھی ان کے قبائل وہاں موجود تھے۔ سو انہوں نے مشرق کی طرف دوسری آریائی اقوام کے ہمراہ جانے کے بجائے یہاں سیستان ہی میں اپنے باقی بھائیوں کے ہاں رہنا پسند

کیا۔ جیسے کہ بتلایا جا چکا ہے ما قبل تاریخ سے بلوچوں کا یہاں نہ فقط موجود ہونا بلکہ ان کی باقاعدہ ایک مملکت ہونے کے ثبوت کے لئے شاہنامہ فردوسی کے رستم کا وجود کافی ہے۔

فردوسی ایک جگہ رستم کی بہادری اور دلیری و شجاعت کی تعریف کے بعد اچانک یوں گویا ہوتا ہے ؎

منش کردہ ام رستم داستان کہ رستم یلی بود در سیستان

یعنی:۔ میں نے رستم کو رستم داستان بنادیا ہے کہ رستم سیستان کا ایک دلیر جوان مرد تھا۔

اگرچہ " داستان " کے عام معنی قصّے کے ہیں اور " رستم داستان " کے معنی بھی " قصّے کا رستم " ہو سکتا ہے لیکن یہاں " داستان " سے مراد قصّہ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رستم کے باپ کا نام ہی " داستان " تھا جس کو " داستان " اور " دستان " دونوں املا میں لکھتے ہیں۔

فردوسی کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر میں رستم کا ذکر اپنے شاہنامہ میں نہ کرتا تو وہ بھی ما قبل تاریخ کی دوسری تاریخ ساز شخصیتوں کی طرح گمنام رہتا۔ یہ دعوی اگرچہ کسی حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ شاہنامہ ہی ایسی ایک کتاب ہے جس میں رستم کے بارے میں مذکور ہے۔ ویسے ایرانیوں کی بلوچ دشمنی تو ہر لحاظ سے ما قبل تاریخ ہی سے مسلّم ہے اور یہی چیز فردوسی کی رگ رگ میں بھی جاگزین تھی۔ اگر فردوسی کے بس کی بات ہوتی تو وہ رستم کا ذکر تک گوارہ نہ کرتا مگر مجبوری یہ تھی کہ رستم کے ذکر کے بغیر ان ایرانی شاہنشاہوں کا ذکر کرنا اور اس قسم کی تاریخی کتاب مرتّب کرنا قطعی ناممکن ہو جاتا کیونکہ رستم کے ذکر کے بغیر فردوسی اپنے شاہنامے کا دو مصرعہ بھی حقائق پر مبنی نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں شاہنامہ ابتداً جس شخص نے لکھنا شروع کیا تھا وہ

فردوسی نہ تھا۔ وہ قابل شاعر دقیقی ہیں جنہوں نے اس قابلِ قدر کتاب کو لکھنے کا آغاز کیا اور اُسی حقیقت پسند نے اپنا کام ہی رستم کے کارناموں سے شروع کر دیا تھا۔ لیکن موت نے ان کو موقعہ نہ دیا اور وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ گئے۔ بعد میں جب یہ کام فردوسی کے سپرد ہوا تو اس کے لئے رستم کے بارے میں مزید حقائق لکھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فردوسی نے اپنی شرمندگی چھپانے یا اپنے تعصب کے اظہار میں کہا کہ ؎

منش کردہ ام رستم داستانُ !

یہ حقیقت ہے کہ بلوچ نژاد رستم کے ذکر کے بغیر پورے کا پورا شاہنامہ جھوٹ کا پلندہ بن جاتا۔ رستم کی یادگار ایک قلعہ اور ایک بند ابھی تک خود سیستان میں باقی ہے۔

ویسے بھی کیسپین سی یا دریائے مازندراں کے مغرب اور جنوب سے ہجرت کے لئے جنوب ہی کی طرف کا راستہ بہترین تھا۔ کیونکہ یہ راستہ پہلے ہی سے مستعمل تھا جو جنوب کی بندرگاہوں تک پہنچتا تھا۔ اور یہی زیادہ محفوظ ترین راستہ بلوچ قبائل نے اس ہجرت کے لیے اختیار کیا۔ اگرچہ یہ لوگ سیستان کے متعلق باخبر تھے کہ وہاں کی پوری آبادی بلوچ قوم کی ہے لیکن اپنے مویشیوں کے ساتھ اگر سیدھا سیستان کی طرف نکل جاتے تو درمیان میں دشتِ لوٹ (پرانا صحرائی اُرسے یا صحرائی کرمانے) سے ان کو گزرنا پڑتا تھا اور یہ دشت یا صحرا ایک قطعی بے آب و گیاہ نمک زار ہے جو یقیناً اُس زمانے میں ناقابلِ عبور تھا اور یہ صحرا آج تک دشتِ لوٹ اور نمکزار کے نام سے باقی ہے اور آج تک غیر آباد ہے۔

اگر یہ لوگ مشرق کی طرف جاتے تو لامحالہ ان کو ایک دفعہ مشہد جانا پڑتا تھا اور پھر مشہد سے دوبارہ جنوب کی طرف مڑ کر سیستان کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ مشہد

سے سیستان کا راستہ ہمارے اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی اتنا آباد نہیں تو اس دور میں اس کی حالت کیا ہوتی ہوگی۔ یعنی یہ راستہ اس زمانے میں خود اپنی جگہ پر ایک دشت لوت تھا۔ دوسری طرف جنوب کا راستہ ایران کے قدیم شہروں کا آباد اور محفوظ ترین راستہ تھا اور ابھی تک ہے۔ یعنی موجودہ آستان (صوبہ) تہران سے گزر کر آستان اصفہان، آستان فارس سے گزرتے ہوئے آستان کرمان پہنچ گئے۔ دوسرے الفاظ میں قزوین، سادہ، تفرش، اراک، محلات، گلپایگان فریدن، شہرضا، آبادہ، شیراز، نی ریز، سیرجان، رفسنجان، جیسے آباد شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے کرمان پہنچ گئے۔ کچھ قبائل نے تو کرمان ہی کو اپنا مرکز بنایا اور کچھ اور قبائل مزید جنوب کی طرف بندر آزاد (موجودہ بندر عباس) اور میناب پہنچ کر بندر لنگہ سے لے کر مشرق کی طرف بندر لنگہ، بندر آزاد، کاریلا (موجودہ کوہ مبارک) بندر جاسک، جگین اور رکیر ہیر تک پھیل گئے۔

اس ہجرت کا ثبوت آج تک موجود ہے۔ یعنی جنوب ایران میں بندر لنگہ اور بندر آزاد سے لے کر مشرق میں ساری بندرگاہوں کی آج بھی پوری آبادی بلوچوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح شہر کرمان سے جنوب اور مشرق اور نمک زار کے مشرق کے سارے علاقوں میں آج تک بلوچ آبادی ہے ۔ اور یہ سارا علاقہ آج کل ایران میں شامل ہے جس کو ہم متحدہ بلوچستان کا مغربی حصہ کہتے ہیں اور حقیقت میں بھی سارے کا سارا علاقہ ایرانی بلوچستان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایرانی حکومت نے غیر فطری سیاسی تقسیم کے ذریعے اسی ایرانی بلوچستان کے مغربی حصوں کو کاٹ کاٹ کر دوسرے صوبوں سے ملایا، یا علیحدہ فرمانداریاں قائم کیں۔ جس کا مقصد صرف بلوچوں کے اتحاد کو توڑ کر ان کو کمزور بنانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اسی ایرانی بلوچستان کا ساحلی علاقہ بندر لنگہ سے شروع ہوکر گوتر تک چلا جاتا

ہے جہاں اس کی سرحدیں پاکستانی بلوچستان کی بندرگاہ جیونی سے ملی ہوئی ہیں۔
اور پھر یہاں سے متصل پاکستانی بلوچستان کی بندرگاہ جیونی سے لے کر مشرق میں
کراچی کے قریب حب تک کا سارا ساحلی علاقہ بلوچستان کا ساحلی علاقہ ہے۔
پاکستانی اور ایرانی دونوں بلوچستانوں کے ساحلی علاقے ابھی تک سواحلِ
مکران کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اور یہ نام ان پر ازمنۂ قدیم سے منطبق
ہے۔

اس مختصر تشریح کے بعد ہم دوبارہ اپنے موضوع کی طرف لوٹ کر کہتے ہیں
کہ ایسی ہی پرانی منظومات میں "آلیب" اور "کرپلا" جیسے ناموں کو غلط
صورت دے کر "حلب" اور "کربلا" کے معنوں میں لینے کی وجہ سے یہ
غلط رائے قائم کر لی گئی ہے کہ بلوچ اصل میں "قریش" ہیں۔ اور پھر اپنے ان غلط
فیصلوں کو صحیح منوانے کے لئے عجیب و غریب بے نتیجہ تاویلات سے تاریخ کو
مسخ کر کے اس آرین نژاد قوم بلوچ کو اس سے قطعی متضاد سامی نسل عربوں سے
زبردستی گانٹھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مضحک کام میں سب سے بڑا ہاتھ دو قسم کے لوگوں کا تھا۔ اوّل تو وہ جو
مذہبی عقیدے میں دیوانگی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اور دوسرے وہ جو اپنی قوم
کی موجودہ حالت دیکھ کر احساسِ کمتری میں گرفتار ہو چکے تھے اور ان کے خیال میں
بلوچوں کو عرب ثابت کرنے سے اُن کا قومی وقار بڑھ جائے گا۔ علاوہ ازیں کچھ اور
لوگوں نے بعد میں محض سیاسی نکتہ نظر سے بلوچوں کو سامی نسل ثابت کرنے کی اس
وجہ سے کوشش کی تاکہ عرب دنیا کو اس سلسلے میں اعانت کے لئے اُبھار سکیں جو
واقعی قابلِ افسوس فعل ہے۔

ان تمام حقائق کے پیشِ نظر ہم یہی کہیں گے کہ یہی الفاظ "قریش"، حلب

یزّید، کربلا "حقیقت میں وہی "کُرشں، البانے، یزّد (یزیدنما) اور کارپلا" ہی ہیں۔
اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بلوچ طائفے جو بلوچستان سے باہر ایران کے جنوب میں
"کُرشں" کے نام سے جانے جاتے ہیں یقیناً ھخامنشی شاہنشاہ کوروش کبیر ہی کے خاندان کے
بچے کھچے حصے ہیں۔ ایران میں ان قبائل کے سوا ہم کسی اور ایرانی قبیلے کو "کُرشں"
کے نام سے نہیں جانتے۔ یا کم از کم ہمارے علم میں ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں آئی
ہے۔ اب اس سے زیادہ فخر کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ فردوسی کے شاہنامہ کا رستم
تاج بخش سیستانی بلوچ نژاد اور سیستان کا خود مختار حکمران تھا جو ہمیشہ سلطنتیں
فتح کر کے ایرانی شاہنشاہوں کو سونپتا تھا۔ اس سے بھی قابلِ فخر بات یہ ہے کہ آج
سے دو ہزار پانسو (۲۵۰۰) سال قبل ایرانی شاہنشاہیت کی حقیقی اور غیر متزلزل
بنیاد رکھنے والا کوروش کبیر بھی بلوچ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان بلوچ ھخامنشی
شاہنشاہوں نے جو کتبے اور نوشتے یادگاری طور پر لکھوائے ہیں اور ان میں دوسری
زبانوں کی بہ نسبت بلوچی زبان کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ان کے جملات
کی تراکیب قطعی بلوچی ہیں۔

اب ضروری تو یہی تھا کہ بلوچی زبان ایران میں بلوچ ھخامنشی شاہنشاہوں کے
زمانے سے مسلسل مدارج طے کرتی ہوئی ہم تک پہنچ جاتی۔ مگر ایسا نہ ہونا کوئی حیرت کی
بات نہیں ہے کیونکہ ان شاہنشاہوں کی حکومت کے انقراض کے بعد تو خود بلوچ قوم
کے لئے بھی وہاں عرصۂ حیات تنگ ہو کر رہ گیا اور پھر آخر میں نوشیروان نے قومی حماسہ
اور کوروش کے انقلاب کے طور پر اپنے نظریئے کے مطابق بلوچوں کا قلع قمع کر دیا،
جس کے نتیجے کا قصہ فردوسی نے یوں کیا ہے کہ ؎

بلوچ نماند آشکار و نہاں

یعنی ایک بلوچ بھی ظاہر یا چھپا ہوا باقی نہیں بچا۔ یہ تو خیر نوشیروان اور فردوسی

کی ڈھینگ تھی[1]۔ ورنہ مازندراں اور گیلان میں بھی بلوچوں کی بھاری آبادی آج تک موجود ہے۔ بلکہ حقیقت وہی ہے جو ہم نے پہلے ہی بتائی۔ البتہ یہ ضرور ہو گیا کہ بلوچوں کے لئے سکون سے رہنا مشکل ہو گیا۔ اور ان کو جبراً شہری زندگی اختیار کرنی پڑی اور کئی ایک قبائل تو بالکل "کرش" وغیرہ قبیلوں کی طرح اپنے قبائلی نام سے مشہور ہو گئے چونکہ نوشیروان عسکری نکتۂ نظر سے بلوچوں کو نیست و نابود کرنے میں بالکل ناکام ہو گئے تو انہوں نے ان سے صلح صفائی کرنے کے بعد سیاسی صورت میں انتقام لینے کی ٹھان لی اور آہستہ آہستہ مازندراں میں غیر بلوچ اقوام کو بھاری اکثریت میں لا کر آباد کرانا شروع کر دیا اور اس دوسری صورت میں کسی حد تک اپنی شکست کی شرمندگی دور کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

جیسے کہ ذکر ہوا ہے کہ کیسپین سی کے جنوبی کنارے دو صوبے مازندران اور گیلان ہیں۔ مازندراں کے بارے میں بھی مختصراً کہا جا چکا ہے کہ مازندران تو بہرحال بلوچوں کا گڑھ ہی تھا اور کوہ البرز ان کے لئے ہمالیہ کا کام دیتا تھا اور پھر البرز ہی کے پہاڑوں کو وہ اپنا قلعہ سمجھتے تھے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہی مازندراں کا دوسرا نام طبرستان ہے۔ اس کی صحیح اِملا "تبرستان" ہے۔ اور یہ تبرستان کا نام بھی فارسی بولنے والوں نے اس علاقے پر اس لئے رکھ دیا تھا کہ یہاں بلوچوں کا عام ہتھیار جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا تھا وہ تھا "تبر زین" یا فارسی کا "تبر زین" - یہ ایک لمبے دستے

---

[1] دور کیوں جائیے اسی داستان کے آخر میں خود فردوسی شاہنامے میں لکھتا ہے کہ نوشیروان کی فتح کے بعد بلوچوں کا ایک لشکر پہاڑوں سے اتر کر نوشیروان کو سلام کرتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے کہہ چکا تھا کہ ؎ بلوچے نہ ماند آشکار و نہاں۔

والی چوڑے پل کی کلہاڑی ہوتی تھی۔ بلوچ جہاں کہیں بھی جاتے تو ان کے ساتھ تھی۔ اس کی نشانی آج تک سندھ میں بلوچوں کے ہاں ملتی ہے۔ جب ایرانیوں نے دیکھا کہ یہ بلوچ ہر وقت "تبرزین" اٹھائے ہوئے ہیں۔ تو اسی "تبر" کی مناسبت سے اس علاقے کو "تبرستان" کہا جانے لگا۔ جس کو عربوں نے "طبرستان" لکھنا شروع کردیا اب لطف یہ ہے کہ مازندران کے لوگ اپنے آپ کو خود "گیل" یا "گیلک" کہتے ہیں۔ اور اپنی بلوچی بولی کو "گیلکی"۔ ویسے ایران کے مرکز تہران کے قریب ہونے کی وجہ سے اور شاہانِ ایران کے پروگرام کے مطابق حتی الامکان ان بلوچوں کو اپنی تاریخ و زبان سے ناآشنا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ فارسی زبان کے سوا کوئی اور زبان پڑھانا قدغن کیا گیا۔ اور وہ تمام راستے مسدود کردیئے گئے جن کے ذرائع سے یہ بلوچ اپنی تاریخ اور زبان سے متعلق رہ سکتے تھے۔ انہی پروگرام کے تحت ان کے اس علاقے کا نام تبدیل کرکے "طبرستان" اور اس قوم کو بلوچ کے بجائے "گیل" یا "گیلک" کے نام سے مشہور کیا گیا اور ان کی زبان کو بھی "بلوچی" کے بجائے "گیلکی" کا نام دے دیا گیا۔

اس طرح سے شاہنشاہ نوشیروان کو بلوچ کا نام نہ سن کر ایک قسم کی روحانی تسکین ملتی تھی کہ یہاں کوئی بلوچ نہیں ہے۔ ویسے بھی اس طرح سے وہ اپنی شکست کو بھی فتح منوانے کی دلیل پیش کرسکتے۔ اور بعد کے شاہنشاہوں نے بھی اسی پروگرام پر چلنا شروع کردیا۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود "گیلکی" زبان کے کچھ پرانے اشعار ہاتھ لگے ہیں۔ جن سے آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس وقت "بلوچی" زبان کی شکل آج کی بلوچی سے کسی قدر مختلف تو تھی لیکن اس کا پڑھنا سمجھنا کسی بلوچ ماہر لسان کے لئے کوئی خاص دشواری پیدا نہیں کرتی ہے۔ اسی مازندران سے متصل "گیلان" کا علاقہ ہے۔ گیلان کے لوگ بھی

اصل میں بلوچ ہی ہیں۔ یہ وہی "گیلان" ہے جہاں کے گیلانی بلوچوں نے اپنے بھائی مازندرانی بلوچوں کی کھل کر مدد کی جس کا ذکر فردوسی نے بھی کیا تھا۔ اور شاہان ایران "گیلان" کے بلوچوں سے بھی نالاں تھے۔ کیوں نہیں۔ دراصل یہ دونوں صوبوں کے رہنے والے بلوچ ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مازندران کے لوگ اپنے آپ کو "گیل" یا گیلک" کہتے ہیں اور انہی گیل قبائل کی نسبت سے گیلان کا نام رکھا گیا ہے۔

"گیلان" گیل کی جمع ہے۔ بلوچوں نے اکثر علاقوں کے نام ایسے رکھے ہوئے ہیں۔" مثلاً کرگان، بورکاں" وغیرہ۔ مطلب یہ کہ مازندران اور گیلان دونوں صوبوں کی اصل آبادی بلوچوں پر مشتمل تھی اور آج بھی وہاں بلوچوں کی بھاری تعداد موجود ہے۔ جیسے کہ ذکر ہو چکا ہے یہی وہ علاقے ہیں جہاں ایران عہد عتیق کی تاریخ شاہنامہ فردوسی کے مطابق دیو رہتے تھے اور جن کے مقابلے کے لئے ایرانی شاہنشاہ ہمیشہ بلوچ نژاد رستم سیستانی کے پاؤں پڑتے تھے۔ یہ دیو وہی قوی ہیکل بلوچ ہی تھے جن سے ہر ایرانی شاہنشاہ خائف و لرزاں تھا۔ ایرانی قوم اپنی بہادری اور جنگجوی پر بہت اتراتی ہے۔ جب وہ ان مازندرانی بلوچوں کے سامنے بے بس ہو گئے تو اپنی لاج رکھنے کے لئے یہ من گھڑت بات بنائی کہ یہ مازندرانی بلوچ دوسرے لوگوں کی طرح انسان نہیں بلکہ دیو ہیں جن پر ان کا کوئی بس نہیں چلتا۔ ورنہ انسانی ذات سے نپٹنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ رستم بھی آخر کو انسان ہی تھا جو اپنے جیسے دوسرے بلوچ ساتھیوں کو لے کر ان ہی دیوزادوں پر چڑھ دوڑتا تھا۔

نوشیروان نے بعد میں اپنی سیاسی حکمت عملی سے ان علاقوں میں ایران کے غیر بلوچ نژاد اقوام کو آباد کیا۔ (اس سلسلے میں مزید تحقیقات کی ضرورت ہے)

اگرچہ ایرانی محققین نے باستان شناسی پر کافی کام کیا ہے مگر ایرانی حکومت ایسی چیزوں کو ہمیشہ دباتی رہی ہے۔ تاکہ دنیا کو یہاں کے بلوچوں اور خود باقی دنیا کے بلوچوں کو یہ حقائق معلوم نہ ہوں۔ اگر کسی نے مازندرانی شاعر نیما یوشیج کا فارسی کلام دیکھا ہے تو اس کو اندازہ ہوگا کہ اس کی فارسی زبان میں بلوچی کے پرانے الفاظ کس طرح مستعمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ مازندران اور گیلان دونوں بلوچی صوبہ ہیں۔ وہی بلوچ ہیں جو مازندران میں گیل یا گیلک ہیں۔ پھر گیلان میں گیلانی ہیں۔ ان پر اپنے آپ کو بلوچ نہ کہنے کا قدغن تو نوشیروان نے ہی لگایا تھا تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ اس شیردل بادشاہ نے واقعی بلوچوں کا قلع قمع کردیا ہے۔ اور دوسری طرف اس نام کو نہ سُن کر وہ روحانی راحت محسوس کرتا تھا۔

ممکن ہے یہ بات ہمارے پڑھنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دے۔ لیکن یہ ایرانی شاہنشاہوں کی فطرت میں ہے جس کی مثال ہمیں موجودہ دور میں مل رہی ہے موجودہ شاہنشاہِ ایران کے والد رضا شاہ پہلوی نے جب ایران کا تخت و تاج احمد شاہ قاچار سے چھین لیا تو نوشیروان کے نقش قدم پر چل کر مغربی بلوچستان کی آزاد بلوچ ریاستوں کا تاخت و تاراج شروع کردیا اور فوجی طاقت اور قتل و غارت کے ذریعے زبردستی ان کو اپنی شاہنشاہیت میں شامل کردیا حالانکہ یہ بلوچ آزاد ریاستیں تھیں اور ان کے تاراج کرنے کا جواز یہ دکھایا کہ کسی زمانے میں یہ علاقہ ایرانی شاہنشاہیت میں شامل تھا۔ اگر اس طرح کوئی حکومت اپنی قدیم تاریخ کی رو سے ان تمام ممالک کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے جو کسی زمانے میں اس کے ماتحت تھے تو ایک بار پھر دنیا کا نقشہ یکسر بدلنا پڑے گا اور کئی ایک اچھی خاصی مملکتیں صفحہ ہستی سے مٹادی جائیں گی۔

ان بلوچی آزاد ریاستوں پر یلغار اور زبردستی قبضہ کے بعد رضا شاہ پہلوی نے یہ حکم صادر فرمایا کہ اسی بلوچستان میں بھی ایران کے قوانین کے مطابق شناس نامہ (IDENTITY CARD) کا اجراء عمل میں لایا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ زبانی فرمان بھی جاری ہوا کہ حتیٰ الامکان یہی کوشش کی جائے کہ ان شناختی کارڈوں میں بھی کسی بھی بلوچ کے خاندان، قبیلے یا قومیت کے نام کے اندراج سے پرہیز کیا جائے۔ اس سلسلے میں کچھ سمجھدار بلوچوں نے اس چال کو سمجھ کر اپنے خاندانی یا قبائلی نام کے اندراج پر اصرار کیا۔ لیکن عوام اس چیز سے ناواقف تھے اور ان ایرانیوں نے ان کے خاندان یا قبائلی نام کے بجائے اپنی طرف سے ایرانی خاندانوں کے نام یا کوئی اور من گھڑت نام ان کے لئے تجویز کر کے ان شناس ناموں میں لکھ دیئے۔ جس کا ثبوت آج تک موجود ہے۔ علاوہ ازیں کسی بھی ایک بلوچ کے شناس نامے میں اس کی قومیت کا نام قطعی نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ بھی اسی بلوچ دشمنی کے مظاہرے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ علاوہ ازیں کئی ایک قبائل کے اجدادی نام تک محض اس لئے زبردستی تبدیل کروائے کہ اس قبیلے نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کی خاطر شاہی افواج سے ٹکر لی تھی۔ اس کی تازہ اور زندہ مثال بلوچ قبیلہ "اسماعیل زئی" کی ہے۔ چونکہ اس قبیلے نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی اور جب اس قبیلے کو زبردستی زیر کر لیا گیا تو شاہی فرمان کے تحت اس کا نام قدغن اور نیا نام "شاہ بخش" رکھا گیا۔ جس کو ایران کے شاہنشاہ کی بلوچ دشمنی اور تادیبی کاروائی کی بدترین مثال کہہ سکتے ہیں۔

اس لئے ہم یہ کہنے پر حق بجانب ہیں کہ یہ چیز ایرانیوں کی فطرت میں ہے اور فطرت کا بدلنا مشکل ہے۔ تو اسی طرح مازندران اور گیلان کے بلوچوں پر بھی نوشیروان نے اپنی کاروائی کے بعد یہی قدغن لگا دی تھی کہ آئندہ یہاں

کے بلوچ اپنے آپ کو بلوچ نہ کہیں بلکہ علاقائی نام "مازندرانی" اور "گیلانی" کہیں اور یہی مازندرانی بعد میں "طبری" بھی ہوا۔ اور "گیل" قوم وہی بلوچی کا "بیلّ" ہے۔ بلوچی میں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں جن کے ابتدائی حرف اسی طرح تبدیل ہوتے ہیں۔ مثلاً "بیست" (بیس[20]) کو بلوچ "گیست" بھی کہتے ہیں یہ "گیل" قبائل بلوچوں کے "بیلّ" قبائل ہے۔ بلوچی میں "بیلّ" ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ریوڑ پالتے ہیں۔ اور خصوصاً جن کے پاس اونٹ کے ریوڑ ہوں۔

علماء کی تحقیق کے مطابق تیسری صدی ہجری سے "کوچ" اور "بلوچ" کے نام اکٹھے لئے جا رہے ہیں۔ تمام مسلمان تواریخ نگاروں نے ان کو دو مختلف قوم بتا کر ایک دوسرے کا جانی دشمن بنایا ہے۔ فردوسی نے سیاوش کی سرکردگی میں بارہ ہزار کی ایک جرار فوج کا ذکر کیا ہے جو افراسیاب سے لڑنے کے لئے بھیج دی گئی تھی اور اسی فوج میں اس نے "کوچ و بلوچ" کے ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ کوچ اور بلوچ کو اشکش کے ساتھ بھی بتایا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم فردوسی کے ان اشعار کو یہاں درج کریں بہتر یہی ہوگا کہ ہم "کوچ" لفظ کے بارے میں بھی ذرا وضاحت کریں کیونکہ انہی اشعار میں کوچ کا نام بھی آتا ہے۔ اور یہ لفظ "کوچ" بھی ایک متنازعہ فیہ لفظ ہے۔ مورخین نے اس کوچ کو بھی ایک علیحدہ قوم منوانے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے اس کو "کرد" تو کسی نے "ترک" تو کسی دوسرے نے نہ جانے کیا منوانے کی جہد کی ہے۔ مگر سب لاحاصل ثابت ہوا۔ کیونکہ کسی چیز کو زبردستی منوانے کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "کوچ و بلوچ" دو مختلف قومیں نہیں ہیں۔ کیونکہ "کوچ" کا نام ہمیشہ "بلوچ" کے ساتھ آتا ہے۔ چونکہ شروع ہی سے یہ لوگ صحرانشین

اور خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ان کے نام کے ساتھ "کوچ" کا لفظ جوڑدیا گیا ہے۔ "کوچ بلوچ" کے معنی "خانہ بدوش بلوچ یا دیہاتی بلوچ" کیونکہ "کوچ" کے معنی ہی یہی ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ بلوچوں کے قبائل کے کافی لوگوں نے ایرانی شاہنشاہوں کی مسلح افواج میں بھرتی ہو کر شہری زندگی اپنائی تھی اور شہری بلوچ بن گئے تھے۔ اس لئے ان شہری بلوچوں اور صحرانشینوں میں فرق رکھنے کے لئے ان کے نام کے ساتھ "کوچ" کا لفظ بڑھایا گیا تاکہ شہری اور بادیہ نشین بلوچوں میں فرق نمایاں ہوسکے۔ حتیٰ کہ پشتون (پٹھان) اقوام میں ایک قبیلہ "کوچ" یا "کوچی" کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ اُن کی زندگی "خانہ بدوشانہ" ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں بھی "کوچ" کے وہی معنی ہیں جو بلوچی زبان میں ہے۔ اسی طرح یہ لفظ "کوچ" بلوچی زبان میں بھی دیہات کے معنوں میں آتا ہے۔ اور کئی ایسی دیہاتی جگہوں کے نام "کوچہ" یا "کوچو" ہے۔ دراصل یہ "کوچ و بلوچ" کے معنی ہی دیہاتی اور صحرانشین بلوچ کے ہیں۔ جو کثرتِ استعمال سے لوگوں نے ان کو دو قومیتوں کا نام سمجھ کر "و" عطف درمیان میں استعمال کرنا شروع کردیا اور "کوچ و بلوچ" ہوگیا۔ اب ہم فردوسی کے شاہنامے سے کچھ ضروری اشعار یہاں نقل کرتے ہیں۔ فردوسی کہتا ہے ؎

سپاھے زِ گُردان کوچ و بلوچ
سگالیدۂ جنگ مانندِ قوچ

پھر کہتا ہے ؎

ھمے رفت و آگاھی آمد بہ شاہ
کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ

اوپر دو مصرعوں میں "کوچ و بلوچ" کہا ہے۔ لیکن بعد میں صرف یہی

لکھا ہے کہ ؎

گشت از بلوچی جہانے تباہ

جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ "کوچ و بلوچ" ایک ہی ہیں ورنہ فردوسی ضرور یہ لکھتے کہ ؎

زِ کوچ و بلوچ شد جہانے تباہ یا
ز کوچ و بلوچ جہان شد تباہ

پھر آگے چل کر کہتا ہے ؎

ز گیلان تباہی فزون است ازین

یعنی گیلوں کی وجہ سے تباہی اور زیادہ پچ گئی ہے۔ مطلب یہ کہ بلوچوں کے قبیلۂ "گیل" (بیل) نے اور زیادہ تباہی مچا رکھی ہے۔ جی ہاں "گیلان" کا لفظ "گیل" ہی کی جمع ہے۔ اور بلوچ قوم کا ایک قبیلہ ہے۔ مثلاً "مازندران" کے لوگ بھی قبائلی نام سے اپنے آپ کو "گیل" کہتے ہیں اور "گیل" یا "گیلک" ہی کی نسبت اپنی بولی کو "گیلکی" بتاتے ہیں۔ حالانکہ آج "گیلان" اور "مازندران" دو مختلف مجاور ایرانی صوبے ہیں۔ لیکن حقیقت میں بلوچ قوم ازمنۂ قدیم سے ان دونوں علاقوں میں آباد ہیں۔ یہ تو شاہنشاہی جبر و اکراہ کا ماحصل ہے کہ ایک قوم کو جو ایک ہی زبان حتیٰ کہ ایک ہی عقیدۂ مذہبی رکھتی ہے اس کی سرزمین کو زبردستی دو حصوں میں تقسیم کرکے اس کے اتحاد، اتفاق، قومی یکجہتی اور زور و نیرو کو ختم کرنے کا پروگرام بنایا جائے۔

نوشیروان نے اسی نظریئے پر عمل کرکے بلوچوں کے اس سرزمین یا وطن کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس سے پہلے یقیناً کوئی ایسی تقسیم وجود نہیں رکھتی تھی۔ اور "گیلان" محض قبائلی نام ہی تھا یا زیادہ سے زیادہ "گیل" قبائل کا خاص علاقہ۔

ورنہ بزعم خود بلوچوں کی تباھی کے بعد "گیلان" اگر کوئی قوم ہوتا تو اس کے خلاف بھی نوشیروان اپنا وہی "عدل" روا رکھتا۔ اسی طرز عمل پر چل کر موجودہ صدی میں بھی ایرانی بلوچستان کو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے بلوچ اقوام کو کمزور کرنے کا نظریہ اپنایا گیا ہے۔ چنانچہ ایرانی بلوچستان میں لنگہ، بندر عباس، میناب، گیابان، بشکرد اور کرمان کے خاص فوجی علاقوں کو ان کے صوبے بلوچستان سے علیحدہ کر کے فرمانداریاں بنادی گئی ہیں۔ اور اس سے بھی بڑی مثال ایرانی، پاکستانی، افغانی اور روسی بلوچستان کی ہے۔ جو سیاست کا گرگِ باراں دیدہ برطانیہ عظمیٰ کی حکمتِ عملی کا شاہکار ہے۔

فردوسی پھر کہتا ہے ؎

زکار بلوچ، ارجمند اردشیر
بکوشید، با کار دانانِ خویش

یعنی بلوچ قوم کے مشکلہ کو حل کرنے کے لئے اردشیر نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا۔

پھر ایک اور شعر ہے ؎

زگفتارِ دھقان آشفتہ شاہ
بسوی بلوچ اندر آمد زراہ!

اس کے بعد قتل وغارت گری کا حکم جاری کرنے میں نوشیرواں نے بزدلی اور ظالمی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ فرمان صادر فرمایا جو قابلِ غور ہے۔ کیونکہ اس میں بلوچوں کے متعلق ایرانی فطرت کی عکاسی ہے ؎

کہ ہرگز بلوچے بیابند خورد
چہ از تیغ دارانِ مردان گرد

دگر انجمن باشد از اندکی!
نباید کہ باید رہائی یکی!

چو آگاہ شد لشکر از خشم شاہ
سوار و پیادہ بہ بستند راہ

ازایشاں فراواں و اندک نماند — زن و مرد جنگی وکودک نماند
سراسر بہ شمشیر بگزاشتند — ستم کردن کوچ برداشتند
شد ایمن از رنج ایشاں جہاں — بلوچی نماند آشکار و نہاں

واہ واہ فردوسی اپنے اس عادل شاہنشاہ کا یہ فرمان کس قدر فخر یہ لکھ رہا ہے۔ آج تک دنیا کے کسی قسم کے شاعر مورخ، عالم فاضل اور ادیب عالم شخص نے اپنی قوم کی فطرت کی عکاسی اس قدر بے باکی اور دلیری سے کرنے کی جرأت نہیں کی۔ یعنی یہ حضرت بلوچ دشمنی کے سلسلے میں اس قدر اندھا ہو گیا کہ اس نے بقول فارسی کے بالکل "پوست کندہ" اپنی قوم، اپنا نظریہ، اپنا عقیدہ اور اپنے عادل شاہنشاہ کے بارے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا۔ کوئی یہ بتا دے کہ اس وقت کی عظیم ترین قوم کے عادل ترین شاہنشاہ کا عدل یہی ہے کہ وہ اپنی شاہنشاہی مسلح افواج کو ایک خانہ بدوش، صحرانشین قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جمع کر کے ان کو قتل عام کا حکم یوں سناتا ہے کہ "ان بلوچوں کی عورتوں اور بچوں تک کو تہ تیغ کر ڈالو" ؎

کہ ہرگز بلوچے بیا بند خورد — چہ از تیغ داران مردانِ گُرد
وگر انجمن باشد از اندکی! — نبایدکہ باید رہائی یکی

"یعنی ایسے قتل عام کرو کہ کوئی بھی فرد بلوچ ملے چاہے وہ کوئی بچہ ہو یا ملٹری کا مسلح جوان۔ چاہے جماعت ہو یا کم، یعنی بہت کم ہوں یا تھوڑے۔ لیکن کوئی بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ یہ دنیا کے عظیم ترین شاہنشاہ کا حکم ہے۔

پھر بقولِ فردوسی اس "عادلانہ" اور "قابلِ احترام" حکم کی یوں تعمیل کی جاتی ہے ؎

ازایشاں فراواں و اندک نماند — زن و مرد جنگی و کودک نماند

سراسر بشمشیر بگزاشتند   ستم کردن کوچ برداشتند

یعنی ان بلوچوں میں سے زیادہ یا کم کوئی باقی نہیں بچا۔ کوئی عورت، لڑنے والا مرد حتیٰ کہ کوئی بچہ بھی باقی نہیں بچا۔ بلکہ ان سب کے سب کو تہ تیغ کر دیا گیا اور کوچ کے ظلم کی بیخ کنی ہو گئی۔

ہم فردوسی جیسے مستند مورخ، عالم متبحر اور شناور دریای سخن کو داد تحسین دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اس نے اپنی قابلیت کو بے دھڑک اور بغیر دوغلے پن کے صاف صاف الفاظ میں واضح طور پر استعمال کر کے پوست کندہ اور حقیقت پسندانہ طریقے پر اپنی قوم اور شاہنشاہوں کی فطرت کی صحیح عکاسی کر کے نوشیروان ثانی سلطان محمود غزنوی جیسے بلوچ دشمن کے کلیجے کو بھی ٹھنڈک بخشی۔

یہ تو فردوسی اور اس کے عادل شاہنشاہ کی فطرت کی کہانی تھی۔ اب دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کے مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "گیلان اور کوچ" بلوچ کے علاوہ کوئی اور قوم نہیں ہیں۔ بلکہ گیلان کا نام لے کر وہ "بلوچ گیل" قبیلہ کے بارے میں جانتے تھے کہ یہ قبیلہ باقی بلوچ قبائل سے بھی زیادہ غارت گر ہے۔ اسی طرح "کوچ" کے لفظ سے مراد بلکہ حقیقت میں بھی "بلوچ" ہی ہے۔ اور جہاں جو لفظ شعر میں صحیح بیٹھا مستعمل ہوا۔

"ستم کردن کوچ برداشتند" میں اگرچہ "کوچ" بلوچ سے کوئی مختلف قوم ہوتی تو اس کے بعد ایک آدھ مصرعے میں "بلوچ" کے بارے میں بھی اسی کے ساتھ ہی ذکر کر کے یہی کہتا کہ "کوچ اور بلوچ اور گیلان" سب کی غارت گری ختم کر دی گئی۔ پھر فردوسی جیسے تفصیل نگار شاعر اور قادر الکلام سخن گو کو چند تو کیا بلکہ پچاسوں مصرعے لکھنے میں کوئی تکلیف پیش نہیں آتی۔ اور خصوصاً فردوسی نے تو ہمیشہ ہر واقعہ، ہر داستان اور ہر قصہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے

پھر جن جذبات سے اس نے بلوچوں کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اگر یہ "گیلان اور کوچ" کوئی اور قوم ہوتے تو فردوسی کو ان کی تفصیل میں جانے میں اور بھی مزا آتا۔ کیونکہ جب تک اس کے جذبات ٹھنڈے نہ پڑ جاتے اس کا قلم نہیں رکتا پھر یہ تمام مصرعے قابلِ غور ہیں ؎

کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ
بہ سوی بلوچ اندر آمد ز راہ
کہ ہرگز بلوچی بیا بند خورد

ان تمام مصرعوں میں ہر جگہ "بلوچ" ہی کا لفظ مستعمل ہے۔ اگر "گیلان اور کوچ" کوئی اور قوم ہوتے تو فردوسی کو اس تفصیل میں جانے میں کونسی رکاوٹ در پیش تھی۔ جس تفصیل سے اس نے "بلوچوں" کی تباہی کا منظر پیش کیا ہے۔ وہاں وہ "کوچ اور گیلان" کی بربادی کے لئے چند اور اشعار بڑھانے میں خود بھی فخر محسوس کرتے۔ لیکن "کوچ اور گیلان" جبکہ بلوچ سے علیحدہ کوئی اور قوم نہیں ہیں تو ان کی تباہی کا علیحدہ منظر کشی کرنا حماقت ہو گی۔ اور پھر یہ مصرعے کہ ؎

سراسر بہ شمشیر بگزاشتند
ستم کردن کوچ برداشتند

میں اگرچہ لفظ "کوچ" استعمال کیا گیا ہے مگر یہ فقط شعر کے اوزان برقرار رکھنے کے لئے ہے۔ اس کو کوئی قوم ثابت کرنے کے لئے نہیں۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد یہ دو مصرعے ہیں ؎

بشد ایمن از رنج ایشاں جہان
بلوچی نہ ماند آشکار و نہان

پہلے دو مصرعوں میں بھی کہ " سب کو نہ تیغ کرکے " کوتح " کی غارت گری کا خاتمہ کیا گیا۔ مگر فوراً دوسرے مصرعوں میں نتیجے کا اعلان کرکے کہا ہے کہ " ان کی، یعنی کوتح کے مصائب اور غارت گری سے دنیا کو نجات مل گئی۔ "

لیکن پھر یہ دوسرا مصرعہ کہ ؎ " بلوچی نماند آشکار و نہان " یعنی ظاہر یا چھپا ہوا ایک فردِ بلوتح تک بھی باقی نہ رہا۔ یہاں یہ بھی ثابت ہے کہ " کوتح " اور " بلوتح " بھی دو مختلف قومیں نہیں ہیں۔ اور اسی طرح " گیلان " بھی کوئی اور قوم نہیں ہے ورنہ فردوسی اپنے دل کی بھڑاس نکالنے میں کوئی کوتاہی نہ کرتے ہوئے صاف کہہ دیتے کہ کوتح اور بلوتح اور گیلان اقوام کی غارت گری اور مصائب سے دنیا جہان کو چھٹکارا مل گیا۔ اسی آخری مصرعے میں صرف یہ کہا کہ " ایک بھی فردِ بلوتح باقی نہ رہا۔ " لیکن یہ نہیں کہا کہ ایک بھی " کوتح " یا ایک بھی " گیلان " باقی نہیں رہا۔ کیونکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جبکہ صرف " بلوتح " کہنے سے ہی باقی قبائل " گیل یا گیلانی اور کوتح " وغیرہ خود بخود محسوب و مقصود ہوں گے۔

جی ہاں، اس مصرعے میں " بلوچی " کے معنی " ایک بلوتح " یا " ایک فردِ بلوتح " ہے۔ ایرانی فارسی میں یائے مجہول (ے) نہیں لکھتے اور نہ ہی اس کا مجہول تلفظ کرتے ہیں۔ ان کی کتابت اور تکلم دونوں میں یائے مجہول اور یائے معروف ایک ہی جیسے یائے معروف (ی) مستعمل ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے کے ایک مصرعے میں ؎ " کہ ہرگز بلوچی بیابند خورد۔ " میں بھی " بلوچی " وہی " بلوچے " یعنی ایک بلوتح ہے۔ البتہ اس سے قبل کے مصرعے میں ؎ " کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ۔ " میں یہاں " بلوچی " سے مراد " بلوچیت " ہے۔

مطلب یہ کہ کوتح، بلوتح اور گیل (گیلک، گیلان، گیلانی) سب ایک ہی چیز ہیں اور جس جگہ سے بزعم و قول فردوسی بلوچوں کو نوشیروان نے نکال باہر کر دیا

تھا۔ وہ یہی کوہ البرز اور مازندران ہیں۔ اگرچہ رودسر اور رودبار (موجودہ صوبہ گیلان) کے بلوچ قبائل نے بھی مازندرانی بلوچوں کی دل کھول کر مدد کی تھی۔ مگر چونکہ نوشیروان کا مقصد اعلیٰ سب سے پہلے مازندران کے بلوچوں ہی کو ختم کرنا تھا اور ممکن ہے کہ مازندران کے بعد وہ گیلان کے بلوچوں کا بھی یہی حال کرتا مگر مازندران کی فوجی کارروائی میں نوشیروان کو بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جوں توں کر کے وہ مازندران کے کچھ خاص میدانی ایسے علاقوں میں پہنچ گئے جہاں بلوچوں کے وہ قبائل جو شہری زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کے اہل و عیال اور خاندان امن سے زندگی گزار رہے تھے۔ اور کوہ البرز میں جو بلوچوں نے نوشیروان کی فوج کے برگیڈ کے برگیڈ کا صفایا کر دیا تھا اس کے انتقام میں اندھا ہو کر ان شہروں میں نہتے عورتیں اور بچوں کا قتل عام کر کے پھر فخریہ کہتے ہیں کہ ایک فرد بلوچ باقی نہ رہا۔ یہ تو نوشیروان اور فردوسی دونوں کی ڈھینگ ہے کہ انہوں نے ایک فرد بلوچ بھی باقی زندہ نہیں چھوڑا۔ بلکہ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس شرم انگیز قتل عام کے بعد مازندران کے میدانی علاقے کے تمام بلوچ خاندان کی عورتوں اور بچوں کو اکثر "گیلان" بھیج دیا گیا ہے اور اس کے اس قتل عام کے ملعون فعل کی وجہ سے بلوچوں میں اور زیادہ حماسہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے اور تیار ہو بیٹھے ہیں۔ اس وقت تک فوجی نفری اور ساز و سامان کا جتنا نقصان ہوا تھا اس کا عشر عشیر کا بھی فائدہ نہیں ملا تھا۔ اور پھر کوہ البرز سے بلوچ جنگجوؤں کو نکالنے کے لئے نوشیروان کو عمر خضر کی ضرورت ہو گی یہی وجہ ہے۔ اور اسی لئے اس شیر دل اور عادل شاہنشاہ نے یہ ذلیل وظالمانہ و بزدلانہ حکم صادر کر کے بلوچوں کی عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام کروایا۔ کیونکہ صرف یہی ایک صورت اس کو بلوچوں سے مصالحت کرنے کی سوجھی تھی۔ اور پھر اتنا نقصان اٹھانے اور بلوچوں کی جرأت کے بارے میں عملی صورت میں معلوم کرنے کے بعد اس کو "گیلان"

پر حملہ کرنے کی خواب میں بھی ہمت نہ ہوئی۔

دوسری طرف بلوچوں نے بھی نوشیروان کی صلح کی پیش کش قبول کرلی۔ کیونکہ ان کو یہ یقین تھا کہ بحیثیت ایران کے خودمختار شاہنشاہ، نوشیروان کے پاس ایسے کئی ایک لشکر اور بھی ہیں اور اگر وہ صلح پر راضی نہ ہوجائیں تو نوشیروان اسی ذلیل حرکت یعنی بلوچ عورتوں اور بچوں کے قتلِ عام کو جاری رکھیں گے۔ اور نوشیروان نے بھی بلوچوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کو مزید ڈرانے کی کوشش کی۔ بالآخر صلح ہوگئی۔ اور اس صلح میں گیلان پر حملہ نہ کرنے کے علاوہ مازندران اور گیلان میں غیر بلوچ اقوام کو بسانے کا بھی وعدہ شامل تھا اور اسی طرح بلوچوں کو مرکزی حکومت یعنی نوشیروان کی شاہنشاہیت اور اس کے قوانین تسلیم کرنے ہی تھے۔ حتیٰ کہ اپنے کو "بلوچ قوم" کہنے پر قدغن لگادی گئی۔ ہر بلوچ اپنے خاندانی یا قبائلی نام ہی سے اپنا تعارف کرنے کا مجاز تھا اور اپنا تعارف بحیثیت بلوچ قوم کے فرد کے قابلِ مواخذہ ٹھہرایا گیا۔

فردوسی کا پڑھنے والا ضرور اعتراض کرے گا کہ جب ایک بھی بلوچ فرد بقولِ فردوسی ہی کے باقی نہیں رہا تو یہ صلح نامہ وغیرہ کی بات کیسے درست ہوسکتی ہے۔ مگر سب سے مضحک بات یہ ہے کہ یہی فردوسی پہلے تو بڑے ڈھینگ سے کہتے ہیں کہ ایک فرد بلوچی بھی باقی زندہ نہ رہا۔ مرد، عورت، بچے سب تہ تیغ کردیئے گئے۔ پھر اسی بیان کے آخر میں اچانک اپنی شاعری کے جوش میں کہہ اٹھتا ہے کہ نوشیروان کی فتح کے بعد ایک زبردست لشکر بلوچوں کا البرز پہاڑ سے اتر آیا اور انہوں نے شاہنشاہ نوشیروان کو سلام کیا۔ ایسے ہی موقع پر کہتے ہیں کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔" فردوسی بھول گئے تھے کہ اس نے اس سے پہلے جھوٹ کے کس قدر بڑے پُل باندھے تھے۔

ظاہر ہے کہ نوشیروان کی ان شرائط کو ماننے کے لئے وہ بلوچ قبائل تیار نہ ہوئے ہوں گے جن کو کسی صورت میں اپنی آزاد زندگی سے دست بردار ہونا نہ تھا۔ اور

ان ہی قبائل نے اس کے بعد امن کے زمانے میں آہستہ آہستہ خانذانی صورت میں ایک بار پھر کوچ کا سامان باندھا اور ہر قبیلہ مناسب اور موافق حالات و کوائف سے فائدہ اٹھاکر وہاں سے جنوب کی طرف ہجرت کرتا رہا۔ اور ہر قبیلے نے جہاں جہاں کوئی اچھا مرتع پایا آباد ہوتا گیا۔ اور بڑی مدت تک کرمان، بندر آزاد، کرپلا، گیابان اور لشکر کے علاقوں میں مقیم رہے۔ اور جب یہاں بھی ایرانی شاہنشاہوں نے ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیا تو پہلے ہی کی طرح کچھ قبائل شاہنشاہوں کے فرماں بر و مطیع ہو کر وہیں رہ گئے اور باقی قبائل نے پھر وہاں سے کوچ کیا۔ اور آج تک شہر کرمان کے علاوہ جہاں بلوچوں کی آبادی کم ہے۔ باقی ان تمام علاقوں میں خالص بلوچوں کی آبادی ہے اور بالکل بلوچستان کا حصہ ہیں۔

چاکر یا اس کے والد شیھک جس قبیلے سے متعلق ہیں ان کی ایک اچھی خاصی آبادی ابھی تک ایک پورے علاقے گیابان اور ریناب میں باقی ہے۔ جہاں کے سارے وسیع علاقے کے رہنے والے تقریباً اسی لہجے میں گفتگو کرتے ہیں جس لہجے میں مری بگٹی قبائل بولتے ہیں۔ جس کا علم خود مری بگٹی کے قبائل کے خاص پڑھے لکھے لوگوں تک کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انگریز مستشرقین کی کورانہ تقلید میں اپنی بولی کو بلوچی کی مشرقی بولی کہتے ہیں۔ البتہ ان میں ایک فرق ضرور ہے کہ ان کی زبان میں فارسی کے الفاظ ذرا زیادہ آگئے ہیں جبکہ مری بگٹی کے بولی میں سندھی، پنجابی، سرائیکی اور پشتو الفاظ نے اس کی صورت تک بگاڑ رکھی ہے۔

اگر میں جملۂ معترضہ کے طور پر چند مختصر باتیں کہوں تو مطعون خوانندگاں نہ ہوں گا شیخ عبدالقادر جیلانی جن کا مزار مقدس بغداد (عراق) میں ہے۔ وہ بھی دراصل اسی بلوچ قبیلہ گیل (بیل) اور ان کے ملک "گیلان" سے متعلق ہے اور بلوچوں ہی نے اُن کو پیر دستگیر یا پیرانِ پیر کے القاب سے ملقب کیا ہے۔ ورنہ ایرانیوں

کو نہ شیخ صاحب سے تب کوئی عقیدت تھی نہ اب ہے۔ اور آج دنیا میں ان کے ماننے والوں میں بلوچ قوم کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور ان کا عقیدہ بھی ان کے متعلق سب سے زیادہ راسخ ہے۔ جی ہاں یہ " جیلانی" کا لفظ اصل میں بھی " گیلانی " ہے جو عربوں نے " گ" کو " ج " سے تبدیل کیا ہے۔ کیونکہ اُن کے یعنی عربوں کے ہاں "گ" کا حرف نہیں ہے۔

اس طویل بحث کے بعد ہم دوبارہ بلوچی نثری ادب کی طرف لوٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ گزشتہ دور میں بلوچی شعری ادب کی نسبت بلوچی نثری ادب کی طرف بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے جس کے مدلّل اسباب و علل ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ البتہ انیسویں صدی کے آخر عشرے یا بیسویں صدی کے اوائل (؟) میں بلوچستان کے قصبہ درکان میں ایک عالم مولانا درکانی نے کہتے ہیں کہ دینی تعلیم و تدریس کی خاطر ایک دینی مدرسہ کھولا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بلوچی زبان کے لئے بھی اجتہاد کیا۔ کہتے ہیں کہ اس مکتب یا مدرسہ کی کوششوں سے کوئی پانچ چھ سو چھوٹی موٹی دینی کتابوں کا بلوچی میں ترجمہ کیا گیا اور یہ کتابیں چھاپی بھی گئی ہیں۔ حالانکہ یہ ناقابلِ یقین بات ہے۔ یا ممکن ہے کہ اس میں مبالغہ آمیزی ہو۔ کیونکہ پانچ چھ سو کتابیں شائع کرنا کوئی معمولی یا ایسا ویسا کام نہیں اور نہ ہی یہ قابلِ ایمان ہے کہ ایک ادارہ اتنا بڑا ضخیم کام کرے اور اس بارے میں لوگوں کو صحیح معلوم تک نہ ہو۔ گزشتہ ۲۵ برس میں کم از کم کسی مجلّہ یا جریدے میں اس کے بارے میں کوئی تفصیلی یا تصدیقی بات ہماری نظر سے نہیں گزری اس دوران میں نے لے دے کر ہمیشہ یہی چند جملے لکھے ہوئے دیکھے یا کہتے ہوئے سُنے کہ اس مدرسہ نے پانچ چھ سو سے زائد بلوچی کتابیں طبع و نشر کرائی ہیں۔ اور یہ لکھنے اور بولنے والے بھی دو ایک غیر بلوچ ہیں جن کو بلوچی زبان سے کوئی واقفیت تو نہیں، لیکن اس طرح اتراتے پھرتے ہیں کہ گویا بلوچی زبان ان کی لونڈی باندی ہو۔ اور ظاہر

ہے کہ ان حضرات کی معلومات اور دانستگی تمام تر غیر مستند ذرائع اور من گھڑت باتوں پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ابھی تک اس کے بارے میں مستند ذرائع کی تلاش ہے اور ہم ان محض پراپیگنڈہ کی طرز پر کہی گئی باتوں کو ماننے سے متذبذب ہیں۔ اب نہ جانے اس تعداد کی صحت کہاں تک ہے۔ یا ممکن ہے کہ صفروں کے مبالغہ نے اس تعداد کو پانچ سے پچاس[۵۰] اور پھر پچاس سے پانچ سو تک پہنچا دیا ہو[۵۰۰]۔ اس سلسلے میں ہم مذکور مدرسہ کے ذمہ داروں سے ضرور اپیل کر رہے ہیں کہ ہمیں صحیح معلومات اور تصدیق حاصل کرنے میں مدد فرمائیں۔ کیونکہ اگر واقعی بلوچی زبان پر اتنا کام ہو چکا ہے تو یہ قابلِ صد آفرین ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعداد صحیح ہو مگر ان کی تقسیم و تعمیم کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اس کے گرد و نواح کے علاوہ بلوچستان کے باقی علاقے ان سے بالکل لاعلمی میں رہے۔ اور متحدہ بلوچستان کا ننانوے فی صد اس قابلِ ستائش کام سے قطعی ناآشنا ہے۔ چونکہ خالص دینی نکتۂ نظر سے یہ کام سرانجام پاتا رہا ہے اس لئے صرف ملّا اور مذہبی قسم کے لوگ اس سے آشنا رہے ہوں گے۔ اور شاید اس مکتب کے ارباب خود بھی یہی چاہتے تھے اور اپنے ہی حلقوں میں ان کی تقسیم جائز سمجھتے رہے لیکن ہمارے تعلقات بھی اکثر علماء سے رہے مگر کسی نے ایسی بات برسبیلِ تذکرہ تک نہیں کی اور مجھے اس بات پر سخت افسوس اور دکھ ہے کہ مجھے اس بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکے اور آج تک مذکورہ کتب میں سے ایک کی زیارت کا موقع نہیں ملا۔ مجھے اپنی اس نارسائی اور لاعلمی سے شرمندگی ہے ورنہ ان کتب کا ذکر ضرور کرتا۔ لیکن اس ضمن میں قصور بھی تو میرا نہیں ہے۔ عام طور پر یہی ہوتا رہا ہے کہ کسی کتاب کے چھپ جانے کے بعد کچھ کاپیاں ان لوگوں کے لئے مخصوص طور پر بھیج دی جاتی ہیں جو زبان یا اس کے بارے میں کسی بھی شعبۂ علم سے متعلق کوئی تحقیق و تصنیف، تالیف و تقسیم و تعمیم میں مصروف ہیں۔ لیکن ہمارے مصنف، مولف، ادباء اور شعراء ایسے نہیں ہیں۔ اور

اس سلسلے میں قطعی طور پر لاپرواہی برت رہے ہیں ۔ میں نے خود کئی بار ان سے درخواست کی ہے مگر وہ ہیں کہ تعاون کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں ۔ وہ کس نظریئے کے تحت ایسا کرتے ہیں یہ ہمیں معلوم نہیں ۔ اگر ہمیں جو کچھ گمان ہے تو اس کا اظہار بیکار ہے البتہ میں اس بارے میں یہ کہنے کی جرآت کرتا ہوں کہ میں نے اب تک چھوٹی موٹی کوئی نو کتابیں تصنیف کرکے ان کے طبع نشر کا ذاتی طور پر انتظام کیا ہے اور اپنی دانست کے مطابق ہر متعلق شخص کو کاپیاں بھیجی ہیں ۔ اس کے باوجود وہ لوگ عوضانہ کے طور پر بھی اپنی کتابیں ہم کو نہیں بھیجتے ۔ اس سلسلے میں البتہ بشیر احمد بلوچ ، کریم دشتی اور سردار خان گشکوری ایسے مؤلفین ہیں جنھوں نے ازراہ کرم مجھے اپنی کتابوں کی کاپیاں ضرور مہیا کی تھیں ۔

بلوچی ادب کے اس دورِ جدید (۱۹۵۰ء) سے پہلے کی بلوچی کتابوں میں سے مستشرقین مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز اور مسٹر لیچ کی کچھ کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ۔ یہ کتابیں میں نے پہلی بار ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں دیکھی تھیں ۔ یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہونے والے بلوچی زبان کے پروگراموں سے منسلک رہا ۔

شاید یہ ۱۹۵۳ء کا سال تھا جب کہ ملک کے مشہور ادیب چراغ حسن حسرت بھی ریڈیو پاکستان کے نیشنل پروگرام کے انچارج ہوئے ۔ اور ان کو بلوچی مشہور داستان " دوستین شیرین " کو قومی پروگرام میں پیش کرنے کے سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے مجھے ڈیمز کی کتاب " دی پاپولر پوئٹری آف بلوچز " دکھائی ۔ اس کے بعد مجھے ان کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا ۔ کچھ دنوں بعد حسرت صاحب نے ریڈیو پاکستان کو خیرباد کہا تو میں نے لائبریری سے یہ کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کی تو لائبریرین نے رجسٹر

کھول کر مجھے بتایا کہ چراغ حسن حسرت نے یہ ساری کی ساری بلوچی کتابیں لائبریری سے اپنے نام نکالی ہیں۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ سب ضائع ہوگئی ہیں اُن کا خندہ آور معاوضہ ادا کردیا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ ان نایاب کتابوں سے میں محروم رہا۔

بعد میں ۱۹۵۴ء میں مجھے ڈیمز کی یہی کتاب فریئر ہال لائبریری کراچی سے مل گئی اور لائبریرین نے مجھ پر اتنا احسان کیا کہ باوجود "ری فرنس" کتاب ہونے کے مجھے اِشو کردیا جو میں نے دو ہفتوں کی محنت کے بعد رومن بلوچی سے موجودہ بلوچی رسم الخط میں اُتار دی اور یہی میرے پاس محفوظ ہے۔ کئی سالوں بعد مجھے جب دوبارہ اس کتاب کی ضرورت ہوئی تو اُس زمانے میں میں پرشین گلف کی ریاست بحرین کے سناٹوریم میں زیرِ علاج تھا۔ میری درخواست پر وہاں کے برٹش کونسل لائبریری کے انچارج نے نٹنگم لائبریری (U.K) سے مجھے منگوا کردے دی جو تین ہفتوں کے بعد میں نے واپس کردی۔ اور جب میں دوبارہ کراچی آیا تو فریئر ہال لائبریری سے یہ کتاب بھی کسی صاحب نے غائب کردی تھی۔

۱۹۵۴ء میں جب میں بلوچی زبان کی خاطر بلوچستان کے دَورے پر روانہ ہوا۔ (معلوم ہو کہ یہ اپنی نوعیت کا سب سے پہلا دورہ تھا) تو کوئٹہ میں سنڈیمن لائبریری میں انگریزی مستشرقین کی لکھی رومن بلوچی کی کتابیں کافی تعداد میں موجود تھیں۔ لیکن جب میں ۱۹۶۵ء میں دوبارہ وہاں پہنچا تو یہ تمام کتابیں وہاں سے غائب ہوچکی تھیں اور میں ان کتابوں سے استفادہ نہ کرسکا اور نہ جانے میرے جیسے کتنے لوگ ان کتابوں کو ترستے ہوں گے۔

بائبل سوسائٹی کراچی سے مجھے کچھ بلوچی اناجیل کے نسخے بھی مل گئے

تھے جو اس صدی کے اوائل میں چھپ چکے ہیں ۔ کراچی سے دو ایک ترتیب الصلوٰۃ جیسی مذہبی کتابچے بھی مجھے ۱۹۵۰ء سے پہلے کے چھپے ہوئے دستیاب ہوئے ۔

تقسیم ہند سے پہلے دوسری جنگ جہانی کے دوران کوئٹہ یا بولان سے نشر ہونے والے دو ایک جریدوں میں میں نے کبھی کبھی بلوچی نثر میں مضامین نما چیزیں دیکھی تھیں ۔ اسی طرح ان ہی زمانوں میں کراچی سندھ مدرستہ الاسلام کے ایک سالنامہ (کرانیکل) میں میں نے ایک آدھ بلوچی مضمون چھپا ہوا دیکھا تھا ۔

یہ ہمیں معلوم ہے کہ مغربی علماء یا مستشرقین نے جس طرح بلوچی نظم پر کام کیا تھا اسی حد تک کسی طرح بلوچی نثر پر بھی کام کیا ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ چیزیں ہماری دسترس سے دُور ہیں ۔ مثلاً مسٹر جوزف الفٹن سیٹن نے اپنی تالیف کردہ چھوٹی سی ایک کتاب ۱۹۶۵ء میں مجھے بھیجی تھی ۔ یہ کتابچہ ۱۹۶۱ء میں چھپ چکا تھا ۔ یہ بلوچی زبان میں ایک قصّہ یا لوک کہانی " شاہ بہرام وگلندام " کی ہے ۔ ڈاکٹر جوزف نے اس نثر کی کتاب کو جو بلوچی رسم الخط میں ہے اور برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے اس کو رومن رسم الخط میں اتار کر اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے ۔

اس سلسلے میں اس کتابچہ کے دیباچہ میں ڈاکٹر جوزف لکھتے ہیں کہ اس کا بلوچی رسم الخط (یعنی عربی رسم الخط) میں ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ برٹش میوزیم (لندن) نے ۱۸۶۱ء میں ایک عورت مسٹر ایچ ۔ ایچ ولسن کی بیوہ سے خریدا ہے ۔ اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس عورت کو یہ نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا تھا ۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری دسترس میں ایسی ایک بھی لائبریری یا میوزیم نہیں جس سے زبان اور ادب کے ہم جیسے نادار طالب علموں کو استفادہ حاصل

ہو سکے ۔ اس نسخہ کے بارے میں جوزف نے برطانوی، فرانساوی، جرمن اور روسی درجن بھر محققین کا حوالہ بھی دیا ہے۔

اسی کتابچہ میں اسی دست نوشت بلوچی متن سے ایک فوٹواسٹیٹ تصویر بھی ڈاکٹر صاحب نے نمونے کے طور پر شامل کیا ہے۔ (اس رسم الخط میں ماسوائے "ءَ ءِ ءُ" اور اس جیسی نئی ایجاد شدہ الفاظ و علامات کے باقی متن کا رسم الخط اور لکھائی بالکل یہی ہے جو ہم آج کل لکھ رہے ہیں۔) یہ کتابچہ اس بیوہ سے ۱۸۶۱ء میں خریدا تو گیا ہے پر نہ جانے یہ لکھا کب گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل سے پہلے بلوچی نثری ادب بھی محفوظ کی جا رہی تھی۔ لیکن شاید وہ مسودات ضائع ہو گئے ہوں گے۔ برٹش میوزیم جیسی جگہوں میں شاید اس سے بھی پرانی چیزیں دستیاب ہو سکیں۔ علاوہ ازیں برلن، ویانا اور ماسکو میں بھی ایسے مخطوطات کا ہونا یقینی ہے۔

جدید نثری ادب

اب جدید نثری ادب کے بارے میں کچھ کہیں تو بہتر ہوگا۔ جیسے کہ ہم پہلے ہی اس دور کی ابتدا ۱۹۵۰ء متعین کر چکے ہیں۔ جدید بلوچی نثری ادب کا آغاز بھی اسی دور میں ۱۹۴۹ء میں ہوا جس کے ارتقاء پر ہم ایک طائرانہ نظر ڈال کر سب سے پہلے ان ذرائع کا ذکر کرتے ہیں جو گزشتہ پچیس سالوں میں اس سلسلے میں زیادہ اہم تھے اور یہی وہ ذرائع تھے جن کے وسیلے سے بلوچی زبان کو آگے بڑھنے کا موقع میسر آگیا۔

اوّل ریڈیو:- ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی زبان میں نشریات کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوا۔ اور جس لکھائی یا نوشتہ کو ہم باعنوان مضمون کہتے ہیں، بلوچی زبان کی تاریخ میں پہلی بار اسی ریڈیو پروگرام کے لئے لکھا گیا۔ چونکہ اس وقت میں حاضر نہ تھا اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ وہ مضمون کونسا تھا۔ اور بعد میں جب میں اس ریڈیو

کے انہی پروگراموں سے منسلک ہوا تو میں نے اس ابتدائی اور اوّلین مضمون کو ریڈیو ریکارڈ سے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن غیر ذمہ داری کی وجہ سے وہ محفوظ نہیں کیا گیا تھا۔ میں اس کو تاریخ و تبرک کی بنا پر رکھنا چاہتا تھا۔ جب میں کراچی آکر ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگیا تو ریڈیو کے ذریعے زبان کو ترقی دینے کے لئے کوشاں رہا۔ چنانچہ پروگراموں کو تشکیل دینے میں نثری ادب کو بڑھانے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں ہر موضوعات پر مضامین، ڈائیلاگ، فیچر وغیرہ کا انتظام کیا۔ لیکن پھر بھی بلوچی نثری ادب کے سلسلے میں ریڈیو کوئی خاص فائدہ مند ثابت نہیں ہوا۔ اولاً تو یہ کُل ۴۵ منٹ کے پروگراموں میں سے عام طور پر بیس منٹ موسیقی کے لئے وقف تھا۔ دس منٹ خبروں کے لئے مخصوص۔ اور پانچ "ہمارا پاکستان" نامی مستقل و ضروری عنوان پر مبنی پروگرام کے لئے وقف تھے۔ باقی صرف دس منٹ کسی مضمون، ڈائیلاگ یا فیچر وغیرہ کے لئے۔

اب ایک ایسی زبان کے لئے جس کے جدید نثری تحریری ادب کی ابتداء ہی ہوچکی ہو بھلا صرف دس منٹ کے وقت میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ پھر بھی یہی کوشش رہی کہ اسی دس منٹ میں زبان کے نکتہ نظر سے کوئی اچھی چیز تحریر و پیش ہوسکے۔

ریڈیو پاکستان میں پورے پانچ سال تک اس ریڈیو پاکستان سے منسلک رہا کہ خود اپنی طبیعت اور فطرت سے بغاوت کرکے زبردستی بلوچی زبان ہی کی خاطر اس عجیب و غریب ادارے سے چمٹا رہا۔ جی ہاں ریڈیو پاکستان کا ادارہ واقعی ایک عجیب و غریب ادارہ تھا۔ (میں نے تھا اس لئے کہا ہے کہ اب بفضلِ خدا اس کا نام ریڈیو کارپوریشن ہے۔) اس ادارے میں دھاندلیاں ہوتی رہی ہیں مگر مجھے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ سب سے

بڑی چیز جو میرے لئے میری زبان کے لئے اور بلوچی پروگراموں کے لئے مصیبت بن گئی تھی وہ قومی اور زبانی یا لسانی تعصّب بے جا تھا۔ ریڈیو پر پنجابیوں کا قبضہ تھا اور پنجاب کا اثر بھی کافی تھا۔ کراچی اسٹیشن سے دس گھنٹے سے زیادہ کا پروگرام نشر ہونے کے باوجود یہ حضرات ایک گھنٹہ سندھی یا بلوچی زبان کے پروگرام نشر ہونا برداشت نہیں کر سکتے تھے سندھی پروگرام تو میڈیم ویوز پر نشر ہوتے تھے اور وہ اس فعل کو اردو کی حق تلفی سمجھ کر سیاسی نکتہ نظر سے بادل ناخواستہ مان چکے تھے۔ اور سندھی پروگرام کے انچارج یا دوسرے افسران کا طرز عمل بھی کچھ عجیب تھا۔ وہ بچارے ریڈیو پاکستان کے ہر افسر کی خوشامد اس طرح کرتے تھے جیسے کہ یہ ان کے در کے طفیلی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ان حضرات کے دل میں انہیں جگہ نہ ملی۔ بلوچی پروگرام چونکہ شارٹ ویوز پر نشر ہوتے تھے اس لئے ہماری اُن سے ڈائرکٹ پرخاش نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ دیکھ کر میں انتہائی مایوس ہو گیا کہ کسی کو اگر ہمارے پروگرام سے کوئی تعلق نہ ہوتا تب بھی اس کو ہمارا وہاں ہونا تک بُرا لگتا تھا۔ اور ہمیشہ بلوچ قوم اور بلوچی زبان کو حقیر سمجھتے تھے۔ اور وہ اپنے یہ جذبات چھپاتے بھی تو نہ تھے۔ کئی دفعہ میری ان سے اسی بات پر پرخاش بھی ہوئی تھی۔ مجھے ان کے رویے پر نہایت افسوس ہوا۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ پاکستان کی سالمیت اور قومی یکجہتی اور ایکتا کا پرچار کرتے تھے۔ لیکن دوسری طرف وہ اس سرزمین کے اصلی باشندوں کی قومیت اور زبان کو ملیا میٹ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے مجھے انہی دنوں اِس ملک کا مستقبل تاریک نظر آتا تھا اور جب بھی میں اس کا اظہار کرتا تو معتوب نظروں اور عتاب آمیز کارروائیوں سے میری سواگت ہوتی تھی۔ میں ریڈیو پاکستان میں اپنے پانچ سالہ تجربہ کے بارے میں مضمون لکھ رہا ہوں جس میں ہر چیز تفصیل سے بتائی جائے گی۔

مطلب یہ کہ بلوچی زبان کو ریڈیو پاکستان کے افسران اور عملداران نے عمداً دبانے کی کوشش جاری

رکھی اور ہمارے لئے وہ مشکلات پیدا کر دی کہ انہی پینتالیس منٹ کے پروگرام کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ چنانچہ بڑی جدوجہد کے بعد سرکاری سطح پر اس پروگرام سے چھٹکارا پانے کی غرض سے انہوں نے ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے اسٹیشن کی تجویز اور تعمیر فوری طور مکمل کر کے کراچی اسٹیشن سے بلوچی زبان کے پروگرام بند کر کے کوئٹہ کے حوالے کر دیئے۔ حالانکہ یہ مزید تعصب کا مظاہرہ تھا۔ یعنی کراچی اور سندھ کے چالیس لاکھ سے زائد بلوچوں کے لئے پینتالیس منٹ کا یہ پروگرام بھی گویا غیر قانونی نشر ہونے رہے ہیں۔ چنانچہ جب ۱۹۵۶ء میں یہ بلوچی پروگرام کراچی سے کوئٹہ منتقل ہو گئے تو وہاں ان کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو گئی۔

مطلب یہ کہ اسی متعصبانہ رویوں اور رکاوٹوں کی بنا پر بلوچی جدید نثری ادب کو ریڈیو کے ذریعے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ اسی شوق میں کئی ایک لکھنے والے پیدا ہو گئے جس دوران میں اِس ریڈیو سے متعلق رہا، اس دور کے کچھ اچھے مضامین، فیچر وغیرہ کے نقول البتہ میں نے اپنے پاس خاص طور پر محفوظ رکھے ہیں جو بلوچی زبان کی ترقی کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب سے ریڈیو پاکستان کے بلوچی پروگرام کوئٹہ منتقل ہو گئے ہیں میری نظر میں ریڈیو کے ذریعے جن آٹھ سالوں میں بلوچی زبان نے مشکلات کے باوجود ناسا عد حالات میں جو ترقی کی تھی ان پر کوئٹہ اسٹیشن نے پانی پھیر دیا۔ (علیحدہ مضمون میں اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔) مراد یہ ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بلوچستان میں اپنا علیحدہ ریڈیو اسٹیشن ہونے کی وجہ سے اس زبان کو وہاں ترقی دینے کے زیادہ مواقع ہاتھ آئیں گے بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ معاملہ اور حقیقت بالکل اس کے برعکس نکلا ہے۔ یعنی ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے تمام پروگرام کوئٹہ شہر کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پروگرام ذاتی اور خصوصاً کوئٹہ شہر ہی کے لوگوں کے لئے

نشر ہو رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ زبان کی خدمت یا ترقی کا نام لینا دیوانگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جرائد اور مجلات ہیں۔ بلوچی زبان کی تاریخ میں پہلا ماہنامہ کراچی سے "اومان" کے نام سے ۱۹۵۲ء میں جاری ہوا۔ سب سے پہلے یہ خیال مجھے پیدا ہو گیا تھا اور میں نے اپنے دو اور دوستوں سے اس کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ اس کا نام "اومان" بھی میں نے تجویز کیا۔ تینوں نے عہد کر لیا کہ ڈیکلریشن اور چھپائی وغیرہ کے انتظامات مکمل ہونے تک یہ پروگرام صیغۂ راز میں رہے گا۔ لیکن ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ ایک بلوچی ماہنامہ چھپ کر بازار میں آگیا ہے اور اس کا نام بھی "اومان" ہی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم تینوں میں سے ایک نے خیانت کی ہوگی۔ خیر میری خواہش پوری ہو گئی۔ مگر یہ "اومان" ملّاؤں کے ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں تھا کہ جن کو بلوچی زبان کی ترقی کے بجائے کچھ اور چیز کی فکر تھی۔ چنانچہ یہ "اومان" جب تک زندہ رہا خوب کماتا رہا اور جب حاتموں اور سخیوں کے ہاتھ تھکنے شروع ہو گئے تو یہ ماہنامہ بھی اسی بیماری کا شکار ہو گیا۔ "اومان" کی دس سالہ زندگی کس طرح گزری کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہوگا اس کی فائلیں خود اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس رسالے نے بلوچی نثری ادب کی ترقی میں، ماسوائے اس کے کہ بلوچی تاریخ میں یہ پہلا ماہنامہ تھا اور کوئی خدمت انجام نہ دی۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ دس سال کی طویل مدت میں اس رسالے میں نشر شدہ مشکل سے دس ایسے مضمون ہوں گے جن کو ادبی نکتہ نگاہ سے کوئی حیثیت حاصل ہو۔ اور کوئی دس سال تک موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا ہونے کے بعد نجات پا گیا۔ اس کے نہ چلنے، کامیاب نہ ہونے اور بند ہو جانے کا سب سے بڑا سبب خلوص کا فقدان ہی تھا۔

ماہنامہ" **بلوچی** " بلوچی زبان کی تاریخ کا دوسرا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۵۶ء میں کراچی سے شائع ہونا شروع ہوگیا۔ مجھے یہ کہہ کر فخر محسوس ہوتا ہے کہ اس رسالے کے اجرا میں میری محنت و مشقت کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ وہ یوں کہ جب ۱۹۵۴ء کو میں بلوچستان کے دورے پر نکلا تھا تو بلوچوں نے مجھے دوسری اعانتوں کے علاوہ مالی امداد بھی فراہم کی۔ جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب "سستگیں دستونک" میں کیا ہے۔ اس دورے کے بعد جب میں کراچی پہنچا تو بلوچی زبان کے وہ خیرخواہ جن کی آنکھیں روپہلی چمکاہٹ کے تصور سے چکا چوند ہوتی جارہی تھیں اندھے کی لاٹھی کی طرح اپنی ذہنیت کا مظاہرہ کرکے ایسے نامساعد حالات پیدا کئے جن کی بنا پر میں بقولِ سعادت حسن منٹو پچھلی گلی سے کراچی سے نکل گیا۔ لیکن امداد کی طرح حاصل کردہ رقم میں سے ایک ہزار روپے میں نے "سرچگّ" کے اس وقت کے صدر میر عبدالواحد آزاد جمالدینی کے حوالے کردیئے۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں کراچی ہی میں انہی پیسوں سے یہی ماہنامہ" بلوچی" جاری کیا جو دو سال تک باقی رہا۔

ماہنامہ" بلوچی " اپنی کوتاہ عمری کے باوجود زبان کی خدمت میں نہایت مستعد اور کوشاں رہا۔ ان دو سالوں میں اس رسالے سے اچھے لکھنے والوں کے لئے موقع فراہم کیا افسوس کہ اس رسالے کو مالی مشکلات نے بند ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن ہم یہ کہتے نہیں ہچکچاتے کہ یہ مالی مشکلات بالکل اصطناعی (مصنوعی) تھے۔ اگر یہ رسالہ ایک اچھے گروپ کے ہاتھ میں ہوتا تو یہ نہ صرف آج تک زندہ رہتا بلکہ بلوچی تاریخ میں بہترین رسالہ ثابت ہوسکتا تھا۔ باوجود ان خامیوں اور کم عمری کے اس رسالے نے" اومان "سے بدرجہا بہتر بلوچی زبان کی خدمت کا ثبوت دیا۔

اس ماہنامہ" بلوچی "نے اگرچہ لوگوں میں لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ لیکن ان کے جذبات کو پھر اس کے بند ہونے نے گنگیر کر چھوڑا۔ حالانکہ" بلوچی "کے بند ہونے کے بعد

چار سال تک ماہنامہ "اومان" تھرتھراتے لڑکھڑاتے زندہ تھا مگر وہ کسی بھی صورت "بلوچی" کے مشن کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کی زندگی خود موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا تھی۔

ایک اور ماہنامہ "اُولس" (صحیح اِملا اُلس) کوئٹہ سے سرکار کی پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ۱۹۶۱ء سے شائع ہونا شروع ہو گیا۔ یعنی "اومان" کے بند ہونے سے صرف ایک سال پہلے۔ شروع شروع میں چونکہ کوئٹہ میں اچھے بلوچی لکھنے والوں کی کمی تھی اس لئے کراچی اور بلوچستان کے دوسرے حصّے کے لوگوں کو لکھنے کا موقع مل گیا۔ لیکن جوں جوں کوئٹہ میں چند ایک نویسندے پیدا ہوتے گئے کراچی اور بلوچستان کے باقی حصّے کے لوگوں کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اِس کا سب سے بڑا سبب مالی منفعت تھا کیونکہ یہ پہلا بلوچی رسالہ تھا کہ وہ شاعر اور ادیب کو اس کے اشعار یا مضمون کا معاوضہ دینے لگا تھا۔ اور اسی مالی منفعت کے لالچ میں اس ماہنامہ کا سارا ادارہ ملوّث ہو گیا اور زبان کی خدمت کے بجائے ادارہ اور اس سے متعلق گروپ نے روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا دیا اور اس گروپ نے ہی نوآموزوں کے لئے بھی تختۂ مشق اور ذریعہ آمدن بن گیا۔ جب کسی رسالے کی پالیسی اور کارکردگی کا یہ طریقہ ہو تو اس سے کسی قسم کی امید رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ ابتدائی کچھ سالوں میں کچھ اچھے ادیب اور شاعروں نے اس رسالے میں حصّہ لیا اور ہماری امیدیں کچھ بندھ گئی تھیں لیکن بعد میں یہ رسالہ بتدریج اپنا معیار گراتا رہا۔ اس وقت اس رسالے کے لئے چند لکھنے والے مخصوص ہیں جو مختلف قلمی ناموں سے لکھتے ہیں۔ ایک آدھ ادیب یا شاعر ایسا بھی نظر آتا ہے جو اس مخصوص گروپ سے متعلق نہیں ہے۔ لیکن اس گروپ کی خوشامدیوں میں سے ضرور ہیں۔

اگرچہ سرکاری روپوں کی وجہ سے اس ماہنامے "اُولس" کا جسدِ خاکی ابھی تک زندہ دکھائی دیتا ہے لیکن ادبی نکتۂ نگاہ سے اس کو دھانت ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت اس کے آخری چند پرچے ہیں۔

اگر "اُولس" کا ادارہ یا اس کے کارکن مادی منفعت کے لالچ میں نہ پھنس جاتے تو "اُولس" بلوچی زبان کی بہترین خدمت کر سکتا تھا۔ البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابتدائی سالوں میں اس رسالے میں اچھے مضامین اور اشعار شائع ہوتے تھے اور اب بھی کبھی کبھی ایک آدھ اچھا مضمون بھی نظر آتا ہو گا۔

مطلب یہ ہے کہ "اُولس" چونکہ مالی مشکلات سے بے نیازی کے علاوہ شعراء اور ادباء تک کو چونکہ معاوضہ بھی دیتا ہے تو اس صورت میں وہ بلوچی زبان کی خدمت، ترقی اور تحسین کے لئے بڑا اچھا رول ادا کرنے کے قابل ہے۔ لیکن اس سلسلے میں "اُولس" نے ہمیں بالکل مایوس کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دوسرے بلوچی رسائل کے لئے سالانہ دو ڈھائی پونڈ دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں اور "اُولس" کا سالانہ چندہ تین پاکستانی روپے[1] دیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اور مجھے یقین نہیں آتا کہ "اُولس" کے چندہ دینے والے خریدار سو تک پہنچیں گے۔ ان مختصر اور حقیر چندہ دہندگاں کا چندہ کس طرح ادا کیا جاتا ہے وہ بھی ہمیں معلوم ہے۔

اگر ہم اُولس کے بارے میں صرف مندرجہ بالا حقائق پر اکتفا کریں تو حق ناشناسی ہو گی اس لئے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ کیسے بھی ہو لیکن "اُولس" کے صفحوں میں کئی اچھے شاعر اور مضمون نگار جلوہ گر ہوئے جنھوں نے بلوچی شاعری اور ادب میں کافی کنٹری بیوشن دیا ہے۔

ایک اور جریدہ بنام "زمانہ بلوچی" ہے جو ۱۹۶۸ء ۱ اکتوبر سے کراچی سے شائع ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں یہ پندرہ روزہ کی حیثیت سے نشر ہونے لگا اور اسی

---

[1] اس سال سے شاید دس روپے ہے۔

نام یعنی " پندرہ روزہ زمانہ بلوچی "سے جاری ہوا اور یہی الفاظ اس پر لکھے ہوئے تھے مگر ریگولارٹی کے بارے میں اس کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی تین تین مہینوں تک پرچے کے نشانات نظر نہیں آتے - پھر یہ "پندرہ روزہ" کے الفاظ تو اس کی پیشانی سے غائب ہو گئے - مگر باقاعدہ ہر مہینے ، ماہنامہ کی طرح تقریباً بروقت چھپتا رہا ——
جس کو ہم یک نوع ترقی کہہ سکتے ہیں -

ماہنامہ " اولس " کے برعکس " زمانہ بلوچی " نے ابتداء ہی سے اچھے ادیبوں کو اپنے حلقے میں آنے تک کا موقعہ ہی نہیں دیا - کیونکہ اس جریدے کا مقصدِ اولیں صرف قاری سے مادی منفعت اٹھانا تھا اور اس کا بہترین طریقہ یہی اختیار کیا گیا تھا کہ مضمون نگار کا خریدار بننا اور مالی اعانت کرنا شرطِ اولین تھا -

ظاہر ہے کہ اچھے ادیب اور شاعر اس شرط کو ماننے کے لئے
تیار نہیں ہیں - یعنی بجائے اس کے کہ اُن کو کچھ معاوضہ دیا جائے اُلٹا ان پر خریدار بن کر مالی اعانت کی شرط بھی لگا دی گئی تھی - اس لئے نوآموز نوعمر اور تصویری جنون رکھنے والے خریداروں سے مالی اعانت حاصل کرنے کے پروگرام کے تحت ان کے اوٹ پٹانگ مضامین اور منظومات بدون اصلاح چھاپے جانے لگے - اور اُن کی تصاویر نمایاں طریقے پر جریدے کی زینت بنیں - یعنی جریدے کا معیار اُن ناتجربہ کار اور نوآموز خریداروں کے برابر اس غرض سے رکھا گیا کہ ان کے بے تکے منظومات اور بے ربط مضامین یا ان کی چند تصویریں چھاپنے سے مالی اعانت ہو جاتی ہے - اگرچہ اس جریدے کے لئے چند ایک ادیبوں نے پُرخلوص طور پر اپنی خدمات بھی پیش کی تھیں لیکن " زمانہ " کے ادارے نے سوچ بچار کے بعد ان کی پیش کش ٹھکرا کر اپنے گرد پہلے سے بھی زیادہ مستحکم حصار باندھ لیا - تاکہ اس کے احاطے میں کوئی رخنہ انداز داخل نہ ہو سکے - کچھ اچھے ادیبوں نے محض زبان دوستی کی خاطر اس جریدے سے اعانت کی صورت میں مضامین وغیرہ مہیا کیے لیکن " زمانہ " کے

ادارے کی بے توجہی کی وجہ سے شکستہ دل ہوکر کنارہ کش ہو گئے۔ البتہ دو ایک ادیب اور شاعروں نے محض ذاتی دوستی کی خاطر اپنا رابطہ باقی رکھا۔ حالانکہ وہ بھی " زمانہ " کے رویے سے نالاں تھے۔

البتہ ۱۹۷۲ء کے اواخر سے اس میں سب سے بڑا فرق یہ آگیا ہے کہ یہ اب باقاعدگی سے ہر ماہ نشر ہونے لگا۔ علاوہ ازیں کسی کسی پرچہ کا معیار ذرا بڑھ جاتا تھا لیکن پھر اچانک ایک آدھ پرچہ اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑتا تھا۔ اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کے ارباب کا مقصدِ اعلیٰ مالی ومادی منفعت کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور چونکہ اس وقت کوئی بھی غیر سرکاری جریدہ یا مجلہ بلوچی زبان میں نہیں نکل رہا تھا اور عام لوگوں میں بلوچی زبان لکھنے اور پڑھنے کا ذوق جنونی حد تک پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ ادارہ بلوچی زبان کے نام پر اپنا سودا کھرا کرنے میں لگا رہنا چاہتا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بلوچوں کی ایک بہت ہی بھاری تعداد بیرونِ ملک گلف کے خوشحال اور متمول ریاستوں میں برسرِ روزگار ہے اور ان کو اپنی زبان میں لکھی ہوئی ہر چیز جان سے پیاری ہے۔ یہ گلف میں رہنے والے بلوچ اس جریدہ " زمانہ " کے سب سے بڑے خریدار ہیں اور اس سلسلے میں وہ سالانہ چندہ کے علاوہ مزید مالی اعانت دل کھول کر کر رہے ہیں جس کی تفصیل کسی اور موقع پر بیان ہوگی۔ اس کے علاوہ اندرونِ ملک اس پرچہ کے خاص خاص ہمدرد ومعاون موجود ہیں کیونکہ اس پرچے کے مالک کی دسترس دور دور تک ہے۔

ان تمام نقائص کے باوجود یہ پرچہ " زمانہ بلوچی " ہر ایک نکتہ نظر سے کوئٹہ سے نشر ہونے والے جریدے " اُولس " سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر اس پرچہ کو یعنی " زمانہ بلوچی " کو چند اچھے ادیبوں کی نگرانی حاصل ہو جائے تو یہ " بلوچی زبان " کی بہترین خدمت کر سکتا ہے۔ لیکن صد افسوس کہ اس کا مالک اور مدیرِ اعلیٰ غیر بلوچ اور بلوچی زبان

سے قطعی طور پر ناآشنا ہونے کی وجہ سے بلوچی زبان کے نکتہ نظر سے نہیں بلکہ مادی نکتہ نظر سے اس جریدے کو چلانا چاہتا ہے۔ اور جب تک اِن کا یہ نظریہ تبدیل نہ ہو جائے اس کا جریدہ صحیح معنوں میں بلوچی زبان کی خدمت تو ایک طرف بلکہ زبان وادب کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔

دوسری حقیقت پسندانہ بات یہ ہے کہ اِس وقت یہی ایک واحد جریدہ ہے جس کو ہم نمونے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ شاید یہی ایک چیز اس کے نظریوں کو برقرار رکھنے کا سبب ہو۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہتے کہ بلوچی زبان اور اس کی خدمت کا نکتہ بجائے خود اگر کوئی صحافت کا علاقہ مند بزنس مین (بیوپاری) تجارتی نکتہ نظر سے بلوچی جرائد ورسائل کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے تو وہ یقیناً اُس طرف متوجہ ہوگا اور اگر ایسا ہوا بھی تو یہ جریدہ " زمانہ بلوچی " ــ " اومان" ہی کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ نہیں تو " اُولس " کی مانند زندہ لاش ہو کر رہ جائے گا۔ ویسے اس کے ادارے کو اس کی کوئی فکر نہ ہوگی کیونکہ اس کا نظریہ تجارتی ہے۔ زبان وادب کی خدمت نہیں ہے اور اگر کوئی تاجر کا ایک ذریعۂ خدمت بند ہو جائے گا تو وہ اپنی دولت و تجربے سے دوسرا کوئی راستہ اس کے نعم البدل میں پیدا کر سکتا ہے۔

البتہ ہم اس جریدہ " زمانہ بلوچی " کے غیر بلوچ اور بلوچی سے ناآشنا مالک و مدیر اعلیٰ کے ممنون ہیں کہ اس نے چاہے کسی بھی نظریہ کے تحت کم از کم ایک بلوچی زبان کے جریدہ کا تو اجراء کیا جس کا یہ عمل بلوچی دنیا کے عموماً اور خصوصاً پاکستانی بلوچوں کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔

" زمانہ بلوچی " نے دو چار اچھے ادیبوں کو موقع دے کر بلوچی نثر پر بھی احسان کیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ان دو چار ادیبوں نے خود " زمانہ بلوچی " پر احسان کیا ہے۔ اب یہ رسالہ کوئٹہ منتقل ہو گیا ہے اور اس کی اشاعت کے بارے میں ہم لاعلمی میں ہیں۔

اس سلسلے میں "نوکبں دور" (کوئٹہ) کا ذکر نہ کرنا ظلم ہوگا۔ بلوچی زبان کی تاریخ میں یہ پہلا ہفتہ وار ہے۔ (یا تھا۔)۔ اس کے بے بس و لاچار مالک و ایڈیٹر جناب عبدالکریم شورش (حال کریم آمن) نے .... اس جریدے کے زندہ رکھنے کی کوشش میں اپنا سب کچھ گنوا دیا ہے۔ مگر نامساعد حالات نے اُس کو کہیں کا نہ رکھا۔ (ان تمام جرائد و مجلات کے بارے میں ایک علیحدہ مضمون زیر قلم ہے۔)

اگرچہ ان تمام جرائد و مجلات نے بلوچی نثری ادب کی خدمت اور اس کی ترقی کے سلسلے میں کسی خلوص کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن لوگوں میں بلوچی زبان لکھنے اور پڑھنے کا شوق جنونی صورت اختیار کرچکا ہے۔ جس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۲۶ سالوں میں بلوچی زبان میں کچھ اچھے نثر نگار پیدا ہوگئے ہیں۔ اور ان میں اکثر ایسے ہیں کہ ان کو ان مذکورہ مجلات نے ہمیشہ خطرناک سمجھ کر اپنے سے پرے رکھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ جرائد و مجلات نوخیز ادباء اور شعراء کی رہنمائی کے سلسلے میں بُری طرح ناکام ہوگئے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس جس ادیب و شاعر نے نوآموزی کے زمانے میں جس بھی رسالے یا مجلے کی پیروی کی وہ گمراہی کے گڑھوں میں گر گیا۔ اور آج جتنے اچھے ادیب اور شاعر ہیں وہ ان جرائد و مجلات کے قطعی مرہون منت نہیں ہیں۔ کیونکہ کسی بھی مجلے کی پوری فائل اٹھا کر دیکھنے سے کہیں آپ کو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئے گی جس کو آپ رُشد و ہدایت کا نام دے سکیں۔ البتہ آپ یہ ضرور دیکھیں گے اور نمایاں طور پر دیکھیں گے کہ کوئی بھی رسالہ یا مجلہ آج تک خود اپنے لئے ہی کوئی ایک راستہ تک اختیار نہ کرسکا اور بالکل " سر بُنگ " کارواں کی طرح " سرجنان " ہے۔

تیسرا اہم ذریعہ کتابوں کا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر آج تک جتنی کتابیں بلوچی

زبان میں چھپ چکی ہیں۔ ان کی کل تعداد ایک سو سے آگے بڑھنے نہیں پائی ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابیں منظوم مجموعے ہیں۔ چونکہ ہم نثری ادب سے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اس لئے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کتابوں میں نثر کا حصہ نہایت ہی کم ہے۔

ویسے نثری ادب یا نثری کتابوں کے چھپوانے کا سلسلہ ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اس کی ابتدا، بہائی مذہب کے لوگوں کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۵۴ء میں مجھے اس مذہبی فرقے کی ایک چھوٹی سی کتاب (صرف ۳۲ صفحے) کے بلوچی میں ترجمہ کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ اور اُسی سال چھپ کر بازار میں آگئی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی جدید نثری ادب کے دور کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد "بلوچی زبان ءِ سرّچگ" کا تعارفی پمفلٹ شائع ہوا۔ اور پھر ۱۹۶۱ء میں شیر محمد مری کی کتاب "بلوچی زبان ءُ ادب ءِ تاریخ" چھپ گئی جو خاص مری ڈائیلکٹ (لہجہ) میں ہونے کی وجہ سے عام بلوچی بولنے پڑھنے والوں کے لئے کوئی سود مند ثابت نہ ہوئی۔

بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں میں نے اپنی منظوم کتابوں کے ساتھ نثر کی چھوٹی بڑی چار کتابیں چھپوا کر بلوچی نثری ادب کی کتابوں میں اضافہ کیا جو بالترتیب یہ ہیں۔

(۱) سِستگیں دستونک (۲) جُبز عُم بلوچی
(۳) بلوچی بُنگیجی (۴) بلوچی شیاھگ

۱۹۶۳ء میں بلوچی اکادمی کراچی نے ایک قاعدہ "زھگ بلد" چھپوایا۔ پھر اسی سال کریم دشتی کی تالیف شدہ دو قابل قدر کتابیں ۱۔ شرگداری ۲۔ مے لوزانک [۶۳] چھپ گئیں۔ ۱۹۶۴ء میں ایک مضامین کا مجموعہ "گچین" کے نام سے کراچی میں بلوچ اسٹوڈنٹ جماعت نے شائع کیا۔ اس کے بعد قاضی عبدالرحیم صابر کی کتاب "دوجہان ءِ سردار" چھپ گئی۔ اور پھر ۱۹۷۰ء میں میری کتاب "میر گند" چھپ

گئی - بعد ازاں قیوم بلوچ کا قاعدہ "بلوچی زہگ بلد" چھپ گیا۔ آغا نصیر احمد زئی نے ایک حرف کی کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع کی تھی۔ ان کے علاوہ بلوچی اکادمی کوئٹہ نے مندرجۃ الذیل نثری کتابیں ۱۹۶۸ء ہی میں چھپوائیں۔

۱۔ گیدی قصّہ ۲۔ گیدی کسوّ ۳۔ گچین ۴۔ گشین

۵۔ بلوچی لغات ۶۔ پلنگ و بلوچ ۷۔ تبل گالوار

جس حساب سے ۱۹۵۰ء سے آج تک بلوچی نثر میں صرف ۲۵ کتابیں چھپ چکی ہیں ان ۲۵ کتابوں میں سے پانچ قاعدے ہیں، ایک ڈکشنری، ایک محاورے کی کتاب اور حرف کی کتاب۔ ان میں سے یہ کتابیں منہا کرنے کے بعد صرف ۱۶ کتابیں ایسی ہیں جن کو دورِ جدید کے بلوچی نثر کی کُل پونجی سمجھنا چاہیئے۔ ان سولہ کتابوں سے صرف چھ کتابیں تصنیف ہیں جبکہ باقی دس کتابیں ترجمہ یا تالیف ہیں۔ تالیف شدہ کتابوں میں وہ چیدہ چیدہ مضامین ہیں جو گزشتہ تئیس ۲۳ سالوں میں بلوچی جرائد و مجلّات میں نشر ہوتے رہے ہیں۔ جن کے مواضیع تاریخ، تنقید، تبصرہ، تحقیق، شاعری، نثری ادب، طنز و مزاح رپورتاژ وغیرہ ہیں۔

تصنیف شدہ کتابوں میں ایک کتاب "بلوچ اور فرنگ" تاریخی ہے۔ جس میں بلوچوں اور انگریزوں کے درمیان واقعات و حالات کے حقائق ہیں۔ اس کے مصنف ملک کے مشہور مورّخ محمد سردار خان گشکوری ہیں۔

دوسری کتاب "بلوچی زبان و ادب کی تاریخ" مختصر ہونے کے باوجود اچھی منفعت بخش کتاب ہے لیکن تشنۂ تکمیل بھی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے یہ کتاب مری بگٹی قبائل کے خالص ٹھیٹ لہجے میں لکھی ہے۔ یہی وجہ ہے عام بلوچوں کے لئے اس کتاب کی افادیت کھو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے ہم نے اس کتاب کی عام بلوچی زبان میں دوبارہ چھپوانے کی تجویز پیش کی ہے۔ تیسری کتاب کا نام "دوجہانِ ءِ سردار" ہے جیسے کہ اس کے نام

سے عیاں ہے کہ یہ رسول اکرمؐ کے بارے میں ہے۔ چوتھی کتاب "بلوچی شیاھگ" ہے۔ جس میں بلوچی زبان کی صحیح املا لکھنے اور نحوی قواعد کے بارے میں تفصیلی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب بلوچی زبان کی صحیح املا اور عبارت لکھنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہو گئی ہے۔

پانچویں کتاب "سنگیں دستونک" ہے جس میں قطعات کی صورت میں نثر میں لکھے ہوئے ادب پارے ہیں۔ جو مختلف جذبات، خیالات، اُمنگ اور ارادوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چھٹی اور آخری کتاب "میر گند" ہے۔ یہ کتاب ایک مخصوص ڈھنگ سے لکھی گئی ہے۔ اگر اس میں مختلف مضامین کی شکل میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ بھی لکھا گیا ہے لیکن ان سب کا خاص کریکٹر "میر گند" ہی ہے۔

چونکہ افسانہ تقریباً ہر زبان کے ادب کا اہم ترین حصہ بن گیا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہمارے بلوچی ادب پسندوں نے افسانہ نگاری میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ چونکہ افسانہ نگاری بنفسہ ایک علیحدہ فن ہے۔ اس لئے ہمارے افسانہ نگاروں نے بھی اس فن کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی ہے مگر ابھی تک ہم دعویٰ سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا فلاں افسانہ نگار اس فن کی بلندیوں کو چھو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس چھبیس[۲۶] سال کی مختصر مدت میں بلوچی افسانہ نگاری میں چند ایک ادیبوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ویسے تو کوئی ایک شخص نے ایک آدھ اچھا افسانہ لکھا مگر ہم کسی ایک ادیب کا نام کامل افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتے جس کے درجن بھر افسانے کم از کم کامیاب ہوں۔ بہر حال اس فن کے میدان میں بھی بلوچ ادیب تازہ واردِ چمن ہیں کیونکہ یہ بلوچی زبان و ادب میں ایک نئی چیز ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی ہم پُرامید ہیں۔ اگر مندرجہ الفوق باقی رسالے اور جریدے اپنے سطحی نظریات سے ہٹ کر صحیح معنوں میں ادیب اور قلمکاروں کے معیاری مضامین کو اپنے صفحات میں جگہ دینا شروع کر دیں تو ایک طرف تو ان قلمکاروں کو اپنی

قابلیت اُجاگر کرنے کا موقع ملے گا تو دوسری طرف ان جرائد کا معیار بلند ہو جائے گا۔ اور اسی طرح زبان و ادب کی بہترین خدمت ہو سکے گی۔

بلوچی نثری ادب کا ذکر کرتے ہوئے ہم ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس کو دوسری زبانوں میں وہ درجہ حاصل نہیں جو ہم اس کو دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ہماری نظر میں نثری ادب میں یہ ایک بہترین فن ہے۔ اور اس کا رول بھی بہت ہی اہم ہے۔ مگر لوگ شاید اس کو اس وجہ سے نظر انداز کر رہے ہیں کہ دوسری زبانوں میں اس کی مثال کم ملتی ہے اور اگر ہے بھی تو شاذ و نادر ـــ ہمارا مطلب مکاتیب نویسی سے ہے یعنی خطوط نویسی سے ـ ہم اس موضوع کو خاص طور پر اس لیئے اہمیت دے رہے ہیں کہ اس کے وسیلے بلوچی زبان کو عام کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔ جب ہم نے بلوچی زبان کے متعلق اپنی کاوشیں شروع کردیں تو ہمارے یہاں کوئی ایسا وسیلہ نہیں تھا جس کے ذریعے ہم لوگوں کو اس طرف متوجہ کریں اور نہ ہی ہمارے یہاں کوئی جریدہ یا رسالہ تھا۔ اس کے علاوہ بلوچی زبان کہیں بھی کسی بھی صورت میں پڑھائی نہیں جا رہی تھی۔ اب پروگرام کے تحت اردو، سندھی، فارسی اور عربی پڑھے لکھے باسواد لوگوں کو بلوچی زبان کے لکھنے پر آمادہ کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پڑھنے کے لئے ہمارے ہاں کوئی چیز نہ تھی۔ نہ ہی درس و تدریس کا کوئی سلسلہ تھا لیکن بہرحال اس کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکالنا تھا۔ چنانچہ بڑے غور و فکر کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اپنے دوست اور آشناؤں کو آئندہ بلوچی زبان ہی میں خط و کتابت شروع کر دیں گے۔ شروع شروع میں ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ لکھنے والوں کو پریشانی ہوتی تھی کہ وہ بغیر کوئی کتاب پڑھے بلوچی لکھنا شروع کردیں۔ لیکن ہم نے ان کو اپنے انہی خطوط کے ذریعے ہدایات دینی شروع کیں۔ اور ساتھ ساتھ یہ مہم بھی چلادی کہ اگر کوئی بلوچ ایک دوسرے بلوچ کو کسی غیر بلوچی زبان میں خط لکھے تو اسی خط پر یہ نوٹ لکھ کر واپس بھیج دیا جائے۔

" یہ زبان ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے ۔ ذرا بلوچی میں خط لکھ کر بھیج دیں ۔"

یہ تحریک آہستہ آہستہ زور پکڑ گئی اور لوگوں میں بلوچی زبان میں خط لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوگیا ۔ اور اکثر بلوچ کسی دوسرے بلوچ کو بلوچی زبان ہی میں خط لکھنے لگے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ موجودہ جدید دَور میں بلوچی نثر نگاری اسی خطوط نویسی سے شروع ہوگئی ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم اتنا تک کہہ سکتے ہیں ۔ یہی خطوط نویسی درس وتدریس اور تعلم وتعلیم کا واحد ذریعہ تھی ۔ اور آج تک یہی خطوط نویسی بلوچی زبان کی تعلیم وتعمیم میں سب سے زیادہ اہم ہے ۔ کیونکہ دنیا میں جہاں جہاں بلوچ آباد ہیں ۔ وہاں آج تک ایک بھی ایسا مدرسہ یا انسٹی ٹیوٹ نہیں ہے جہاں بلوچی زبان سکھائی یا پڑھائی جارہی ہو ۔ اور جگہوں کو چھوڑیئے خود پاکستانی صوبہ بلوچستان یا ایرانی صوبہ بلوچستان میں بھی یہ چیز مفقود ہے ۔

میرے پاس شواہد موجود ہیں کہ خطوط ہی کے ذریعے اپنے بلوچ بھائیوں کو زبان وادب اور شاعری وغیرہ کے بارے میں باقاعدہ تعلیم وہدایت دی گئی ۔ میں نے ذاتی طور پر چونکہ اس سلسلے میں بڑی کاوش کی تھی ۔ اس لئے میں نے اپنے اکثر خطوط اسی مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھے کہ میرا مکتوب الیہ اسی خط کے ذریعے بلوچی زبان کو صحیح طریقہ پر لکھنا پڑھنا سیکھ جائے ۔ بعد میں جب بلوچی خطوط نویسی بلوچوں میں عام ہونے لگی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے کئی خطوط دوست اور آشناؤں نے محفوظ کر رکھے ہیں ۔ پھر میرے دو ایک خاص ادب شناس دوستوں کی ترغیب پر میں نے اپنے خاص خاص خطوط کی کاپیاں رکھنی شروع کیں ۔ چنانچہ آج میرے پاس میرے ایسے محفوظ شدہ خطوط کی کوئی دو سو سے زائد کاپیاں موجود ہیں ۔ اور میرا ارادہ ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ہے ۔

میں نے کئی ایک دوستوں کے بڑے اچھے اور خوبصورت لکھے ہوئے خطوط دیکھے ہیں جو واقعی ریکارڈ کرنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک میرا ذاتی اندازہ ہے بلوچی زبان میں اس قدر خطوط اس وقت تک لکھے جا چکے ہیں کہ ان کا ذخیرہ بلوچی نثر کی کل پونجی سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔ کسی غیر بلوچی زبان کے لئے ممکن ہے یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہوں مگر بلوچی زبان کے لئے بڑے اہم ہیں۔ کیونکہ یہی واحد ذریعہ تعلیم و تدریس اور تعمیم بلوچی کا ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان خطوط کو بھی بلوچی نثری ادب کا گرانمایہ سرمایہ سمجھتا ہوں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح گزشتہ دور میں لوگوں کو بلوچی زبان سیکھنے کے سلسلے میں جو رول خطوط نے ادا کیا ہے۔ یہ کام نہ کوئی جریدہ کر سکا ہے اور نہ ہی ریڈیو۔ البتہ کتابوں کا اس میں بڑا حصہ ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے نہیں ہچکچاتا کہ آج تک جو اہم کام یہی خطوط انجام دے رہے ہیں کوئی رسالہ، جریدہ یا ریڈیو نہیں دے سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میں جدید بلوچی نثری ادب میں خطوط نویسی کو بھی ایک اہم جزو سمجھتا ہوں۔

اگرچہ مختلف مواضیع پر بلوچی نویسندگان نے دل کھول کر خامہ فرسائی کی ہے مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے اکثر مضامین تشنۂ تکمیل ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ سب کے سب غیر معیاری ہیں۔ مگر چونکہ بلوچی ایسی زبان کے لئے یہ سب کے سب موضوعات بلکہ خود تحریری نثری ادب بھی نئی چیز ہے۔ اور پھر بلوچی میں کسی قسم کی تعلیم و تدریس قطعی طور پر نہیں ہے۔ پھر بھی تحریری ادب کے ابتدائی دور کے یہ مضامین کسی بھی زبان کے ابتدائی زمانوں کے ایسے مضامین و موضوعات پر لکھے ہوئے نوشتوں سے کم نہیں ہیں۔ اور اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ بلوچی میں اچھے لکھنے والے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کے برعکس بہترین نویسندے موجود ہیں۔ مگر ذرائع کے فقدان کی وجہ سے طبع و نشر کے مواقع نہ صرف غیر میسر بلکہ مفقود ہیں۔ ورنہ ان قابل نویسندوں کے پاس

بہترین مضامین کیا کتابیں تک تکمیل شدہ رکھی ہوئی ہیں۔

اچھے مضامین کے نشر نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ اس وقت بلوچی زبان میں نکلنے والے جرائد و مجلات جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس سلسلے میں پُرخلوص نہیں ہیں اور کتابوں کے بارے میں حقیقت یہ ہے کہ مالی مشکلات اُن کے طبع و نشر کے آڑے ہے۔ دُور کیوں جاؤں۔ میرے ہی پاس زیرِ تکمیل کتابوں کے علاوہ مکمل شدہ مسودے موجود ہیں۔ مثلاً مجموعۂ کلام "سچکانیں سسا" مدّتِ تین سال سے پریس میں پڑا ہوا ہے۔ پھر "نازک" بلوچی زبان کی تاریخ میں پہلا ناول ہے جو ۱۹۶۹ء میں میں نے مکمل کیا ہے ابھی چھپ نہ سکا۔

علاوہ ازیں (۱) "سید نمدی" (۲) "شعلچہ کار" (۳) "چکاس" (۴) "سِتگیں دستونک" (اعادہ و اضافہ کے ساتھ) اور (۵) "بے سرگال" وغیرہ یہ تمام بلوچی نثر کی مکمل شدہ کتابیں ہیں جو مالی مشکلات کی وجہ سے ابھی تک چھپ نہ سکی ہیں۔

علاوہ ازیں ان سب سے منفرد و مخصوص چیز میری گزشتہ پچیس[25] سالہ محنت و مشقت کا ماحصل ایک بلوچی ڈکشنری "سید گنج" کے نام سے تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے لئے تو مندرجہ الفوق کتابوں سے بھی کئی گنا زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے۔

اس آخری بیان سے میری مراد یہ ہے کہ اگر بلوچی زبان کو پاکستان کی دوسری زبانوں کی طرح طبع و نشر کے سلسلے میں اعانت اور سہولت میسّر ہو جائے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ پانچ سال کے اندر اندر بلوچی ادب کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مقابلے میں بے چون و چرا اپنا مقام منوا سکے گا۔ کیونکہ بلوچی زبان بہ نفسہا ایک مکمل زبان ہے اور اس کو بحیثیت زبان کے کوئی ترقیاتی مدارج طے کرنے نہیں ہیں بلکہ صرف اس کا ادبی سرمایہ

کتابوں کی صورت میں تبدیل کرنا یا ڈھالتا ہے۔

ویسے جن مشکلات سے آج بلوچی زبان وادب دوچار ہے تقریباً اپنے ایسے دور میں ہر زبان کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ ہمارے اس زمانے میں حکومتوں کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک یہی زبان وادب کی ترویج و ترقی کا انتظام ہے اور آزادی اور تقسیم کے بعد پاکستان گورنمنٹ نے بھی اس طرف توجہ دی ہے۔ چنانچہ صوبائی زبانوں کو تسلیم کرنے کے بعد ہر ایک صوبائی زبان کی ترویج و ترقی کے لئے گرانٹ مقرر ہوئی ۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے دو چار سال بعد سب صوبائی زبانوں کو گرانٹ ملنا شروع ہوگیا اور اس وقت اردو، سندھی، پشتو، پنجابی زبانوں کو لاکھوں روپے گرانٹ مل رہی ہے ۔ اس کے علاوہ کئی ایک اسی قسم کے ادارے گورنمنٹ کی طرف سے بھی قائم ہوئے ہیں جو ان زبانوں کی ترقی کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں لیکن بلوچی زبان کی ترقی کے سلسلے میں کہیں جاکر ۱۹۶۳ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کو سالانہ پچیس ہزار روپے گرانٹ ملنا شروع ہوگیا۔ جو دس سال کے بعد آج تک وہی پچیس ہزار روپے سے آگے نہیں بڑھی ۔ ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اس فنڈ کو صحیح استعمال نہیں کر رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ گرانٹ کا مطالبہ بھی اس دس سال کے دوران میں نہیں کرسکی۔ مگر حکومت نے بھی شاید کسی مقصد کے تحت ان کو یہ گرانٹ دے کر مکمل طور پر ڈھیل دے رکھی ہے۔ (بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے بارے میں میرا قسط وار مضمون ماہنامہ "بلوچی دُنیا" (ملتان) میں چھپ چکا ہے۔)

گزشتہ پچیس سالوں میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں پاکستان میں بلوچی زبان کو جس طرح ہر میدان میں نظر انداز کیا جارہا ہے، اس کی مثال موجودہ وقت کی کسی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ جس طرح حکومت نے بلوچی زبان کو نظر انداز کردیا ہے اس کی پیروی

میں دوسری زبانوں کی انجمنوں اور اداروں نے بھی یہی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں چند موٹی موٹی مثالیں دوں تو کسی حد تک حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

اس ملک میں ایک مدت سے رائٹرز گلڈ انجمن قائم ہے لیکن بلوچی زبان کو آج تک اس میں نمائندگی نہیں ملی۔ ہر سال ہر زبان کی کتابوں پر انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ مگر کبھی ایک بار بھی بلوچی کتابوں کو اس میں شریک نہیں کیا گیا۔ اور دوسری طرف اُن کتابوں اور انجمنوں کے لئے اس کے دیدہ و دل فراشِ راہ ہیں جو کسی بھی صوبائی زبان سے متعلق نہیں ہیں ــــ یہ عین ممکن ہے کہ آج تک رائٹرز گلڈ انجمن کی لائبریری میں بلوچی کتابوں کو رکھنا تک گوارہ نہیں کیا گیا ہے۔

کراچی میں بلوچوں کی جتنی بڑی تعداد اکٹھی آباد ہے وہ شاید پاکستان کے کسی دوسرے ایسے شہر میں نہیں ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جتنے بلوچ کراچی شہر اور اس کے گرد و نواح میں رہتے ہیں، ان کی آبادی صوبہ بلوچستان کی نصف آبادی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن کراچی کے کسی بھی صوبائی یا بین الصوبائی، لسانی، ادبی ثقافتی پروگرام میں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر کبھی بھی ان کو کوئی نمائندگی نہیں دی جاتی ہے۔ اور کبھی اتفاق سے کسی ایسے پروگرام میں چند منٹ دیئے بھی گئے تو اس میں محض اس قوم کی زبان، کلچر، تہذیب اور تمدن کی اہانت اور تمسخر و تحقیر ہی مقصد تھا۔ جو حقیقتاً قابلِ صد ہزار افسوس ہے۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۹۴۹ء سے پینتالیس منٹ کا اشک شو نما پروگرام بلوچی زبان میں نشر ہونے لگے تھے۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں محض اس بہانے بند کر دیئے گئے کہ اب بلوچی نشریات کوئٹہ اسٹیشن سے شروع کئے گئے ہیں۔ تو کیا کراچی میں رہنے والے بلوچوں کو اپنے مقامی اسٹیشن سے پینتالیس منٹ کے بلوچی نشریات کا بھی حق نہیں۔ ویسے ریڈیو پاکستان کے رویے اور بلوچوں سے ان کے سلوک کے بارے میں مجھ سے زیادہ کون واقف ہو سکتا

ہے جبکہ میں پورے پانچ سال تک اسی بلوچی نشریات کا کراچی ہی میں انچارج رہا اور اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کا ادارہ اور افسران نے بلوچی زبان اور بلوچی اسٹاف کے ساتھ جو رویہ اور سلوک اختیار کر رکھا تھا اس کی تلخ یادیں ابھی تک میرے ذہن میں ایسی تازی ہیں کہ جیسے کل کی باتیں ہوں۔ انشاء اللہ "ریڈیو پاکستان اور بلوچی زبان" کے عنوان پر بہت جلد مضمون مرتب ہو جائے گا۔

کراچی ٹی۔ وی ہی کو لیجئے۔ اس ادارے نے بلوچی زبان اور کلچر کا جتنا اور جیسا مذاق اڑایا اور اس کی مثال کسی دشمن کے ہاں تک نہیں ملتی۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ کراچی ٹی' وی اپنے دوسرے دیکھنے والوں کی تفریح طبع کے لئے ہی بلوچ کلچر اور بلوچی زبان کو کس طرح مسخ شدہ گھناؤنی حد تک دلازار رنگ کے پروگرام کی صورت میں پیش کرتی ہے اس کے بارے میں تفصیلاً لکھا جائے گا۔

حکومت ہی کی طرف سے قومی سطح پر جو بھی پروگرام مرتب ہوتے ہیں ان میں بھی بلوچی کلچر اور بلوچی زبان کا کوئی ذکر تک نہیں ہوتا۔ اور نمائندگی کا تو سوال تک پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جو حکومت پورے پچیس ۲۵ سال کے بعد بھی اپنے ایک پورے صوبے بلوچستان کے متعلق کوئی صحیح معلومات تک حاصل نہ کر سکی ہو تو بھلا وہ اس قوم بلوچ کی بلوچی زبان اور کلچر کی طرف کیونکر توجہ دے گی۔

گزشتہ پچیس ۲۵ سالوں میں حکومت کے کسی ذمہ دار آفیسر کے منہ سے بلوچی زبان کا نام تک نہیں سنا گیا۔ پچیس سال کے بعد ایک مرکزی وزیر جناب کوثر نیازی کے منہ سے نہ جانے کس طرح بلوچی زبان کا نام نکل گیا۔ جس سے ہم پُر امید ہو گئے لیکن اس کے دو ایک مہینے بعد جب انہوں نے ایک خاص پروگرام کے تحت سات زبانوں میں چھپنے والے پاکستان کے ایک سرکاری باتصویر مجلے کے جاری کرنے کا اعلان کیا تو یہ دیکھ کر ہمیں تعجب تو بالکل نہیں لیکن افسوس ضرور ہوا کہ پاکستانی صوبائی زبانوں کے علاوہ بیرونی زبانوں کے نام اس لسٹ

میں شامل تھے مگر بلوچی زبان حسبِ دستور سابق بہ یک بینی و دو گوش اس مجلّے کے پروگرام سے بالکل خارج تھی اور اس کا ذکر تک نہیں آیا کہ اس بچاری زبان کا قصور کیا ہے۔ کہاں تک گنتے جائیں، اگر خود حکومت کا بلوچی زبان کے ساتھ یہ روّیہ ہے تو پھر پاکستان میں دوسری زبانوں کے ادارے یا صوبائی زبانوں کے علمدار اگر اس کے خلاف محاذ بھی قائم کریں تو بھی اچنبھے کی بات نہ ہوگی۔ بقولِ شیخ سعدیؒ ؎

اگر ز باغ رعیّت ملک خورد سیبے
برآورند درختاں اش ہمرہاں از بیخ

کہاں تک گنتے جائیں۔ مقصد یہ کہ بلوچی زبان کو ہر طرف اور ہر طرح سے دبایا جا رہا ہے اور اس عمل میں آشنا اور بیگانے میں کوئی فرق نہیں۔ اور یہ حال ابھی تک جاری ہے۔ جس کی کوئی معقول وجہ کم از کم آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنوں سے تو اس سے بھی زیادہ شکایت ہے کیونکہ اس وقت پاکستان میں رہنے والے بلوچوں میں صاحبِ حیثیت اور متمول لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن آج تک کسی نے بھی صحیح معنوں میں بلوچی زبان کے لئے ایک پائی کی اعانت گوارہ نہیں کی۔ اگرچہ بلوچوں میں خوانین ہیں، نوابین ہیں، سردار ہیں، لکھ پتی ہیں، بیوپاری ہیں، زمیندار ہیں، جاگیردار ہیں کارخانہ دار ہیں جو ہر روز ہزاروں روپے عیش کوشی میں پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی زبان اور کلچر کو زندہ رکھنے اور اس کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں نگاہ کرم کا اشارہ تک نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی شہرت یا سیاسی کسی غرض کی وجہ سے کسی کو ذاتی طور پر کچھ ہدیہ کرتے ہیں۔

پچیس[۲۵] سالوں کے بعد جب بلوچستان میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہاں صوبائی حکومت بن گئی تو بلوچی زبان و ادب سے متعلق لوگ پھولے نہ سمائے کہ کم از کم اب بلوچستان کی صوبائی حکومت اپنے صوبے کی زبان بلوچی کو ترقی دینے کے لئے ہر ممکن

کوشش کرے گی کیونکہ اس صوبے کی حکومت اُن لوگوں پر مشتمل تھی جنھوں نے گزشتہ چالیس سالوں سے بلوچ، بلوچستان اور بلوچی زبان کے نام پر قیادت اپنے ہاتھوں میں لے رکھی تھی۔ نہ فقط پاکستان بلکہ پورے برِاعظم ایشیا میں رہنے والے تمام بلوچوں کو انہوں نے یقین دہانی کی تھی کہ حکومت ہاتھ آتے ہی وہ سب سے پہلے بلوچی زبان کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس اس سیاسی گروہ کے قائد نے یہ اعلان کیا کہ اس صوبے کی زبان اردو ہوگی تو نہ صرف پاکستان بلکہ سارے برِاعظم کے بلوچوں نے صدائے احتجاج بلند کیا۔ تب انہوں نے بزعمِ خود یہ کہہ کر لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ابھی تک بلوچی زبان میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ صوبے کی سرکاری زبان بن سکے۔ لہٰذا اردو زبان اُس وقت تک عارضی طور پر صوبے کی سرکاری زبان رہے گی جب تک بلوچی زبان اس قابل ہو جائے۔ یعنی وہ زبان جس کی عمارت کی چھت غیر زبانوں کی دیواروں کی مرہون ہے اس میں سرکاری زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے اور دوسری طرف بلوچی زبان جس کو کسی دوسری زبان کی نیازمندی ہی نہیں وہ غیر صالح ہے۔ ہمیں اردو زبان سے کوئی دشمنی نہیں بلکہ ہمیں اس سے یک گونہ پیار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے لکھنے پڑھنے اور بولنے کو عار نہیں سمجھتے۔ اور کبھی بھی بلوچ قوم کی طرف سے اردو کے خلاف کوئی احتجاج بلند نہیں کیا گیا۔ لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہر زبان کو اپنا جائز حق ملنا چاہیئے مگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اردو لشکری زبان ہے اور اگر اس میں عربی، فارسی، ترکی بلوچی اور انگریزی وغیرہ زبانوں کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو وہ بالکل کفِ دست رہ جائے گی۔ اگر نہیں تو خالص ہندی بن جائے گی۔ اور دوسری طرف بلوچی زبان ایک بالکل منفرد مستقل (یعنی آزاد) زبان ہے جو کسی دوسری زبان کی قطعی نیازمند اور محتاج نہیں۔
اگر بلوچستان کے اس قائد کا مقصد جدید سائنسی اور ٹیکنالوجی کے فنی الفاظ سے ہے تو بھی ان میں سے اکثر بلوچی میں ترجمہ ہو چکے ہیں اور باقی الفاظ ترجمہ ہونے تک اسی طرح استعمال ہونے

رہیں گے۔ جس طرح کہ اردو میں مستعمل ہیں کیونکہ اردو خود اسی مشکل سے دوچار ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اردو کی مشکل کبھی بھی حل ہونے کی ہے ہی نہیں۔ ویسے یورپی ترقی یافتہ تمام زبانیں بھی اس سلسلے میں دوسری زبانوں کی محتاج ہیں۔

اب "اردو" اور "بلوچی" زبان میں ایک ہی جملے کو پڑھیئے اور خود انصاف کیجئے۔

"حکومت بلوچستان نے یہ اعلان کیا ہے کہ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے لئے ایک اناؤنسر کی ضرورت ہے۔ خواہش مند حضرات کو چاہیئے کہ اپنی درخواستیں متعلقہ ادارے میں ماہ حال کی دس تاریخ تک داخل کریں۔"

اس جملے میں "حکومت، اعلان، جاری، ضرورت، حضرات، متعلقہ، ادارہ حال، تاریخ، داخل۔" یہ سب الفاظ خالص عربی ہیں۔ پھر "ریڈیو، اناؤنسر" انگریزی کے الفاظ ہیں۔ جب کہ "خواہش مند، درخواست فارسی اور ماہ" فارسی اور بلوچی کا مشترک لفظ ہے اور اردو کی پونجی اس طویل جملے میں صرف ہندی کے "نے، یہ، کیا، ہے کے لئے، ایک، کی، کو، چاہیئے، اپنی، میں، دس، تک، کریں" ہیں۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ اردو کی عمارت کن ستونوں پر قائم ہے۔ اب اسی جملے کا ترجمہ بلوچی زبان میں ملاحظہ ہو۔

"بلوچستان ءِ پرگنگداری ءَ جار پر بیتگ کہ پہ شال ءِ ونگش ءِ شنگجاہ ءَ جار چینئے پکار اِنت، واھگدار وتی دسبندیاں ھمے ماہ ءِ دہ ءَ پہ کار سرین کارگس ءَ دیم بکنائین اِنت۔"

اس جملے میں آپ کو ایک لفظ بھی غیر بلوچی نہیں ملے گا۔ اب کوئی بتا دے کہ

صلاحیت کس عجوبۂ روزگار کا نام ہے۔ پس یہ مصلحت پسندی نہیں تو اور کیا ہے۔ مصلحت پسندی کا یہ ان کا پہلا اظہار تھا اور دوسرا اوار نام نہاد " بلوچی کنونشن " میں دو گھنٹے کے اندر اندر یہ فیصلہ سنا تا تھا کہ بلوچی زبان رومن رسم الخط میں اتاری جائے گی کیونکہ بلوچی زبان کا موجودہ رسم الخط موجودہ دور کی ضروریں پورا نہیں کر سکتا ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

خیر ہم تو ان قائدین کی مصلحت پسندی سے اچھی طرح واقف تھے اور اُن کے اس فعل سے ہمیں قطعی حیرت تک نہ ہوئی کیونکہ ان سے کوئی اور اُمید رکھنا حماقت تھی لیکن اب جو نئی گورنمنٹ بنی ہے اس کو شاید ابھی تک یہ خبر تک بھی نہیں ہے کہ جس صوبے کی حکومت ان کے ہاتھ میں ہے وہاں بلوچی زبان بھی کسی شے کا نام ہے۔

من از بیگانگاں ھرگز نہ نالم
کہ با من ھرچہ کرد آں آشنا کرد

بلوچی رسم الخط

بلوچی زبان و ادب پر گفتگو کرتے وقت اگر بلوچی رسم الخط کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے تو زیادتی ہوگی کیونکہ جب سے بلوچی زبان کے دورِ جدید کا آغاز ہوا ہے اس ٹاپک ( ) پر کافی لے دے ہوتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل میں جانے ہوتے اگر گزشتہ صفحات میں مذکورہ کچھ باتوں کا اعادہ ہو جاتے تو عفو و درگزر مطلوب ہے۔

محققین اور علماء اَلسنہ یا زبان شناس عالموں کا اب تو یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بلوچی زبان آرین گروپ کی اوستائی زبان سے متعلق ہے۔ جس کے بارے میں گزشتہ صفحات میں بحث ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ھخامنشی شاہنشاہوں کی اپنی خاندانی اور درباری زبان بھی بلوچی ہی تھی لیکن ہمارے ہاں اِن نبشتوں اور کتبوں کے سوا کوئی اور چیز اثبات کے لئے حاضر نہیں ہے۔ البتہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ

بلوچی ایک ایسی زندہ جاوید زبان ہے جس نے ماقبل تاریخ سے اس پر جائز و عائد شدہ ظلم و تعدی کے مقابلے میں نہایت پائیداری اور پامردی سے قائم رہ کر تمام مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرکے اپنی حقیقت اور اصلیت کو آج تک قائم رکھنے میں کھُلی کامیابی حاصل کی ہے ۔ اس سے ہمیں انکار بھی نہیں کہ یہ قوم ہمیشہ ملوک الطوائفی ادوار میں رہی ہے ۔ چونکہ اس قوم میں مرکزیت کالعدم تھی اس لئے اسی قبائلی نظام حیات کے تحت جیتی رہی ہے اور انہی اسالیب و حقائق پر اس کی تاریخ مرتّب ہوتی رہی ہے ۔

کہتے ہیں کہ سردار میر چاکر رند (۱۴۵۴ ــ ۱۵۱۵) بلوچوں کا سب سے پہلا سردار ہے ۔ جس نے بلوچوں کو کسی حد تک ایک جزوی مرکز کے تحت اکٹھا کیا ۔ جزوی اس لئے کہ اسی میر چاکر رند کے زمانے میں بھی کئی بلوچ سرداروں کے متعدد قبیلوں کے بڑے گروہ کا سردار میر گوھرام لاشاری تھے جس کے پرچم تلے یہ جمع ہوئے تھے جس کی طاقت میر چاکر رند سے کسی طرح بھی کم نہ تھی اور اسی طرح اس کی مرکزیت بھی ان سے کمزور نہ تھی ۔ اس کی بیّن شہادت ان فریقین کے مابین سالہا سال کی کشاکش اور اختلافات ہیں جن کا نتیجہ روائتی تیس سالہ لڑائیاں ہیں، جن کے دوران کبھی ایک فریق غالب آجاتا تو کبھی دوسرا ۔ لیکن یہ غالبیت یا مغلوبیت اس وقت تک ان کے مابین قطعی فیصلہ نہ کرسکی کہ جب تک کہ بہادر لاشاریوں نے رند قبائل کے گنے چنے سپہ سالار اور دیگر بہادروں کو ختم نہ کر ڈالا اور اسی آخری لڑائی میں دوسری بار شکست فاحش دے کر فتح کا سہرا لاشاری اور اُن کے بڑے سردار میر گوھرام کے بہادروں نے اپنے سر باندھا ۔ اور رندوں کے سردار میر چاکر اپنے وطن سے دور ست گڑھ میں جلا وطنی کی حالت میں اپنے زخموں کو چاٹتے چاٹتے طبیعی موت مرگیا ۔

چاکر رند کی طرح بلوچستان کے دوسرے حصوں اور علاقوں میں بھی ایسی ہی بلکہ

اس سے بھی زیادہ مضبوط مراکز قائم کرنے میں کئی ایک اور بلوچ سردار کامیاب ہوگئے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کے خلاف وقت کے سب سے بڑے شاہنشاہ ہمیشہ صف آرا ہوتے رہے اور اس قوم کو منظم نہ ہونے دیا۔

چاکر کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس کو صرف اپنے ہی بلوچ قبائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا ورنہ بلوچستان کے دوسرے سرداروں کی طرح اگر اُس کو شاہنشاہوں سے پالا پڑتا، تو شاید چاکر کے نام تک سے آج کوئی آشنا نہ ہوتا۔ اور تو چھوڑیئے لاشاریوں ہی کے سامنے چاکر ٹک نہیں سکتا تھا۔ اور جب بھی شکست کھاتا تو غیر بلوچ مجاور حکمرانوں کے دربار میں فوج، اسلحہ اور ساز و سامان جنگ کی بھیک مانگنے پہنچ جاتا اور انہی کے ذریعے تھوڑی بہت مدت کے لئے وہ دوبارہ کامیابی کا منہ دیکھتا۔

میر گوہرام یا میر چاکر رند یا اسی قبیل کے کسی حد تک منظم دوسرے سرداروں کے زمانے میں اگر بلوچی زبان کے لکھنے پڑھنے کی طرف ذرا بھی توجہ دی جاتی تو آج بلوچی زبان دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح چھاپے خانے اور قومی زبان کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی۔

ہم چاکر، گوہرام اور ان کے زمانے کے دوسرے بڑے سرداروں یا حاکموں کو اس ذمہ داری سے کسی حد تک بری کر سکتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے بعد جب کہ پورے بلوچستان میں کئی ایک خود مختار بلوچ ریاستیں قائم ہوگئی تھیں۔ کسی ایک سردار، حاکم یا عالم اور ادیب نے بلوچی زبان کی طرف توجہ نہیں دی۔

ایرانی بلوچستان میں تو خیر ملوک الطوائفی نے ہر ایک چھوٹے ٹکڑے کو ایک جابر سردار کی ملکیت یا جاگیر بنا رکھا تھا اور ان کی آپس میں سال کے بارہ مہینے بے وجہ لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ مگر مشرقی بلوچستان میں انگریزوں کی مہربانی سے خوانین قلات کی سرکردگی

میں ایک جدید رنگ کی سرداریت یا حاکمیت قائم کی گئی تھی اور خوانین قلات اور ان کے لائق اور قابل معاونین جدید ضروریات سے آگاہ ہو چکے تھے ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف انگریز افسران اور مستشرقین بلوچی زبان کو سیکھنے، اس کے اشعار کے ادبی سرمایہ کو جمع کرنے میں اس قدر منہمک ہیں کہ جیسے وہ اپنی ہی قوم کی بھلائی اور بہبود اس میں مضمر دیکھتے ہیں ۔ لیکن دوسری طرف خوانین قلات نے نہ تو خود زبان و ادب کو اہمیت دی اور نہ ہی کسی اور کو اس سلسلے میں ہدایت یا مشورہ دیا ۔ بلکہ اس کے برعکس اس کام میں ہمیشہ روڑا اٹکاتے رہے ۔ خوانین قلات کے لئے یہ بات ایک سعادت سے کم نہ ہوتی اگر وہ بلوچی زبان کی ترویج و ترقی میں ذرا بھی متوجہ ہوتے ۔ لیکن اس کے برعکس خوانین قلات نے فارسی زبان ہی سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کی جدوجہد جاری رکھی اور اسی فارسی زبان میں اپنے تمام سرکاری دفتری کاروبار چلاتے رہے لیکن اس کے باوجود ماسوای چند ایک شخصیتوں کے تمام ملک اس فارسی پر کبھی عبور حاصل نہ کر سکا ۔ فارسی اگرچہ بلوچوں کے لئے کچھ ایسی مشکل زبان نہیں ہے مگر ہر زبان کے کچھ خاص اصول و قواعد ہوتے ہیں جن کے بغیر زبان زبان نہیں رہتی ۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچوں کو فارسی زبان نے جیسے کہ ضروری ہے فائدہ نہیں پہنچایا ۔ بلکہ ان کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا کر چھوڑ دیا ۔ دوسری طرف خوانین قلات اگر بلوچی زبان کی طرف توجہ کرتے اور اس کے نوشت و خواند کے سلسلے میں کوئی طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیتے تو آج بلوچی زبان و ادب کا سرمایہ اس طرح تلف نہ ہوتا ۔ حالانکہ ان کے سامنے اس سلسلے میں کوئی سیاسی، اقتصادی یا کسی اور قسم کی رکاوٹ کھڑی نہیں کی گئی تھی ۔ لیکن اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان خوانین قلات کو سرے سے بلوچی زبان سے دلچسپی تو ایک طرف ایک قسم کی قابل نفرین عداوت تھی اور وہ عمداً اس زبان کو اسی طرح نیست و نابود کرنا چاہتے تھے ۔ لے دے کے خوانین قلات کی ساری

کی ساری تاریخ میں جام دُرّک ڈومب کی کا نام اس ضمن میں لیا جاتا ہے کہ وہ نصیر خان کے درباری شاعر تھے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ جام دُرّک تو شروع سے کوئی شاعر تھا ہی نہیں بلکہ جیسے کہ مستند ہے وہ قبیلۂ ڈومب سے متعلق تھا جن کا کام گانا بجانا ہے اور جام دُرّک محض ایک گانے والا تھا جس کو بلوچی زبان میں "پہلوان" کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں بلوچی زبان میں اِسی "پہلوان" کو شاعر بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں ایک پہلوان گویئے نے ایک آدھ نظم بھی کہی ہے۔ اور جس نے ایسے کیا اس کو بھی اعزازی طور پر "شاعر" کہا جانے لگا۔ اور آہستہ آہستہ یہی شاعر کا لفظ "پہلوان" کے لفظ کی جگہ مستعمل ہونے لگا۔ چنانچہ آج بھی بلوچ انہی "پہلوان" گویّوں کو شاعر کہتے ہیں۔ مثلاً رمضان شاعر، سالمین شاعر، ملّا موسیٰ شاعر، فیض محمد شاعر وغیرہ۔ ان کے لئے شاعر کا لفظ عزت کی خاطر استعمال ہوتا ہے اور صرف تحقیق پر آپ کو بتلایا جائے گا کہ وہ شاعر نہیں ہے بلکہ "پہلوان شاعر" ہے جس طرح کہ ہندوستانی گویّوں کے القاب خاں صاحب وغیرہ ہوتے ہیں۔ ایک اور زیادتی یہ ہے کہ کئی ایک ایسے گویّوں نے ان منظومات کے آخر میں زبردستی شوقیہ اپنے نام کا اضافہ کیا جس کی مثال آج تک مِل رہی ہے۔

تو مطلب یہ کہ جام دُرّک بھی اسی طرح کا ایک پہلوان شاعر

تھا جو پرانی روایات کے مطابق نصیر خان کے دربار سے منسلک تھا جو پرانی روایات کے مطابق نصیر خان کے دربار سے منسلک تھا

اِس "چہ دروغ وچہ راست" واقعہ کے علاوہ خوانین قلات کی تاریخ میں بلوچی زبان سے متعلق کوئی دلچسپی، دوستی، اور اخلاص کا مظاہرہ تو ایک طرف، معمولی خواہش تک کا اظہار نہیں کیا گیا۔ خوانین قلات کے اس احمد زئی خاندان کے جد امجد سے لے کر آخری معزول خان، احمد یار تک کسی نے بلوچیت کا ثبوت اور بلوچی زبان سے اپنا تعلق کسی بھی حقیر ترین انداز سے تک فراہم نہیں کیا۔ البتہ ایک حضرت نے بلنڈر یہ کیا تھا کہ اس نے خان عبداللہ کو بلوچی زبان کا شاعر منوانے کی کوشش میں صرف ایک نظم زبردستی اس سے منسوب کر دی یہ نظم اس نے بلوچی دفاتر اشعار میں سے چن کر بزعم خود خان عبداللہ کے مرتبے کے مطابق رکھ لیا۔ شاید وہ یہی سمجھ بیٹھے ہوں گے کہ یہ نظم اور کسی شخص کے ہاں موجود نہ ہوگی۔ چنانچہ اس نظم کو خان عبداللہ سے منسوب کر کے اس کی باقاعدہ تشہیر کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ غلط کام کرنے والے شخص کا حافظہ اور ذہن ہمیشہ کسی نہ کسی نکتہ پر جواب دے جاتا ہے۔ سب سے بڑی غلطی اس صاحب سے یہ ہوئی کہ اس نے بلوچی زبان کے ایک ماسٹر پیس نظم کو عبداللہ خان سے منسوب کر دیا حالانکہ یہ نظم شعلچہ کار ملا فاضل کی ان شاہکار نظموں میں سے ایک ہے جس کے مقابلے میں کوئی بلوچی شاعر آج تک کچھ کہنے کی جرآت نہ کرسکا۔ اس نظم میں وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس کے معانی ایک طرف ان کا تلفظ تک خوانین قلات کے خاندان کا ایک فرد آج تک صحیح ادا نہ کرسکا

گزشتہ تمام خونِ قلات کو ہم پھر بھی درگزر کرتے ہیں لیکن اس گدی کے آخری خان نے جو ۱۹۳۳ء میں گدی نشین ہو کر اس سائنس، ٹیکنالوجی، علم و حکمت کی تاریخی طور پر زرّیں ترین زمانے میں ۱۹۴۸ء تک اس بدبخت قوم پر مسلط رہنے کے باوجود کبھی بھولے سے بھی اسکی زبان کے بارے میں سوچنا تک گوارہ نہیں کیا۔ اگر اس سلسلے میں کوئی ایک خان بھی اس طرف بھولے سے بھی توجہ دیتا تو آج بلوچی زبان اپنے کھوئے ہوئے سرمایہ کے لئے یوں ماتم کناں نہ ہوتی۔ طرّہ یہ کہ آخری خان، معزول احمد یار خان نے معزولی کے بعد کئی ایک بار قوم اور زبان کی خدمت کرنے کے لئے نت نئے پروگرام اور لائحہ عمل بنا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اور اپنی تصمیم سے لوگوں کو یہ یقین دہانی کی کوشش کی کہ وہ گزشتہ تمام نقصانات، اغلاط اور لاپرواہیوں کی تلافی کریں گے۔ گفتار تک تو یہ ارادے پکے تھے مگر کردار و عمل کی صورت میں ایک معمولی قدم بھی نہیں اٹھایا گیا۔ اور بلوچ اقوام کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ کیونکہ وہ معزول خان کی ذہنیت سے واقف ہیں۔ اور اس کے یہ اعلانات اور پروگرام محض بلوچ عوام کو دھوکہ دینے کے لئے تھے جن کے ذریعے وہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عوام اب اس خان کی تمام چالوں سے واقف ہو گئے ہیں اور ان کے دل سے اس خان کی وقعت و عزّت کچھ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ خوانین قلات کے بارے میں عموماً اور خان احمد یار خان کے بارے میں خصوصاً ایک مضمون یا کتابچہ زیرِ تدوین ہے جس میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

بلوچوں کی تاریخ کے دَورِ ناخواندگی میں تو تمام اشعار زبانی ازبر کئے جاتے تھے۔ لیکن جب فارسی تعلیم بلوچستان تک پہنچی جو اکثر و بیشتر ملّاؤں اور مذہبی پیشواؤں کے

ذریعے ہوئی تو اس دوسرے دَور کے بلوچ شعراء نے اپنا اپنا کلام لکھ کر محفوظ کرنا شروع کردیا چونکہ فارسی زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جا رہی تھی تو بلوچی زبان بھی اسی رسم الخط میں لکھنا شروع ہوگیا۔ اور شعراء اپنا کلام اسی عربی رسم الخط میں لکھتے تھے۔

ھخامنشی شاہنشاہوں کے باقی ماندہ عہدِ قدیم کے ان کتبوں اور سنگ نبشتوں کے علاوہ بلوچی زبان کی جب اور جس زمانے میں بھی کتابت کی ابتداء ہوئی وہ یقیناً عربی رسم الخط ہی میں ہوئی ہے۔ چاہے یہ زمانہ فاروق اعظمؓ کا ہو، چاکر رند کا ہو یا اس کے بعد کا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ چاکری دَور میں بلوچی زبان باقاعدہ ضروریات کے مطابق مستعمل ہوئی ہو۔ البتہ ان ادَوار کی کوئی چیز ہم تک پہنچ ہی نہ سکی۔ لیکن اس سے انکار بھی تو نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایک منظم سرداری کے تحت مکاتیب، فرامین، وثائق، اسناد اور دیگر ادبی مواد ضرور کسی نہ کسی زبان میں لکھے جاتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں اگر ہمیں بلوچی میں لکھی ہوئی کوئی چیز نہیں مل رہی ہے تو انہی سرداروں کے زمانے کی اُن کی سرداریت سے متعلق کوئی ایسی چیز کسی دوسری زبان میں ہمیں نہیں مل رہی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایسی چیز دست بُردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی اور صرف وہی چیزیں ہم تک پہنچ سکیں جو کاغذی نقوش کی مرہونِ نہ تھیں اور جن کو بلوچوں نے اپنا سب کچھ سمجھ کر سینہ بہ سینہ منتقل کیا جو آج منظومات، لوک کہانیوں، ضرب الامثال وغیرہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

جس زمانے میں انگریز مستشرقین نے بلوچی شعری ادب کو اکٹھا کرنا شروع کیا تھا اس کے ساتھ نثری ادب کا کچھ نہ کچھ حصہ جب بھی ان کے ہاتھ لگا ریکارڈ کرتے گئے۔ چونکہ وہ "رومن" رسم الخط جاننے والے تھے اس لئے انہوں نے اپنی علمیت کے مطابق اپنے رومن رسم الخط میں بلوچی ادبیات لکھنا اور ریکارڈ کرنا شروع کردیا۔ لیکن یہ بات

قابلِ ذکر ہے کہ اس عمل سے ان کا مطلب یہ تو ہرگز ہرگز نہ تھا کہ بلوچی رسم الخط رومن ہے۔ بلکہ چونکہ وہ خود عربی رسم الخط سے ناآشنا تھے اس لئے انہوں نے رومن لکھنا شروع کر دیا۔ ان کے لئے اور کوئی چارہ کار تھا ہی نہیں۔ ان کے لئے یہی رومن رسم الخط واحد ذریعہ تھا جس کے وسیلے سے وہ بلوچی رسم الخط سیکھ سکتے تھے۔ انہی مستشرقین نے جب بعد میں عربی رسم الخط پر کسی حد تک دستگاہ حاصل کی تو بلوچی زبان کو اسی عربی یا بلوچی رسم الخط میں مغربی ممالک میں متعارف کیا۔ یعنی رومن رسم الخط وہ محض اپنے اور اپنے لوگوں کے لئے تعلیم و ہدایت کی خاطر استعمال کرتے رہے۔ تاکہ لوگ "بلوچی رسم الخط" پر عبور حاصل کر سکیں۔ چنانچہ یہ اثبات اُن کی ہر تصنیف میں عیاں اور آشکار ہے۔

انہی دنوں کئی ایک مستشرقین جن کو عربی زبان یا فارسی زبان اور ان کے رسوم الخط سے آشنائی ہو چکی تھی، نے بلوچی اشعار و قصص اور دیگر نوشتہ جات بھی بلوچی رسم الخط ہی میں اکٹھا کر کے ریکارڈ کر لئے تھے جن کا بین ثبوت جوزف الفائن بیٹن کے اس حوالے سے ملتا ہے جو اس نے ایک چھوٹے سے کتابچہ "شاہ بہرام گُلندام" کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس قصّے کا بلوچی رسم الخط میں لکھا ہوا متن برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ میوزیم نے اس کے مسودے کو ۱۸۶۱ء میں ایک انگریز بیوہ عورت سے خریدا تھا اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس بیوہ کو یہ مسودہ کب، کہاں اور کیسے دستیاب ہوا ہے۔

ویسے تو بلوچی شعری ادب کی نشأۃ ثانیہ یعنی اٹھارہویں صدی سے تو بلوچی کے تمام شعراء کا کلام اسی بلوچی رسم الخط میں لکھا اور محفوظ کیا جانے لگا۔

اسلام سے پہلے اگر بلوچی زبان کسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی تو وہی رسم الخط ہو گا جس میں ایران کی دوسری زبانیں لکھی جاتی رہی ہوں گی۔ کیونکہ بلوچوں کا مسکن

اصلی اسی سرزمین کا ایک حصہ ہے۔ اگر اُس پرانے رسم الخط میں بلوچی زبان کی کتابیں یا دیگر مکتوبات نہیں مل رہی ہیں تو اس میں بلوچی زبان کو بحیثیت ایک محکوم، غیر منظم اور خانہ بدوش قوم کی زبان کے ہم دوشی نہیں ٹھہرا سکتے جبکہ ایران کی دیگر حکمران زبانیں بھی اس میدان میں ہارے ہوتے جواری کی طرح ہیں۔ البتہ ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی زبان باقی ایرانی زبانوں کی طرح اُسی سرزمین سے متعلق ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ایران کی کوئی بھی زبان کسی بھی رسم الخط میں لکھی گئی ہوگی، بلوچی زبان کے لئے بھی اُسی رسم الخط کو کام میں لایا گیا ہوگا۔ مگر اسلام کی آمد کے بعد ایران کی ہر زبان کا رسم الخط عربی میں ہو گیا۔

اسلام نے اگرچہ ایران کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بہت کچھ دیا مگر دوسری طرف عربوں نے اس سرزمین کی ہر قدیم اور موروثی آثار جو اُن کی دسترس میں آئے کالعدم کر دیا۔ انہی کالعدم ہونے والی چیزوں میں ایک یہی رسم الخط بھی تھا۔ چونکہ بلوچوں کو اسی سرزمین سے وابستگی تھی اس لئے اُن کی زبان بھی وہیں کے رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ مگر اسلام کے ریلے نے گزشتہ ہر چیز کو اس سرزمین سے اس سرزمین کی آئندہ نسلوں کے اذہان سے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالا۔ وہ بھی اس حد تک کہ اس سرزمین کے باسی اور اس سرزمین کی عزت اور عظمت اور بلند روایات کے گُن گانے والے اپنی ہر چیز کو اس قدر بھول گئے کہ خود اپنی زبان تک سے ناآشنا ہو گئے اور ان ایران نژادوں میں عربی زبان کے بہترین معلّم، صرفی، نحوی، منجم، طبیب، عالم جغرافیہ، فلسفی، حکیم اور منطقی پیدا ہو گئے جو آج تک عرب و عجم میں ان علوم و فنون کے اساتذہ مانے جاتے ہیں۔

یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایران کے فوراً بعد عربوں کا یہی ریلا مکران (موجودہ ایرانی اور پاکستانی بلوچستان) سے گزر کر سندھ تک پہنچ گیا اور ایرانیوں کی طرح ایران کے بلوچوں کے ساتھ بلوچستان کے بلوچوں اور سندھیوں کا رسم الخط بھی ذہنوں سے اس طرح

مٹا دیا کہ گویا ایسی کوئی چیز پہلے تھی ہی نہیں ۔ عرب جہاں جہاں بھی پہنچے وہاں کے رسم الخط کو سیلاب کی طرح بہا دیا اور عربی رسم الخط ان کے پلّے باندھ دیا ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام عرب ممالک کے علاوہ ایران، بلوچستان، افغانستان، سنٹرل ایشیا کی موجودہ روسی مسلمان ریاستیں، سندھ، پشتون کے باقی علاقے اور ہندوستان کے بعض حصوں میں یہ رسم الخط آج تک مستعمل ہے ۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی تاریخ سے یعنی تقریباً چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے فارسی، بلوچی پشتو، سندھی، پنجابی، سرائیکی وغیرہ تمام زبانیں اسی عربی رسم الخط میں لکھی جا رہی تھیں اور آج تک یہی سلسلہ غیر منقطع و غیر معترض جاری و ساری ہے ۔

البتہ جب مغربی عیسائی طاقتوں نے مشرق پر یلغار کے بعد قبضہ جمایا تو اُن کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی کہ عربی رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط رائج کیا جا سکے، جس کا سب سے بڑا مقصد لوگوں کو ان کے مذاہب، عقائد، روایات اور تہذیب سے بیگانہ بنانا تھا ۔ اگرچہ یہ طاقتیں اس سلسلے میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکیں لیکن انہوں نے اپنی زبان کی تعلیم و تدریس کے راستے مغربی زبانوں کے مشرقی محصلّوں کے دلوں میں رومن رسم الخط اور مغربی تہذیب کی وقعت ضرور بڑھا دی جس کا سب سے بڑا سبب مشرقیوں کے احساسِ کمتری کا نتیجہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مغربی تعلیم و تدریس و تربیت اور خیالات کو مہذّب اور ترقی یافتہ سمجھنے لگے تھے ۔ چنانچہ برصغیر سے انگریزوں کو چلے گئے آج چھبیس (۲۶) سال ہو چکے ہیں ۔ لیکن ابھی تک یہی نظریہ تعلیم یافتہ لوگوں میں قائم و دائم ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے ایک طبقہ محض دکھاوے یا فریب دہی کی خاطر اس عقیدہ یا نظریہ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے ۔

مطلب یہ کہ اسلام کی آمد کے بعد جب تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ بلوچی

زبان بھی اسی عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ اور جب ۱۹۴۷ء کے بعد بلوچی زبان کے دَورِ جدید کا آغاز ہوا اور ۱۹۵۰ء کے بعد عام بلوچوں کی کتابت و خطابت کا ذریعہ بننے لگی تو بھی اسی عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ البتہ چند ایک انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں نے اسی گزشتہ تبلیغاتی، عقائدی یا مغربی تعلیم و تربیت کے اثرات کی بنا پر ایک دفعہ پھر رومن بلوچی کا ذکر چھیڑا۔ لیکن یہ چیز اب ناممکنات میں شمار ہونے لگی کیونکہ اس وقت سیاسی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی، جغرافیائی، قومیتی غرض ہر لحاظ سے بلوچی زبان کے لیئے اسی عربی رسم الخط کو اپنانا مندرجہ فوق تمام نظریات کے منافی ہوگا۔ البتہ بلوچی زبان کی کچھ خاص آوازوں کی نمائندگی کے لیئے کچھ نئے علامات یا نشانات کی ضرورت ضرور پڑی تھی جو حسبِ ضرورت بعد میں پوری کی گئی۔

اگرچہ ۱۹۴۸ء تک دو تین بلوچی ادبی جماعتیں وجود میں آچکی تھیں لیکن کسی ایک جماعت یا انجمن نے اِس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اور پھر ۱۹۵۱ء وہ نیک سال ہے کہ جس میں راقم الحروف نے ان تمام جماعتوں کی مشترکہ میٹنگ بلا کر ان کے اتحاد پر زور دیا جس کے نتیجے پر "بلوچی زبان ءِ سرچمگ" نامی مشہور جماعت کی بنیاد پڑ گئی جس کا میں ہی جنرل سکریٹری نامزد ہو گیا۔

سب سے پہلے راقم الحروف نے بلوچی رسم الخط کی طرف توجہ دی اور بلوچی "آب" (حروفِ تہجی) متعین کیئے۔ یعنی اردو میں مستعمل الف بائیں سے عربی کے ایک درجن حروف کو ساقط کر کے نکال دیا کیونکہ بلوچی زبان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ حروف مستعمل ہوں۔

متروکہ حروف یہ ہیں۔ "ث، ح خ، ذ، ص ض، ط ظ، ع غ، ق"۔ علاوہ ازیں بلوچی زبان کی ضروریات کے مطابق نئے علامات و نشانات وغیرہ متعین کر کے "بلوچی رسم الخط" کی تکمیل کی۔ میں یہ فخریہ کہتا ہوں کہ آج سارے بلوچستان اور

بیرون بلوچستان میں تمام بلوچ اس رسم الخط کو اپنائے ہوئے ہیں جو میں نے ۱۹۵۱ء میں پیش کیا تھا۔ اس کا ہر لحاظ سے ثبوت موجود ہے۔ اگرچہ کچھ متعصب لوگوں نے عمداً و قصداً اس رسم الخط کو غیر مقبول بنانے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ان کی یہ مفسدانہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہو سکیں اور بالآخر وہ خود اس رسم الخط کو اپنانے پر مجبور ہو گئے۔ اگرچہ کبھی کبھی دو ایک بزعم خود زبان دانی کا دعویٰ کرنے والے اس رسم الخط کے سلسلے میں ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتے رہے مگر ان کا انجام ہمیشہ مضحک و مفضح ہوتا رہا۔

میں نے اس اصلاح اور تقدیم کردہ بلوچی رسم الخط کا نام بھی "بلوچی زبانِ سرچمگ" کی نسبت سے "سرچمگ املا" رکھا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے اس رسم الخط کو میری ہی نسبت سے "سید املا" کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن میں نے اس کے برعکس اس کا نام "سرچمگ املا" ہی مناسب و موزوں سمجھا اور آج بلوچی دنیا کا ہر شخص اس بلوچی رسم الخط کو اسی "سرچمگ املا" کے نام سے جانتا ہے۔

"سرچمگ املا" میں یہ "بلوچی رسم الخط" سن ۱۹۵۲ء سے بلوچی دنیا میں رائج ہے حتیٰ کہ مغربی ممالک کے جدید مستشرقین نے بھی اس کو خیر مقدم کر کے اپنا لیا ہے۔ البتہ ۱۹۷۲ء میں بلوچی زبان و ادب اس کے رسم الخط کی تباہی اور بربادی کے لئے ایک مذموم، منظم اور مقتدر پروگرام بنالیا گیا۔ وہ یہ کہ جب پاک بلوچستان میں اپنی تاریخ میں پہلی بار نمائندہ حکومت کی تشکیل ہو گئی تو بلوچوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ اب بلوچی زبان میں مثبت قدم اٹھایا جائے گا لیکن اُس سال کے ستمبر کے مہینے میں بلوچستان کے منتخب وزیر تعلیم نے ایک عجیب و غریب برائے نام بلوچی کنونشن

بلاکر دو گھنٹے کی بحث کے بعد یہ اعلان کردیا کہ "ہم بلوچی زبان کو رومن رسم الخط میں تبدیل کریں گے ۔" اس کے جواب میں میرا مضمون "بلوچی رسم الخط" کے عنوان سے روزنامہ حرّیت کراچی میں شائع ہوچکا ہے ۔

اس وقت بادی النظر میں "سرّجمگ املا" نے بلوچی زبان کے رسم الخط کی تکمیل کردی ہے اس کے بعد حسب دستور "املا" یا خود بلوچی زبان میں فطری تبدیلیاں (اگر ممکن ہوا) خود واقع ہوتی رہیں گی جن کا تدارک یا سدّباب کسی کے بس کی بات نہیں ہوگی ۔

مقصد یہ کہ کوئی بلوچ یا غیر بلوچ اپنا قیمتی وقت "سرّجمگ املا" کے خلاف بے بنیاد یا تعصب و بغض و عناد کی بناء پر غیر صالح تبلیغات میں ضائع نہ کرے تو بلوچی زبان اس کی ممنون رہے گی ۔ کیونکہ رسم الخط اور املا کے سلسلے میں بلوچی زبان کی تکمیل ہوچکی ہے اور اگر ربع صدی گزرنے کے بعد کوئی محض ذاتی کینہ اور عداوت کی خاطر اس کے خلاف صف آرائی کرے تو اپنے آپ کو بلوچی زبان، بلوچی ادب، بلوچ قوم اور بلوچستان کا سب سے بڑا دشمن ثابت کرنے میں ضرور کامیاب رہے گا ۔

ادبی انجمنیں :۔ اگر ہم خاص خاص بلوچی ادبی انجمنوں کا اجمالی ذکر کریں، جنہوں نے اس سلسلے میں کاوشیں کی ہیں تو بے جا نہ ہوگا ۔

بلوچی حلقۂ ادب :۔ ۱۹۴۹ء میں جب بلوچی زبان کی نشریات ریڈیو پاکستان کراچی سے شروع ہوگئیں تو سب سے پہلے ادبی انجمن جو وجود میں آئی وہ "بلوچی حلقۂ ادب" ہے ۔ اس انجمن کو بلوچی زبان سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں نے قائم کیا۔ ان نوجوانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر اس اسکرپٹ کو جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والا ہوتا تھا مطرحِ بحث قرار دے کر تنقید و تبصرہ اور اصلاح

کے بعد پیش کرنے کی کوشش کرتے ۔ مقالے یا مضامین کے علاوہ شاید بلوچی زبان کی تاریخ میں سب سے پہلا ریڈیائی ڈرامہ اسی انجمن نے تیار کرکے پیش کیا ۔ اس انجمن میں قابلِ ذکر ادباء اور شعراء میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ۔

(۱) رسول بخش شاھین (پاگواجہ) اچھے مقالے لکھتے تھے ۔

(۲) محمد علی بلوچ ۔ مضامین کے علاوہ اچھے ڈرامہ اور فیچر لکھتا تھا ۔

(۳) احمد زہیر (شاعر) جو اس زمانے میں "شمیم" تخلص رکھتا تھا ۔

(۴) ماسٹر محمد حسن تاج (شاعر اور مضمون نگار)

(۵) جمعہ شیر امرحوم (شاعر) ۔ دو سال تک یہ انجمن مستعدی سے ادب اور زبان کی خدمت میں لگی رہی اور بعد میں "بلوچی زبان ءِ سرچمگ" میں ضم ہوکر اپنے خلوص کا ثبوت دے گئی ۔

بلوچی بزمِ ادب :۔ یہ انجمن بھی ۵۱ - ۱۹۵۰ء میں قائم ہوئی تھی ۔ اس کے بانی جناب خیر محمد ندوی تھے جو بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی کے تا دم حیات جنرل سکریٹری ہیں ۔ ویسے اس سوسائٹی کا مقصد بلوچوں میں تعلیم عام کرنا تھا ۔ اسی سوسائٹی کی نگرانی میں "بلوچی بزم ادب" کی انجمن کی تشکیل ہوئی ۔ چونکہ اس سوسائٹی کے اکثر اراکین علماء یا علماء سے متعلق لوگ تھے اس لئے اس کی نگرانی میں "بلوچی بزم ادب" پر بھی یہی عنصر غالب رہا ۔ اُن میں چند شخصیتیں یہ تھیں ۔

(۱) جناب مولوی عبدالخالق آفاقی (۲) مولوی محمد حسین عاجز (مرحوم)

۱۹۵۱ء میں "سرچمگ" بن گیا تو اس انجمن نے بھی "سرچمگ" میں شامل ہونے کا اعلان کیا لیکن اس کے باوجود دوبارہ اپنی جداگانہ تنظیم کی کوشش کی، لیکن اس کو لبیک کہنے والا کوئی نہ تھا ۔

بلوچی ادب ءِ مجلس :۔ یہ مجلس اگرچہ اچھے ارادوں کے ساتھ قائم ہوئی مگر "سرحمگ" کا ظہور ہوتے ہی یہ اس میں پرخلوص طور پر مدغم ہو گئی۔

سرحمگ :۔ ۱۹۵۱ء کا سال تھا اور مجھے ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے دوسرا سال جارہا تھا۔ کراچی کی سب سے زیادہ سرگرم انجمن "بلوچی حلقہ ادب" نے مجھے اپنی مجلسوں میں مدعو کرنا شروع کرلیا جب میں ان میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تو اس انجمن نے متفقہ طور پر مجھے اپنا جنرل سکریٹری چن لیا۔ اور چند ہی مہینوں کے بعد میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ساری بلوچی ادبی انجمنوں کو متحدہ طور پر کام کرنا چاہیئے تاکہ مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر بلوچی زبان و ادب کی خدمت ہو سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں باقی انجمنوں سے رابطہ قائم کرنے اور اتفاق کرنے کے بعد سب کے اتحاد اور ایک نئی انجمن کی شکل میں "بلوچی زبان ءِ سرحمگ" کا اعلان ہوا۔

اسی "سرحمگ" ہی کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے میں نے بلوچی کی موجودہ املا کو درست کیا اور ضرورت کے مطابق اس کے رسم الخط کے لئے حروف کو بڑھا گھٹا کر بلوچی زبان کے جدید ترین تقاضوں کے مطابق اس کا رسم الخط یا صحیح معنوں میں املا کی تکمیل کی اور یہی املا یا "سید املا" کے نام سے اس قدر مقبول ہوگئی کہ گزشتہ ربع صدی سے بلوچی اسی رسم الخط اور املا میں لکھی جارہی ہے۔

۱۹۵۵ء میں چند حضرات کے ذاتی بغض و عناد نے "سرحمگ" میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس تفرقہ اور نفاق سے بچنے کے لئے مجھے کراچی چھوڑنا پڑا تاکہ باقی لوگ "سرحمگ" کو متحدہ طور پر چلا کر بلوچی زبان کی خدمت جاری رکھیں۔ لیکن یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ جس دن سے میں نے کراچی چھوڑ دیا اس دن

سے "سَرتچگ" پرتالا پڑگیا۔

ان تین چار سالوں کی قلیل مدّت میں "سَرتچگ" نے بلوچی زبان کی جو خدمت صحیح اور پُرخلوص طور پر کی تھی اس کی مثال آج تک کوئی دوسری انجمن قائم نہ کرسکی۔

بلوچی اکادمی کراچی :۔ یہ اکادمی ۱۹۵۸ء میں جمعہ خان بلوچ کی سرگردگی میں قائم کی گئی۔ اس اکادمی کو متعلمین یعنی محصّلین کا بڑا تعاون حاصل تھا۔ اس اکادمی نے ۱۹۵۸ء میں "متاگ" نامی ایک شعری مجموعہ شائع کیا اور اسکے بعد تین اور کتابیں یعنی "زھگ بلد" (بلوچی قاعدہ) "بلوچی ادب کی تاریخ" اور آخر میں "شپ گروک" شائع کیں۔ بعد ازاں اس اکادمی نے سیاست میں الجھ کر ادبی خدمت کا موقع کھو دیا۔

بلوچی ادبی بورڈ :۔ یہ انجمن پہلے "لیاری ادبی بورڈ" کے نام سے قائم ہوئی لیکن بعد میں اس کا نام تبدیل کرکے "بلوچی ادبی بورڈ" رکھا گیا۔ اگرچہ اس انجمن کو قائم ہوئے کئی سال گزرے ہیں مگر بلوچی زبان کی خدمت کے سلسلے میں اس کا کوئی خاص کنٹری بیوشن نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ادبی مجلسیں اور مشاعرے بھی شاذو نادر ہی ہوا کرتے ہیں۔ البتہ اردو زبان میں شائع ہونے والا ایک پندرہ روزہ جریدہ "صدائے بلوچ" اس ادارے سے کسی صورت میں متعلق نظر آتا ہے۔ صحیح معنوں میں قاضی عبدالرحیم صابر جو اس انجمن کے بانی ممبران میں سے ہیں خود ہی "بلوچی ادبی بورڈ" ہیں۔ جو ساری کی ساری ذمّہ داریاں تن تنہا اٹھا رہے ہیں اور جریدہ "صدائے بلوچ" کو بھی اپنی ذمہ داری پر چلا رہے ہیں۔

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ :۔ ۱۹۶۱ء میں قائم ہوگئی ۔ مرکز کی طرف سے ۲۵ ہزار سالانہ گرانٹ مل رہی ہے ۔ اگرچہ اس اکادمی سے کافی امیدیں وابستہ تھیں اور یہ زبان و ادب کی بہترین خدمت کر سکتی تھی مگر گزشتہ بارہ سال میں زبان و ادب کے سلسلے میں کبھی ایک بار بھی کوئی علمی اجتماع نہ کرسکی ۔ البتہ بلوچی، اردو، فارسی، انگریزی زبانوں میں کوئی پچیس چھبیس کتابیں شائع کر چکی ہے جو اس اکادمی کی کُلّی کارکردگی ہے ۔ ممکن ہے اب اس اکادمی نے آٹھ دس کتابیں ایسی شائع کی ہوں گی ۔ لیکن اس اکادمی کا سارا کام یہی چند کتابیں ہی ہیں ۔ مثال کے طور پر ہم پشاور کے پشتو اکیڈمی کی کارکردگی پر ایک نظر ڈال کر دیکھتے ہیں کہ اُس پشتو اکیڈمی نے اتنی ہی مدّت میں پینتیس کتابوں کے چھاپنے کے علاوہ اور جو کام کیئے وہ ملاحظہ ہو ۔ درجن بھر کتابیں چھپائی کے لئے تیار ہیں ۔ لائبریری میں چھ ہزار سے زائد کتابیں، پونے پانچ سو قلمی نسخے، ۳۲ نادر پشتو کتابوں کی مائیکرو فلم کاپیاں برٹش میوزیم سے حاصل کی جا چکی ہیں ۔ سہ لسانی (پشتو، اردو، انگریزی) سائیکلوپیڈیا نما لغت ۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس اکادمی کا طریق کار قومی کے بجائے نجی ہے ۔ (ماہنامہ "بلوچی دنیا" ملتان) میں راقم الحروف کا قسط وار مضمون "بلوچی اکیڈمی کوئٹہ" میں تفصیل ملاحظہ ہو ۔

فاضل اکیڈمی :۔ ۱۹۶۹ء میں چند ادباء شعراء کی کاوشوں سے قائم ہوگئی اور اسی سال اس کے ایک رکن مراد ساحر کا مجموعہ کلام "پاھار" کے اور پھر دوسرے سال اس کے دوسرے رکن احمد زھیر کا مجموعہ "زیتیں زھیر" شائع کرنے کے بعد شاید اپنا مشن پورا کر کے دکان بڑھادی ۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس وقت سارے پاکستان میں "بلوچی اکادمی کوئٹہ" کے سوا کوئی اور بلوچی ادبی انجمن باقی نہیں ہے۔ "بلوچی اکادمی کوئٹہ" کا وجود بھی مرکز کی امدادی رقم کی مرہون ہے۔ اس اکادمی کے علاوہ باقی تمام ادبی انجمن اور ادارے اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ ان کے نابود ہونے کا سب سے بڑا سبب اقتصادی بحران ہے۔ چونکہ ادباء، شعراء اور زبان شناس یا زبان دوست بلوچ تقریباً سو فی صد قوت لایموت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے وہ اس قسم کے اداروں کے اخراجات کو برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ ویسے وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر اچانک کوئی نہ کوئی انجمن یا ادارے کا آغاز کرتے ہیں لیکن مالی مشکلات اور اخراجات کا سامنا کرتے ہوئے بُری طرح شکست کھاجاتے ہیں۔ اگرچہ بلوچ خوانین، سردار، کارخانہ دار، بیوپاری اور دیگر متمول لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر وہ اس سلسلے میں تعاون کے لئے کسی صورت میں تیار نہیں ہیں۔

صوبائی زبانوں کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں مرکزی حکومت نے اپنا امدادی فنڈ "بلوچی اکادمی کوئٹہ" کو عطا کیا ہے جو اس ادارے نے اپنے مخصوص علاقے کے لئے مخصوص کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیگر صوبوں مثلاً سندھ، پنجاب اور سرحد کی حکومتوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے صوبوں میں رہنے والے بلوچوں کی خاطر یہاں کے بلوچ ادباء، شعراء اور زبان شناس ادبی خدمت کرنے والے لوگوں کو اعتماد میں لے کر بلوچی زبان کی سرپرستی کریں۔

بلوچی زبان و ادب کی خاطر ایک خود مختار اور مخصوص قسم کا منفرد ادارہ "بلوچی دیوان" کے نام سے کئی سال سے خاموشی کے ساتھ کام کرتا چلا

آرہا ہے۔ اس ادارے نے کئی ایک متمول لوگوں کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش بھی ہے۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت کے علاوہ صوبوں کی حکومتوں سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ بلوچی زبان کی ترقی کے لئے اعانت کا ہاتھ بڑھائیں لیکن یقین دہانیوں کے باوجود کسی جانب سے کوئی مثبت قدم ابھی تک نہیں اٹھایا گیا ہے۔

بلوچی کتب :۔ بلوچی کے دورِ جدید کے آغاز کے بعد جن جن اداروں یا شخصیتوں نے بلوچی کتابوں کی تصنیف تالیف و طبع و نشر کرنے میں جو کاوشیں کی ہیں، اس کے نتیجے میں گذشتہ ربع صدی کے دوران سو سے بھی کم کتابیں چھاپی گئی ہیں ان کتابوں کی پوری فہرست دیگر ضروری معلومات کے ساتھ نیشنل بک سینٹر آف پاکستان کی طرف سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

عہدِ عتیق کے اشعار

بلوچی زبان و ادب کی تاریخ سے ایک جائزہ لیتے ہوئے چند ایک قدیم اشعار کے نمونے پیش نہ کرنا سہل انگاری ہے۔ ہم نے اس مضمون کے متعدد حصّوں میں یہ واضح کر دیا ہے کہ بلوچی قدیم شاعری کو ہم نے دو دوروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ بلوچی قدیم شاعری آج بھی اپنی اصلی نہج پر بدستور جاری ہے اور جیسے کہ قدیم شاعری ہمیشہ اپنے ماحول کی ترجمانی کرتی رہی ہے وہ آج بھی اسی طرح اپنے ماحول کی ترجمانی میں منہمک ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود ماحول ہی میں بعض ضروری تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ باوجود اس کے کہ دوسری طرف بلوچی ادب کا نیا دَور بڑے جوش و خروش سے ترقی کر رہا ہے لیکن ابھی تک اس نئے ادب اور نئی شاعری نے پرانی

یا قدیم شاعری کا بال تک بیکا نہیں کیا ہے۔

حسب فیصل دَورِ اوّل کے قدیم شاعروں کے بارے میں ہم پھر یہی کہتے پر
مجبور ہیں کہ ان کے نام سے کوئی آشنا نہیں ہے۔ مثلاً چاکری دور یا اس کے
ذرا بعد کی جتنی شاعری ہے آج تک اُن کے شاعروں کے بارے میں کوئی قطعی کیا
بالکل ظن و تخمین کی صورت میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً میر چاکر، میر گوہرام
لاشاری، بیبگر، بالاچ یا دوسری طرف شہداد شہ مرید ھانی، للّہ گراناز،
مھناز، کیّا سدو وغیرہ جیسی مشہور و معروف عشقیہ داستانوں کی منظومات
کے بارے میں آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے شعراء کون تھے۔ یہی وجہ
ہے کہ لوگوں نے ان اشعار یا منظومات کے ہیروؤں کو ہی ان کا شاعر کہنا
شروع کر دیا۔ اس کے بارے میں نفسِ مضمون کے گزشتہ اوراق میں
کئی ایک جگہ تفصیل سے باتیں ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دَورِ اوّل کے
شعراء میں سے کسی ایک کا نام نہیں لے سکتے۔ ان کی مثال بالکل عربی کے
عہدِ جاہلی کے اشعار اور یونانی اوڈسے اور الیاد کی سی ہے۔ جس طرح ان
منظومات کا یا تو کوئی شاعر نہیں بتایا جاسکتا، اگر نہیں تو ان کے ہیروؤں یا
جس کے بارے میں نظم لکھی گئی ہے ان کو ان منظومات کا شاعر منوانے
کی کوشش کی گئی ہے۔

خصوصاً بلوچی پُرانی منظومات کے متعلق تو آج تک کوئی صحیح تحقیقات
نہیں کی گئی ہے۔ اسی لئے ہم بالیقین کہتے ہیں کہ وہ دورِ اوّل کے تمام اشعار
نامعلوم شعراء کی منظومات ہیں۔ لے دے کر مجھے دو چار پرانے بوڑھے اشخاص
ایسے ملے جو صرف ایک یا دو شاعر خاندان کے بارے میں صرف یہ کہہ سکے تھے
کہ فلاں شخص شاید فلاں سردار کے دربار یا زمانے سے متعلق تھا۔ مثلاً کہتے

ہیں کہ "سَیئت" نامی ایک شاعر چاکر یا گوہرام کے دربار سے منسلک تھا جس کا خاندان آج تک اسی پر فخر کرتا چلا آرہا ہے اور اس سے زیادہ مشہور "زنگی شاھی" خاندان کے شعراء ہیں ۔ اس کے علاوہ دوسرے کسی شاعر کا نام بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم تک نہیں پہنچا ہے ۔ البتہ کچھ پہلوان (گویّوں) کے نام پرانی منظومات میں ملتے ہیں ۔

بلوچ شاعروں کا یہ ایک خاصہ تھا (اور اب بھی ہے) کہ جب کبھی وہ کسی خاص مقصد کے لئے نظم کہتے تھے تو اس نظم کو گویّوں کو ازبر کرا دیتے تھے تاکہ وہ اس نظم کو شہر شہر، گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ جاکر گاکر سناتا پھرے تاکہ لوگوں تک شاعر کا مقصد پہنچ جائے ۔ اچھے بلوچ شاعروں میں "پیتو گوشی" بھی عام تھی ۔ یعنی کوئی ایک شاعر کسی دوسرے شاعر کے نام ایک نظم کہہ کر کسی گویّے کو ازبر کرا کے وہاں بھیج دیتا ۔ وہ گویّا اس نظم کو اس شاعر کے ہاں بھری محفل میں گاکر سناتا اور پھر وہ شاعر اس کے جواب میں ایک نظم کہہ کر اسی طرح واپس بھیج دیتا تھا ۔

خود شاعروں کے علاوہ بلوچ سرداروں، امراء اور رؤسا بھی اپنی بہادری اور لڑائیوں یا کسی اور ایسی مہم کے بارے میں اپنے دربار کے متعلق شعرائے اشعار کہلوا کر اپنے حریف یا دوست سردار کے نام بھجواتے تھے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چاکر و گوہرام کی تیس سالہ لڑائی میں کبھی ایک فریق جیت جاتا تو کبھی دوسرا اور جیتنے والا سردار اپنے دربار سے منسلک شاعر کو اس لڑائی میں اپنی فتح اور دشمن کی ہزیمت کے بارے میں بڑھا چڑھا کر نظم کہنے کا حکم دیتا اور پھر اسی نظم کو خاص گویّے یا گویوں (پہلوان) کے ذریعے اپنے حریف کے ملک بھیج دیتا تاکہ اس تک یہ پیغام پہنچ جائے ۔ وہاں بھی اس کے جواب میں اسی طرح کا عمل کیا

جاتا تھا اور یہ طریقہ بلوچوں میں آج تک رائج ہے ۔

پھر ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بلوچوں کے اچھے شعراء اپنے اشعار کو اپنے ایک خاص محبوب گویوں کو دے دیتے تھے ۔ اور اکثر شعراء ایسے اشعار لکھتے وقت اپنی نظم کی ابتداء میں اپنے اُس خاص گویے (پہلوان) کا نام بھی لے کر شعر میں کہتے تھے کہ

" اے فلاں تم اپنا سروز (سارنگی) لے کر آجا اور میرے اس کلام کو لے کر خوب گا گا کر فلاں شخص یا لوگوں کو سُنا دے "

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چاکر اور گوھرام کے وہ اشعار جن میں ان کی لڑائیوں کے بیان ہیں ۔ ان کے وہ حصّے جہاں وہ اس قسم کا پیغام دینا چاہتے ہیں تو شاعر اپنے محبوب پہلوان (گویّے) کا نام بھی لیتا نظر آتا ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جگہ پر جب گوھرام لاشاری چاکر رند کو پیغام بھیجتا ہے تو اس کا درباری شاعر اپنے مرغوب اور اس وقت کے پہلوان (گویّے) ھوتی کا نام لے کر کہتا ہے ؎

؎ ھوتی بیل منی ساھیگیں

یعنی اے ھوتی ، اے میرے ہمدم دوست

ایک اور شاعر کلاتی ھبیب چاکر اور گوھرام کی تیس[۳۰] سالہ لڑائی کے بارے میں اپنی نظم کی ابتداء میں گویّے کا نام تو نہیں لیتا بلکہ صرف " لوڑیگ " کہتا ہے ۔ " لوڑیگ " اگرچہ پہلوان شاعر کو نہیں کہتے ہیں لیکن کچھ علاقوں میں طبقاتی نظام اتنا گندہ ہو گیا تھا کہ وہاں پہلوان کو بھی لوڑیگ کہنے لگے تھے ۔ چنانچہ کلاتی کہتا ہے ۔

؎ بیا لوڑیگ سوائی زیر منی گپّنار گال

اسی طرح ایک اور شاعر نودبھرام کی کہی ہوئی مشہور " باگار کی نظم " کی ابتداء یوں ہے ۔

وشں گوشیں لوڑیگ بیار و تی شاگ ءَ

(یعنی اے خوش آواز بھانڈ (ڈوم) اپنی سارنگی لے آ)

پھر مزاری گورچانی کی لڑائی کی نظم کی ابتداء یوں ہے ۔

وشں گوشیں لوڑیگ شادھانی شاگ ءَ بیار

(یعنی اے خوش آواز ڈوم اپنی شادی انگیز ساگوان کی سارنگی لے آ)

کھوسہ اور رلغاریوں کی لڑائیوں کی کئی نظمیں ہیں جو " پسّوگوئی " میں کہی گئی ہیں ۔ ایک طرف کا شاعر سوبا تیگلی ہے اور دوسرے فریق کا شاعر گاھی گورچ ہے ۔ دونوں اپنے اشعار میں ایک ہی پہلوان گویے کو مخاطب کرکے نظم کی ابتداء کرتے ہیں ۔ سوبا کہتا ہے

وشں گوشیں ریلان شادھانی شاگ ءَ بیار

(یعنی اے خوش آواز ریلان اپنی شادی انگیز ساگوان (سارنگی) کو لے آ) ریلان اس گویّے کا نام ہے ۔

دوسرے دور کے مشہور ترین شعراء نے بھی یہی سنت جاری رکھی تھی ۔
شہ چلّپہ کار ملا فاضل :۔

پہلوان نیاامت بیا گوں دانائیں سرءَ

(اے دانا پہلوان گویّے نعمت آجاؤ)

بوھیر اوّل بن جلب :۔

پہلوان ساّدک منی دوستیں دل ءِ راز

(اے پہلوان صادق تو میرے محبوب دل کا راز دار ہے ۔)

ابراہیم حسن :-

پہلوان عبدالرحیم سنتوردیں شاگ ءَ بیار
(اے گوّیے عبدالرحیم اپنی مترنم شاگ (ساگوان کی سارنگی) لے آ۔

پیر نداد :-

پہلوان چنچر بیا وشں آوازیں !
(اے خوش آواز گوّیے چنچر تو آجا)

بہادر مراستانی :-

بیا سالمین چنگ ءَ بزور
(اے سالمین اپنی سارنگی ہاتھوں میں لے)

جنگیان تمپی :-

پہلوان نیامت دست ءَ پہ گلبانگ ءَ بجن
(اے پہلوان نعمت تو اس طرح اپنے ہاتھ کو گلبانگ (سارنگی) پر پھیر)

اس سے صرفِ نظر کر دورِ اول کے وہ شعراء کون تھے اور ان کی پوزیشن اپنے معاشرے یا سرداری دربار میں کیا تھی لیکن ان شعراء نے اُس وقت کے حالات و کوائف کے عین مطابق اپنے ماحول، معاشرہ اور روایات کی عکاسی کرنے کی پوری کوشش ضرور کی ہے۔ اُس دَور کے جو قدیم اشعار ہم تک پہنچ سکے ہیں ان میں ہر ایک کا ٹھوس مضمون ہے اور انہی اشعار کی بناء پر آج تک کئی ایک عادات و خصوصیات اس قوم میں باقی رہ گئی ہیں۔

جن جن شعراء نے یہ حماسی اور عشقیہ داستانوں کی نظمیں کہی ہیں۔ انہوں نے دیگر مضامین و مواضع پر بھی ضرور سخن سنجی کی ہو گی لیکن بدقسمتی سے ان کا عشرِ عشیر بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بہر حال جو بھی اشعار و منظومات ہم تک پہنچے

ہیں وہ بلوچی ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں ۔ اگرچہ ناخواندہ پہلوانوں (گویّوں) کی وجہ سے ان میں غلط الفاظ، غلط بندش، غلط تلفّظ اور کمی بیشی واقع ہوگئی ہے ۔ لیکن یہ عیوب کسی زبان شناس یا ادب شناس سے کسی طرح پوشیدہ نہیں ہیں ۔ اگر ان اشعار میں ان تمام زور آور خرابیوں کی چھان بین کرکے ان کو حتی الوسع ان سقم سے پاک کیا جائے تو بلوچی زبان سے ناآشنا معترضین کے ایرادات کا سدِباب باآسانی ہوسکے گا ۔

یہاں ہم (حسب تعین خود) دورِ اوّل کے کچھ اشعار کا ترجمہ پیش کرتے ہیں لیکن ایک بات کی طرف اشارہ کرنا انتہائی ضروری ہے کہ بلوچی ایسی فصیح و بلیغ زبان کے ادب پاروں کو کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے اُن کی تقریباً پچھتر فیصد خوبیاں ختم ہوجائیں گی ۔ کیونکہ ہر مستقل اور فصیح زبان کا اپنا جداگانہ مزاج، اپنے محاورے، اپنے استعارے، اپنا طرزِ گفتگو، جداگانہ ترکیب، ترتیب و تصویب اور تصویر ہوتی ہے جو کسی دوسری زبان سے مختلف ہوتی ہیں ۔ آساں ترین مثال جملوں کی ترکیب و ترتیب اور ان کے محاورے کی لیجئے ۔ انگریزی پُٹ آن یُور کیپ PUT ON YOUR CAP کو اگر ہم لفظی معنوں میں اردو میں ترجمہ کریں تو یوں ہوگا ۔ "ڈالو اوپر تمہاری ٹوپی ۔" جو یقیناً اردو محاورے کے برخلاف ہے اس لئے اگر ہم اس کا سلیس اردو میں آزاد ترجمہ کرکے کہیں گے "اپنی ٹوپی پہن لو ۔" لیکن اس چھوٹے سے جملے میں جس قدر خوبصورتی انگریزی میں ہے وہ اردو میں نہیں کیونکہ انگریزی کا جملہ محاورہ ہے اردو میں اس کا ترجمہ سادہ جملے میں ہوا ۔ اب زبانوں کی باریکیاں جاننے والے اساتذہ سے یہ بات چھپی نہیں کہ زبان اور محاورے کے لحاظ سے جو چیزیں انگریزی کے اس معمولی جملے میں ہیں وہ اردو کے ترجمے میں مفقود ہیں ۔ یہی صورت اردو کے ایک جملے کی حالت انگریزی میں ترجمے سے ہوگی ۔

یہ تو خیر ایک نہایت سادہ عام جملے کا معاملہ ہے۔ اگر اس ضمن میں ادب پاروں کو اس ترازو میں تولا جائے تو نقصان کے سوا اور کیا ہاتھ آسکے گا۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ کسی بھی زبان کا ترجمہ کرنے میں دو نتیجے ہاتھ آئیں گے۔ ایک تو یہ کہ متن اپنے ترجمے سے کئی گنا اعلیٰ اور ارفع ہو گا۔ نہیں تو ترجمہ خود اس متن سے کئی گناہ زیادہ اچھا ہو گا یہی وجہ ہے کہ میں کسی دوسری زبان میں ترجمہ شدہ چیز کو اس کے متن کی زبان کی خوبی یا خرابی نہیں مانتا۔ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ترجمہ پڑھتے وقت آپ کو متن والی زبان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ کسی بھی ترجمہ کو پڑھتے وقت آپ کے ذہن پر وہی متن والی زبان، اس کا کلچر، اس کا مزاج اور اس کے تراکیب و محاورے تک کی کم از کم پرچھائیاں تو پڑجائیں۔ میں نے کئی ایک ترجمے پڑھے ہیں لیکن ان تراجم میں مترجم اکثر و بیشتر ترجمہ شدہ زبان میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے متن کی زبان کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لوگ انہی تراجم کی خوبیوں یا خرابیوں کو اصل کتاب یا زبان لکھنے والے کی خوبیاں یا خرابیاں سمجھ کر بلکہ مان کر خوش یا ناخوش ہو جاتے ہیں۔

البتہ کئی ایک ترجمے نظر سے گذرے ہیں جن میں اصل زبان کی خوبیوں کے علاوہ کسی حد تک اس کا مزاج اور ماحول بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عربی زبان کی ہزاروں کتابوں اور مجلات وغیرہ کے مضامین کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان کتب و مجلات و مضامین کے علاوہ دوسری طرف قرآن کریم کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کو تقابلی نظر سے دیکھتے ہی میری بات کی کھلی تصدیق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے ترجمے کے سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور ترجمہ کرتے وقت جو نظریہ مدنظر تھا وہ دوسری عربی کتابوں یا مضامین کے ترجمہ کے وقت بالکل مختلف تھا۔ قرآن مجید کے ترجمے کے سلسلے میں قرآنی زبان، اس کا مزاج، اس کی بندشیں، جملوں کی ترکیب

اور پھر مختلف معانی غرض ہر ہر ایک باریکی کو دھیان اور احتیاط سے دیکھا گیا اور ترجمہ کرتے وقت یہی مدنظر تھا کہ کسی صورت میں حتی الامکان کوئی معمولی چیز بھی متن سے مختلف نہ ہو۔ لیکن جو دوسری عربی کتابوں کے ترجمے کرتے وقت اس احتیاط کا دس فی صد بھی زیرِ نظر نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ترجموں میں بعد المشرقین ہے۔

قرآن مجید کی طرح اکثر اس قسم کی مذہبی کتابوں کے ترجمہ کرتے وقت یہی نظریہ اپنایا گیا ہے۔ چنانچہ، بائبل، بھگوت گیتا اور اوستا جیسی مذہبی کتابوں کے تراجم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

حقیقت میں کسی زبان کے مزاج، اُس کی روح اور جو کچھ بھی اُس کی پونجی ہو صرف اُس وقت ترجمہ میں صحیح اور اصل رنگ میں نظر آئے گی جب کہ اس کا ترجمہ انہی مذہبی کتابوں کے ترجموں کی طرح مکمل پابندیوں کے ساتھ کیا جائے۔

اس لئے بلوچی زبان جو اردو زبان سے قطعی ایک مختلف و منفرد زبان ہے اس کے ادب پاروں کو اردو یا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت یہی خطرات و مشکلات درپیش ہوں گے جن سے دامن بچانا بڑا مشکل کام ہے۔

بلوچی شعری ادب میں سب سے پرانی منظومات تو وہی چاکر، گوہرام، بیبگر وغیرہم کے بارے میں کہی ہوئی نظمیں مانی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ہمیں کوئی پہلے کی ایسی نظم ہاتھ نہیں لگی جو زبانِ حال سے (جیسے کہ عام بلوچی نظموں کی سُنّت ہے) اپنے عہد کی عکاسی کر رہی ہو۔ اس لئے یہاں ہم ان پُرانے اشعار و منظومات میں سے کچھ مقتطفات (اقتباسات) پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہم اس نظم کے ترجمے کرنے کی کوشش کرینگے۔ جو مشہور انگریز مستشرق مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی نسب نامے کی صورت میں شاید قدیم ترین نظم سمجھ کر اپنی معروف کتاب

"دی پاپولر پوئٹری آف بلوچیز" (Papular Poetry of Baloches) کی ابتداء میں لکھی ہے۔

ء میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جو اس دنیا جہان کا مالک ہے۔
یہ سارا جہان خاک اور مٹی (برباد) ہو جائے گا اور صرف وہ خود باقی رہے گا۔
ہم امام علی کے مریدوں میں ہیں اور امام کا دین برحق ہے۔
ہم پاک نبی کی اُمت ہیں جو جہان کا سردار ہے۔
ہم سید حمزہ کی اولاد ہیں اور ہمیشہ بازی لے جانے والے ہیں۔
اَلَبّ (الباٹی) سے اٹھے ہیں اور یزید (نمادشمنوں) سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔
(پھر) کلبلا (کاربلا) سے نکلے اور بمپور درمیان ہے (پھر) سیستان تو ہماری منزل ہی ہے۔
ہمارا بادشاہ شمس الدینؒ ہے جو بلوچوں سے اچھا سلوک کرتا ہے۔
اب جو بدرالدینؒ نکلا ہے تو ایک خواہ مخواہ کی مصیبت ہے۔
سب کا سربراہ میر جلال خان تھا جس کے ساتھ چوالیس ۴۴ قبیلے تھے۔
ہم ھارین بندر آئے جو کیچ کے داہنی طرف ہے۔
ھوت مکران میں بسے اور کوسگ کیچ کے علاقے میں نوھانی اور دودائی اکٹھے لاشار میں ہیں۔

ڈرلیشک اور پرُدقار مزاری بھی رند قبیلے میں شامل ہیں ۔
رند اور لاشاری ایک ملک میں رہتے ہیں اور درمیان میں ان کی
سرحدیں ہیں ۔
سب سے بڑا گھرانہ ڈومبکی (قبیلہ) ہے جو گاج کے کاریزوں پر
قابض ہیں ۔
اَلَب سے آئے ہوئے کلمتی قبیلے کا گھرانہ ایک طرف ہے ۔
وہ تلی میں رہتے ہیں اور جستکانی بھی دوسری طرف ہیں ۔
پُرتّر ، میرھالی ، جتوئی سب سیبی اور ڈھاڈر میں ہیں ۔
پُشّر دراصل رند ہیں جو چاکر کا ہم نسل ہیں ۔
گولا ، گوپانگ اور دشتی سب رند کی برادری سے باہر ہیں ۔
گورگیج دولت مند ہیں اور یہ تلی کے علاقے میں ہیں ۔
اور بلوچ بھی کافی تعداد میں ہیں جو تمام رند کے زیرِ سایہ ہیں ۔
رند شوران میں رہتے ہیں اور لاشار گنداوہ میں ۔
ان سب کا سردار شیہک تھا جو شہر اور شاداب زمین
بانٹتا آیا ۔
یہ میرا حسب و نسب ہے اور یہ بلوچ کی تاریخ ہے ۔
پوری تیس سالہ جنگ کی وجہ سے بلوچوں میں فساد ہے ۔
شیہک اور شہداد کے بعد لشکر کا سردار چاکر ہے ۔
میر (چاکر) کی آواز پر چالیس ہزار لوگ اُٹھ کھڑے
ہوتے ہیں ۔
یہ سب ایک ہی دادا کی اولاد ہیں ۔

یہ سب زرہ پوش ہیں اور ان کے ہاتھ خود سے ڈھکے ہوئے
ہیں ۔
اور ہر ایک ترکش اور کمان رکھتا ہے ۔
پا پیچ اور قباؤں کے ساتھ اُن کے پاؤں میں موزے
(بلوچی جوتے) ہیں ۔
اُن کے چھرے اور خنجروں کے دستے چاندی کے ہیں اور ہاتھوں
میں سونے کی انگوٹھیاں ہیں ۔
ان ہی میں بکّر اور گوھرام اور رامین ہیں ۔
اور ان ہی میں نودبندگ زَرْ زوال (دولت لٹانے والا)
ہے ۔
پُتّر قبیلے سے تلخ جواب جاڑو اور ھدّہ دین کا بھائی
ہے ۔
پیرو شاہ، بجّار، ریحان اور رندوں کے صاحبِ
سیف میران ہیں ۔
سوبا، میھان، ھالی، جام سھاک اور الّن ہیں ۔
ھیبتان، بیبگر رندوں میں، میر حسن اور براہیم ہے ۔
شاعر نے جو شعر گوئی کی ہے اس سے میر جلال خان
باخبر ہے ۔

اگرچہ مسٹر ڈیمز نے اس نظم کو قدیم بتلایا ہے لیکن اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظم بہت ہی بعد کی چیز ہے ۔ علاوہ ازیں اس نظم کی زبان بھی عام

بلوچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم مری بگٹی علاقے کے کسی شاعر کی نہیں ہے بلکہ بعد میں یہاں پہنچ کر بگڑ گئی ہے ۔ اس کے باوجود اس نظم کے الفاظ، اس کی بندشیں، اس کے جملوں کی تراکیب عام بلوچی زبان کی ہے یعنی نام نہاد مشرقی لہجے میں نہیں ہے ۔ کیونکہ اس نام نہاد مشرقی لہجے کے شعراء کی زبان اور نظمیں اس طرح شستہ، باوزن اور باترکیب نہیں ہیں ۔ علاوہ ازیں یہ نمایاں ہے کہ اس نظم کا ایک چوتھائی سے زیادہ بعد میں بڑھادیا گیا ہے جو چاکر کی تعریف میں ہے ۔

جیسے کہ بلوچی شعری ادب سے تمام متعلقین واقف ہیں کہ چاکر اور گوھرام کی آپس میں لڑائی کوئی تیس سال تک جاری رہی تھی جس کے دوران کبھی ایک فریق غالب آتا تو کبھی دوسرا ۔ ان دونوں کی ان تیس سالہ لڑائیوں کی داستان کی نظمیں خود چاکر اور گوھرام سے زبردستی منسوب کرائی گئی ہیں ۔

یہاں ہم ایک نظم کے کچھ حصے پیش کرتے ہیں ۔ اس نظم میں گوھرام لاشاری اپنے حریف چاکر رند کے نام پیغام بھیج کر اپنی بڑھائی اور اس کی کمزوری کے بارے میں اور جنگ میں اپنی جیت اور اپنی بہادری وغیرہ سے متعلق چاکر کو مخاطب کرکے کہتا ہے ۔

اے میرے بادشاہ صفت متحد دوستو !
آجاؤ اے قبیلوں کے قابل قدر شخصیتو !
لسّی کے لاشاریوں کے پُرتمکنت سردارو
آجاؤ تاکہ میں ایک برادرانہ دیوان (مجلس) منعقد کرلوں
میں نے ایک نظم تانوں بانوں میں کہی ہے (کیونکہ)
چاکر کا سر بہت زیادہ پُرغرور تھا ۔
وہ اتنا مغرور ہوگیا تھا کہ وہ اپنے جیسے لوگوں کو دھیان

میں نہیں لاتا تھا۔

قدرت نے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں ستمہ اور بھٹیوں (بگٹی)
کو جمع کر سکوں۔

اور ٹھٹھہ کی فوجوں کو اوپر سے چڑھا دوں
جو اپنے حملے سے ایسی آگ لگا دیں۔
اور جنوبی ہوا کی طرح اس طرح پھیلا دیں۔
کہ ان متمول اور دولت مندوں کے بازار گھر جل جائیں
جس کی آگ کو بجھانے کے لئے دلّی کے ترک بھی مایوس
ہو جائیں۔

اُن گھنی داڑھی والوں سے دو دو ہاتھ ہوں
رند نیچے سے اوپر چلے گئے اور ٹھنڈے نگور میں قلعہ
بند ہو گئے

ان ہی اشعار اور باتوں کے کہنے کے موقع کے لئے چاکر نے
کالا بیل کاٹا تھا

چاکر اگر مردانگی کینہ پروری کا مالک ہوتا
تو وہ جَلّ کو گہرے پانی کے اُس پار نہ لے جاتا۔
گھوڑے کو ساز و سامان سمیت اور
گورگیں کو دیو ہیکل نقاروں کے ساتھ نہ چھوڑ جاتا
واہ واہ کہ فتح ہمارے حصے میں آئی
میں نے دشمنوں کو وہ تھپیڑا مارا
کہ ان کے چھوٹی سموں والے گھوڑے / گورخروں کی

طرح بھاگ گئے۔
اور ہر طرف سے سیدھا سیبی کی طرف۔
چاکر اپنی ساری زندگی اس غم کو اٹھاتا رہے گا۔
چاکر اب گہری گذرگاہوں کے راستے نکل جائے گا۔
فرزند نما منڈو اور شاھی واپس ہونگے۔
درختوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے رک جائے گا
اور تھکے ہوئے جھیڑیے کی مانند مڑ کر دیکھے گا
اس علاقے کی طرف جائے گا جہاں کہ "گوَن" پکتے ہیں اور
"آلڑو" کے درخت کا دودھ اس کے منّہ اور گھونگھریالی داڑھی پر گواھی دیں گے
بلوچی زبان کے لئے اس کے بچّے لکنت زدہ (گونگے) ہوں گے
عورتیں اُس سے جاموٹ (سندھی) زبان میں بولیں گی ۔
اس کے بچّے جاٹ اور گوپانگ لوگوں میں مخلوط ہو جائیں گے
جن کے ہاتھ کھینچا تانی کی کثرت سے زخمی ہوں گے
بھورے چادر کے دامن کا سہ بندھا ہو گا
اور سروں پر کالے کوٹلے ڈھوئیں گے

اب ذرا مشہور گور گیج بالاچ کی نظم ملاحظہ ہو۔ بالاچ کا بھائی دودا حسنی جس دن دولہا بنا اسی دن ان کے ہمسایہ میں رہنے والی ایک مالدار عورت سمّی کی گایوں کے ریوڑ پر کچھ لوگوں نے چھاپا مارا اور ہانک کر لے گئے تو سمّی نے اپنی فریاد دودا تک پہنچائی جس نے بلوچی رسم و رواج اور روایات کے مطابق لبیک کہا اور کمر باندھ کر ان چھاپہ مارنے والوں تک پہنچ گیا چونکہ دودا یک و تنہا تھا اس لئے وہ بہادروں کی طرح جوہر دکھا کر مارا گیا اس زمانے میں دودا کا بھائی بالاچ بہت چھوٹا تھا۔ جب بڑا ہو گیا تو سوگند یاد کیا کہ جن لوگوں نے دودا کو قتل کیا ہے، جب تک ان سے بدلہ نہ لوں گا آرام سے گھر نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ اُس نے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنا اختیار کیا اور راتوں رات آکر دودا کے قاتلوں پر شب خون مارتا رہا اور تاآنکہ چُن چُن کر سب کو مار ڈالا۔ اس انتقامی کاروائی میں بالاچ کا اکیلا ساتھی اس کا پُرانا خدمت گار نکیبو تھا جِسے وہ بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ے خدا تجھے سلامت رکھے! اے جواں مردوں کا قاتل
بالاچ!
تیری زباد جیسی معطّر نوخطیں (داڑھی) تمہیں
مبارک ہو
ہمیں تمہارے عنیف سر کی سوگند ہے۔
جب تک کہ ہمارا انتقام دشمنوں کے سر پہ باقی تھا
مشکیزہ کے چار بند کندھے پر بار تھے
دو بند والے گونچان (Kit bag) سے تو رہی

بھلی ۔
اس طرح مشکیزہ کے کاٹنے والے چار بندوں سے
پہاڑوں سے رِسنے والے باریک اور کمزور چشموں کے اُتھلے
گرم اُبلتے پانی سے
جن کو ھِرن مجبوری سے منہ لگاتے ہیں ، خدا پناہ
دے ۔
کڑکڑاتی سردی نے کڑوے اوک کے درختوں تک کو
سکھا دیا ہے
اور برف نے پہاڑوں کی چوٹیاں روپوش کردی ہیں
ایسے موسم میں بھی بالاتح صرف پشتی (معمولی چادر) کے
ساتھ سوتا رہا
رہزنوں کی سی ٹمٹماتی آگ روشن کردی ہے
اور راکھ میں اَڑسی ہوئی "پُرانی" (ایک قسم کی روٹی)
پکائی ہے
اس "پُرانی" کو میں اور میرے دوست (نکیبو) نے
سپاری کی طرح ٹکڑے کر ڈالا ۔
ان مہموں میں میرا دوست صرف نکیبو تھا
جس نے میرا ترکش نوے عدد تیروں سے بھر اُٹھایا
ہوا تھا
ہم نے جاکر ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لی
اور وہاں بیٹھ کر ہم اپنے تیروں کو

ندیوں کے گرتے دہانوں کے مضبوط کالے پتھروں سے
تیز کرتے تھے۔

بلوچوں کا انتقام د۲و سو سال تک

فربہ ساروان (ایک قسم کا ہرن) کی دو دانت والی عمر
ہے (سدا جوان ہے)
د ساروان کی عمر چاہے کچھ بھی ہو اس کے عمری دانت
دو ہی ہوں گے)

جنگجو نکیبو نے مجھے نیند سے جگا دیا (اور کہا)
سردیوں کی تاریک رات اب بھیگ چکی ہے
بھیڑیے صفت کُتے اب بھونکنے سے رہ گئے ہیں
اور بڑی بوڑھیاں بھی ٹمٹمانی آگ پر سو گئی ہیں
اُٹھ میرے آقا کہ اب تو پو ہی پھٹنے والا ہوگا
میں للکارتے اور گرجتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہو گیا
اور دشمنوں کی آہٹ سے چوکنا ہوتے ہوئے
اُن بتائے ہوئے نشان اور جگہوں پر گیا
میں نے اپنا پاؤں زنجیر نما سوکھی کانٹے دار شاخوں
سے اس پار کیا
کیوں کہ راستے پر نو صرف خونخوار کُتے اور یتیم سوتے
ہیں اور
وہ لوگ نہیں سوتے جن پر اللہ نے احسان کیا ہے
میں نے گھر کے کنارے کی چٹائیاں ہٹا لیں

اور خنجر نکالا تاکہ اس کا سر تن سے جدا کروں
لیکن دو شاخہ خنجر کو راہ نہ ہوئی
اسی طرح تلوار سے وار کرنے کی بھی جگہ نہ تھی
اور تلوار سے بنے ہوئے تبر زین کے بھی استعمال
کی جگہ نہ تھی
اب میں نے اپنا وہ کمان ہاتھ میں لیا جو میں نے
ایک معمر اونٹ، ایک جواں اونٹ اور ایک بچھڑے والی
گائے کے بدلے لیا تھا
اب میں نے اپنے گلگوں تھیلے میں ہاتھ ڈالا
اور ایک سان (تیز) کی ہوئی انّی نکال کر
تیر کے منقش سرے پر لگا کر کمان پر چڑھا دیا اور جو
کھنچتے ہی سیوائی کمان سے بے تحاشہ چھوٹ گیا
تیر لحاف اور رضائی سے پار ہو کر نیچے بچھی ہوئی منقش چٹائی
کو چیر کر
اس کی انی پوری کی پوری خاک میں گڑھ گئی
اب خون اس کے (مقتول کے) نوشین سے معتاد
منہ میں آگئے
اور پھر گھونگھریالی مونچھ اور داڑھی میں بہنے لگے
افسوس اے نوجوان! تجھے سمندر کی جنوبی ہوا اور
بڑے پازیب والی دلربا کی صحبت نے خوب سُلا دیا
تھا۔

پھر آمر نے اچانک ایک کونے سے پکارا۔
اے خوددار اور جواں مردوں کا قاتل! ایسے اچھا نہیں ہے۔
بہت دُور سے آئے ہو اور جلدی لوٹ جاتے ہو
یہ تو یوسف تھا جسے تم نے مار ڈالا ہے، جو کسی اور علاقے کا بہادر نوجوان تھا
اگر تم کو پیغمبر کی گنجائش نہیں ہے، تُو نے یوسف کو کس تقصیر پر مار ڈالا ہے
میں (بالاچ) نے اپنے پاؤں روک لیے اور جواب میں کہا
میں نے اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کی اجل آگئی تھی
اور یہ بدبختی اُس کو اِسی گھر والوں سے نصیب میں آئی
کیونکہ کل شام کو کشمو کے میدان میں اُس نے میرے ساتھ پیر پیغمبر کی سوگند کھائی تھی
یوسف کو ان ہی پیر پیغمبر کی مار تھی
کیونکہ اس نے میرے ساتھ بیٹھ کر تیس[۳۰] پاروں کے کلام اللہ کی قسم کھائی تھی
خود بھی کھائی اور مجھ کو بھی کھلائی اور مجھے خوشحال گھر کا اس طرح پتہ بتا دیا کہ
وہاں بے مثال تازی گھوڑیاں بندھی ہوئی ہیں

اور "قلم گوش" دودھ پیتے کرگ (گھوڑی کے بچے) ان کے

پاس ہیں

اور تیز انی والے نیزے ان کے پاس زمین میں گڑھے

ہوئے ہیں

یوسف کوئی غیر نہیں ہے بلکہ میرے ننہیال کے بلوچ قبائل

میں سے ہے

یوسف کے خون کا بدلہ لینے والا بھی میں ہی ہوں

میں نے بیبگر کے سر کی بوٹیاں نوچی تھیں

یوسف تو میری معطر حبیب کی الائچی ہے

اگر کوئی یوسف کا انتقام مجھ سے لینا چاہتا ہے

تو یہ اس کا گھوڑا اور یہ اس کا میدان!

بالاچ کی یہ نظم بلوچی شعری ادب کے ماسٹر پیسوں یا شاہکاروں میں سے ہے۔ ترجمہ کرنے سے اس کی روح کو اگرچہ زک پہنچی ہے لیکن پھر بھی اس سے کسی حد تک اس کے مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قدیم شاعری کے پہلے دور کے اشعار کا نمونہ دیتے ہوئے آخر میں شہداد مہناز کی عشقیہ داستان کا ایک چھوٹا سا حصہ پیش کرتا ہوں۔ شہداد اور مہناز دونوں آپس میں چچازاد، خالہ زاد بھائی بہن تھے جن کی شادی ہو چکی تھی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے بے انتہا پیار تھا۔ شہداد کی ایک اور بیوی بھی تھی۔ جو سوتن ہوتے ہوئے ہمیشہ اسی کوشش میں تھی کہ شہداد اور مہناز میں پھوٹ پڑے۔ آخر اس نے ایک خطرناک چال چل کر شہداد کو مہناز سے بدظن کر دیا اور شہداد نے اسی بہتان پر مہناز کو پہلے تو خوب مارا اور پھر طلاق دیدی۔ مہناز نے غصے میں آکر

آومرسے شادی کرلی۔ اس کی سوتن نے آومرہی کے ساتھ اس کے غلط تعلقات کے بارے میں شہداد کو اکسایا تھا۔ بعد میں شہداد کو پتہ چل گیا کہ یہ سب فریب اور دھوکہ تھا۔ چنانچہ اس نے گھوڑے کی آگ پر رکھے سرخ شدہ نعل سے اپنے آپ کو داغا اور مرگیا۔

ذیل کے چند مصرعے مہناز کی وہ باتیں ہیں جب شہداد نے اس پر الزام لگاتے ہوئے اس کو سزا دی تھی۔ مہناز کہتی ہے ؎

اے شہداد یہ عجیب بات ہے کہ تو مجھے بے گناہ سزا دے رہا ہے
اور صرف سوتن کی من گھڑت جھوٹی باتوں کی بنیاد پر
یا ممکن ہے کہ تم کو بچوں نے بہکایا ہے
جو تم نے اس طرح مجھے مارا، جیسے کہ کوئی مست اونٹ کو مارتا ہے۔
یا بھارگاہ میں چرے ہوئے آزاد گھوڑوں کو
مارنے کی سزاوار تو صرف بے شرف عورتیں ہیں
اور چابک مارنا بھی صرف خطاکاروں کو روا ہے
یا اُن کا جن کی عام آماجگاہ بے بس اور لونڈیوں کے بچے ہیں۔
مگر ایسی سزا مہناز کے پھول جیسے بدن کے لئے یقیناً ناروا ہے
اے شہداد! میں وہی چوڑے پتوں والا انجیر کا درخت ہوں۔

جو پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹیوں کی گھاٹیوں میں اگا ہو
اور باغ کا وہ بلند ترین درخت ہوں
جس کی اونچی شاخوں کو نہ تو کوئی ہوا ہلا سکی ہے
اور نہ کوئی موسمی بارش اس کے ریشوں کو نمناک کر
سکی ہے
ماسوائے گلبیز داڑھی والے شہداد کے

نشاۃ ثانیہ کے شعراء | بلوچی شعری ادب کا دورِ اول ایسے شاہکاروں سے بھرا پڑا ہے لیکن یہاں مزید امثلہ کی گنجائش نہیں ہے

اب ہم اسی قدیم شاعری کے نام نہاد دورِ ثانی یا نشاۃ ثانیہ کے ان شعراء کے کلام میں سے اقتطاف کرکے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں جو اُس دورِ اول کے گمنام شعراء کی طرح نہیں ہیں ۔

اس ضمن میں ہم سب سے پہلے بلوچی زبان و ادب کی پوری تاریخ (عہدِ قدیم سے لے کر آج تک) کے عظیم، بے مثال اور یگانہ شاعر شہلچہ کار (شہنشاہ شعراء) مُلا فاضل (وفات ۱۲۷۰ھ) کی دو نظمیں نمونے کے طور پر پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ۔

شہلچہ کار مُلا فاضل کی وفات کا سن ۱۲۷۰ھ ہے اور اُن کی عمر موت کے وقت چالیس سے لے کر پینتالیس سال سے کسی حالت میں زائد نہ تھی کیونکہ اُن کی موت چیچک کی وبا سے واقع ہوئی ہے جس کو اُن کے بھائی مُلا قاسم نے لوحِ مزار پر "جُدری" لکھا ہے ۔ "جُدری" عربی زبان میں "چیچک" کو کہتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ عام طور پر چالیس یا پینتالیس سال کے بعد چیچک نہیں نکلتا ۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ شہلچہ کار عمرِ طبعی نہ پا سکے تھے ۔

سب سے پہلے ہم شہلچہ کار کی اُس نظم کے کچھ حصے کے ترجمے کی کوشش کریں گے جس کو لوگوں نے ادبی سرقہ (بلکہ بکف چراغ دارد کی طرح) علناً لے کر سردار عبداللہ خان گوار سے منسوب کیا ہے۔ ان حضرات کی داد دینی چاہیئے کہ کہاں ہاتھ مارنے کی ہمّت کی ہے۔ اگر وہ ایسے ویسے کسی شاعر کی کوئی معمولی نظم لے کر کم و بیشی اور قطع و برید و اضافت کے ساتھ پیش کردیتے (جیسے کہ خود کر رہے ہیں) تو ممکن تھا کہ لوگ کچھ وقت تک دھوکے میں رہ جاتے لیکن اس قسم کی فاحش غلطی کر کے انہوں نے اپنا بھانڈا خود سر بازار پھوڑ ڈالا ہے۔ یہ نظم شہلچہ کار مُلّا فاضل کی دو بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ ان دونوں نظموں کو ایکدوسرے سے توافق بھی ہے اور تضاد بھی۔ توافق اس لئے کہ دونوں نظموں میں تقریباً ایک ہی جیسے مطالب ہیں۔ اور تضاد اس لئے کہ ایک نظم میں جو باتیں ابرام سے کہی گئی ہیں وہی باتیں دوسری نظم میں ابہام سے بیان کی گئی ہیں۔ دونوں نظموں میں موسم اور بارش کا ذکر ہے اور پھر پہاڑ ندی نالوں کی سیر و تفریح کی بات ہے اور پھر مرکزی خیال وہی معشوق پر ہی ہے۔ دونوں نظموں میں معشوق کے زیورات اور لباس کا خاص طور پر ذکر ہے۔ پہلی نظم میں لباس و زیورات کا نام صاف صاف لیا گیا ہے جبکہ دوسری نظم میں کنایہ و تعلیل ہے۔

ان دونوں نظموں میں ایسے بلوچی الفاظ، استعارات اور تعلیلات ہیں جن کو ایک غیر بلوچ اور بلوچی سے ناآشنا شخص تو کجا آج تک خود بلوچی زبان و ادب کی تاریخ میں کوئی بلوچی مستند شاعر استعمال نہ کر سکا ہے اور آئندہ بھی اس کا امکان ہے۔ بلوچی زبان و ادب میں شہلچہ کار مُلّا فاضل یگانہ شاعر ہیں جن کے کلام کو حقیقی معنوں میں بلحاظ محاورہ، استعارہ اور تعلیل تشریح کی ضرورت

ہے۔ اور پھر بلوچی الفاظ کی طرف آیئے تو آج تک ان کے اشعار میں مستعمل لاتعداد ایسے بلوچی الفاظ ہیں جن کے معانی سے بلوچی دان حضرات بھی ناواقف ہیں۔ اب شہلچہّ کار کی پہلی نظم کے ایک حصّے کا ترجمہ پیش کریں گے ۔

کل میں شندکار کی خاطر ایک معطّر وادی کی طرف چل نکلا۔
جہاں مجھے سیاہ وسفید رنگ کے گورخر اور عقیق رنگ کے پہاڑی بکروں کا شوق لے چلا
وہاں سے میں بلند پہاڑوں کا نظارہ کرتے اور سرسبز گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے لوٹا
اور ہرنوں کے لئے پُر ذوق اور بے تاب نگاہوں کو تسکین دیتا رہا
آج بادل پُر بہار قندھار سے اُٹھے
پھر دِلّی کی اوپری اور کابل کی دوپہری ہواؤں نے ان کو باری باری کندھوں پر لیا
پھر لاؤ لشکر کی طرح ملبار کی طرف یلغار کیا
اور سارے راستے سمندر سے لب ملاتے ہوئے
کل شام لوٹ کر سیبی، ڈھاڈر تک گزر گئے
اور پھر گلزار ٹھٹھہ پہنچ کر وہاں کے پُر آب بالوں سے نے دے کی
اور بلند ہو کر ہر ایک دلآرام سرزمین پر چمکتے، گرجتے برستے گزرے
وادیوں اور سطوح مرتفع پر کھل کر برس گئے۔

ان موسمی بارشوں کے بعد ہر جگہ سبزہ سبزہ ہی ہوگا۔
(اس خیال سے) گایوں اور بھیڑوں کے مالکوں کے
دل خوشی سے اُچھل پڑے۔
اور جو کل بجلی تین بار وقفہ وقفہ کے موسلا دھار بارش
کی علامت میں چمکتی رہی۔
اس نے مجھ سے ایک عزیز ترین دوست کو دلِ رنج کر دیا۔
متواتر برسنے والی بوندوں نے میری منتظر اُس محبوبہ کی عارضی
بہاری گھر میں گزر کر لی۔
شدید غیر متساوی برسنے والی اِن بوندوں نے محبوبہ کے چہرے
پر نقاب سا ڈال دیا
اور اُس کو کرمانی کناویز (ایک ریشمی قمیض) کے ساتھ
بھگو دیا۔
اس کی گردن، تعویذ اور لامبے لٹھوں کو نوکاپ
(بارش کے تازہ پانی) سے تر کر دیا۔
اُس کے خراسانی ہار جو اُس کے "آکُہ" جیسی گردن میں تھا۔
اور اُس کے چہرے جس پر ھندی زباد جیسی خوشبو رکھنے والا
صندل ملا ہوا تھا۔
اُس کے کانوں کے چمکنے والے کُنلّ (ایک زیور)
ہاتھ کے مینا کاری کئے ہوئے منقش سَنگہ (کڑے)
اور پانچوں میں بندھے ہوئے سونے چاندی کے بنے ہوئے
تلمل (ایک زیور)......الخ

اب ذرا دوسری نظم سے کچھ مصرعے کے ترجمے کی سعی کروں گا۔ اِن مصرعوں میں شعلچہ کار نے کہا کچھ اور مطلب کچھ اور لے لیا۔ جو ترجمہ کے باوجود نہیں جانے جاتے۔ اسی لئے ہر مصرعہ کے آگے اشارۃً اس کا حل بھی لکھا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ شعلچہ کار کا مطلوب کیا تھا۔ اس نظم میں بھی بارش کے بعد شاعر تفریح کی خاطر ندی نالوں کو دیکھتا چلا جاتا ہے اور وہاں وہ کسی خوبصورت محبوبہ کو دیکھ پاتا ہے اور اُس کی تصویر ادرعکاسی مبہم الفاظ میں کرتا ہے۔ یہاں ہم نظم کے اس حصّے کو ترجمہ کرنے کی کوشش کریں گے جہاں محبوبہ کے زیورات کا بیان ہے ۔

- چاند اور شاہراہ ایک ڈھلے ہوئے کالے پہاڑ پر مِل رہے تھے (چاند ایک زیور، شاہراہ سے مراد " مانگ " اور ڈھلے ہوئے کالے پہاڑ سے مراد " معشوق کے کالے ڈھلے ہوئے بال)
- اور اُس ایک کنارے پر پرندوں کی قطاریں تھیں (کنارے سے مراد دوپٹہ کا وہ کنارا جو سر کے اوپر سے گزرتا ہے پرندوں کی قطار سے مراد سونے سے بنی ہوئی پتیاں ہیں جو دوپٹے کے اسی کنارے پر لمبائی میں ٹکے ہوئے ہیں)

طوطی شہباز کے ساتھ جنوبی ستارے کی طرح جھل مل کر رہا ہے (طوطی سے مراد ناک کا ایک زیور ہے جس میں زمّرد جڑا ہوا ہے اور شاھباز سے مراد وہ نتھ ہے جو ناک میں ہے۔ مگر سائز بڑی ہونے کی وجہ سے اس کو لمبی دُم جیسی زنجیر کے ذریعے کان کے اوپر بالوں سے متصل کر کے سہارا دیا گیا ہے، جنوبی ستارے ہیرے

کی گئی ہیں ۔)

شدر جیسی ہرنیاں تنگ گھاٹیوں میں سہمی کھڑی ہیں ("شدر" ایک قیمتی پتھر ہے ، "ہرنیوں" سے مراد ناک میں پہنے ہوئے "پلو" "پلک" زیورات ہیں اور تنگ گھاٹیوں سے مراد ناک کے نتھنوں کی سوراخیں ہیں)

کاغذی محل کے چوبدار سیاہ فام خدمت گار ہیں ("کاغذی محل" سے مراد کاغذ جیسے پتلے ہونٹ ہیں ، "سیاہ فام" چوبدار وں سے مراد "دانت ہیں ۔ بلوچ عورتیں سفید دانتوں کو بالکل کالا رنگ دیتے تھے یا اُن میں سفید نکتے چھوڑتے تھے)

مُرغِ زرّیں باریک نازک شاخوں پر ستائے بیٹھے تھے (مُرغِ زریں سے مراد انگوٹھیاں اور "نازک شاخوں" سے مراد انگلیاں)

دسوں کے دسوں نخلوں کے پھل خونیں رنگ (سرخ) تھے ۔ (یہاں پر نخل "کھجور کا درخت" سے مراد انگلیاں ہیں اور "خونیں رنگ پھل" سے مراد سرخ کلونٹ سے ہے ۔ "کلونٹ" کچھی کھجور ہے جو کئی رنگ ہوتی ہے ۔ لیکن ان میں سے اکثر سرخ رنگ کی ہوتی ہیں ۔)

مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ گنجائش مکان نہ ہونے کی وجہ سے ان اشعار کی زیادہ تشریحی ترجمہ نہ کرسکا اور پھر ایسے اشعار کا ترجمہ اس کی روح کو مار دیتا ہے ۔ ان اشعار کو سمجھنے کے لئے خود بلوچی زبان میں بھی تشریح کی ضرورت ہے ۔

ملا قاسم بن چاوش کے نام سے تمام بلوچی دنیا واقف ہے ۔ یہ شاعر وہی

شہلچہ کار مُلّا فاضل کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی اپنے بھائی کی طرح قادر الکلام شاعر تھے۔ مُلّا قاسم کے اشعار زور بیان، طاقتِ اظہار اور شعریت سے بھرپور ہیں۔ لیکن یہاں ہم ایک مشہور واقعہ بیان کرکے چند مصرعے لکھیں گے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شہلچہ کار مُلّا فاضل اور ان کا بھائی مُلّا قاسم کسی جگہ ایک مجمع میں بیٹھے تھے کہ اچانک کچھ فاصلے پر ایک گھر کی کھڑکی سے ایک حسین عورت جھانکنے لگی اور مُلّا قاسم نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بھائی شہلچہ کار کو اس کی طرف متوجہ کرے مگر وہ کھلم کھلا اس مجمع میں یہ کیسے کہہ سکتا تھا۔ اس لئے اس نے شعر کا ایک مصرعہ کہہ دیا۔

ع کبوتر مٹّی کے گھونسلے میں ہے

شہلچہ کار فوراً سمجھ گیا اور شعر کا ایک مصرعہ بنا کر اس کے جواب میں کہا۔

ع کس طرف متوجہ ہو جاؤں ؟

قاسم :-

ع سائبان اور کھڑکی کے کنارے

شہلچہ کار :-

ع ایک بندوق ہے جو لڑائی میں استعمال کے لئے تیار ہے

قاسم :-

ع دو تیر ہیں کہ کمر میں پیوست ہوئے جاتے ہیں

مُلّا فاضل :-

ع ایک انار ہے جو آم کی طرح پک چکا ہے

آخر میں قاسم نے کہا۔

ع میرا سر اس مہ لقا پر قربان ہے

یعنی مجمع میں کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور وہ اپنا مطلب ایک دوسرے کو سمجھا گئے۔

اس دوسرے دور یا نشاۃ ثانیہ سے لے کر آج تک جن جن شعراء نے بلوچی دنیا میں نام اور شہرت پیدا کی ہے ان کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ویسے عام شعراء کی تعداد تو اس سے کئی گنی بلکہ چوگنی ہو سکتی ہے۔ ہم ان مشہور و معروف شعراء میں سے چند ایک کا نام یہاں ابجد وار درج کرتے ہیں۔

ا:- ایمن حسن ھاکی - ابراہیم حسن راسکی - اسماعیل مُلّا بادی - ابراہیم باھوئی
آدم ابراہیم رندکولواھی - ابراہیم باھوٹ شیھ کلگی

ب - مُلّا بائیان - مُلّا بھادر اومرزئی رند - بھادر مراستانی کولواھی ـــ
مُلّا بہرام - مُلّا بوھیر (اوّل) - مُلّا بوھیر (دوم)-
بیزن اومرانی -

پ - پیر نداد -

ج - جنگیان تمپی - جوانسال بگٹی - جیئنو - جینذ بیگ محمد

د - دادکریم - مُلّا داداللہ - حاجی دوشنبے - ملک دینار

ر - حاجی ربات - رگام واشی

س - سپربنڈ -

ش - شاھورکشانی - شنزی - شوراں - شھداد بنڈ چوٹائی

ص - صالح

ع - عبدالنبی دوم - عبدالنبی سوم - عزت اللہ پنجگوری (دوہانی) عثمان پنجگوری
ملا عیسیٰ گوادری - مولوی عبداللہ - عبداللہ مسکین یحییٰ - عبدالحق

غ - غلام حبیب کتگی - غلام رسول مکرانی -

ق ۔ مُلّا قاسم چاکرش ۔ قادر داد ۔ مُلّا گوھرام ۔ مرید کاٹک ۔ محمد کشکوری

م ۔ مھراب مُلّا امیر ۔ مُلّا محمد میروانی ۔ مُلّا موسٰی ۔ ملا ابراہیم راسکی ۔
مست توکلی ۔ مقصود

ن ۔ نور محمد بمپشتی

ی ۔ یار محمد زمان خان ۔ یوسف خان اور ماڑئی ۔ مُلّا یوسف

و ۔ وشدل بنڈ ۔ ولی محمد

بلوچی شعر و شاعری یا شعری ادب کے اس نشاۃ ثانیہ یا دوسرے دور کو اگر ہم بلوچی شعری ادب کا عہدِ زرّیں کہیں تو بجا ہوگا ۔ اگر ہم اس عہدِ زریں کے مشہور ترین شعرأ کا کلام کا مختصر نمونہ پیش کریں تو بھی بہت سارے صفحات درکار ہونگے اس لئے صرف چند ایک چیدہ شاعروں کے کلام کا تعارف کرانے پر اکتفا کرتے ہیں ۔

مُلّا ابراہیم حسن راسکی سردار سید خان بن سردار حسین خان شیرانی کا درباری شاعر تھا اور ہمیشہ سردار کے ہمرکاب رہتا تھا ۔ سردار سید خان کی حکومت کی سرحدیں دور دور تک پہنچی تھیں ۔ کچھ ھیچان ، بنت ، پنوچ کے علاقوں کے علاوہ مغرب میں بشکرد کا پورا علاقہ میناب تک اس کے زیرِ نگین تھا ۔ سردار نے بشکرد میں ایک شادی کر رکھی تھی جو سردار کو نہایت محبوب تھی ۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سردار متواتر چھ مہینے تک بشکرد نہ جاسکا ۔ اس کی بیوی نے یہی سمجھا کہ ہو نہ ہو سردار کسی وجہ سے ناراض ہیں ۔ ایک دفعہ سردار شکار کھیلتے کھیلتے بشکرد کی سرحدوں تک پہنچ گیا اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا ۔ سارا دن شکار اور رات کا اچھا خاصا حصہ بلوچی دیوان میں گزارتا رہا ۔ جب اس کی بیوی کو خبر ہوئی کہ سردار کئی دنوں سے بشکرد کی سرحد پر شکار میں مشغول ہے اور پھر بھی یہاں آنے کا نام نہیں لیتا تو وہ اور پریشان ہوگئی

ایک دن اس نے اپنے خدمت گار خاص کو بلا کر کہا کہ آج جاکر سردار کی شکارگاہ تک پہنچ جاؤ اور چپکے چوری سے ملا ابراہیم شاعر سے ملاقات کرکے میری حالت اس کو بتا دینا اور کہہ دینا کہ اگر سردار فوراً میرے پاس آجائے تو اس کو منہ مانگا انعام دوں گی اور تم کو اے میرے وفادار خدمت گار میں آزاد کردوں گی۔

چنانچہ خدمت گار نے وہاں پہنچ کر پیغام پہنچا دیا۔ ملّا ابراہیم نے اپنی نظم شام تک مکمل کرلی۔ اور جب رات کو سردار کھانے سے فارغ ہوکر مجلس و دیوانِ بلوچی میں آگئے تو پہلے عام کی صورت میں مختلف مواضع پر باتیں اور پھر شعر و شاعری ہوئی اور جب آدھی رات گزر گئی اور نیند سے لوگوں کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو ملّا ابراہیم نے نہایت خوش الحانی سے اپنی نئی نظم کی ابتداء کی۔ اس نظم میں وہ کشش اور دلربائی تھی۔ اور محبوب اور محبوبہ کی بے قراری کی وہ عکاسی کی گئی تھی کہ سننے والے مسحور ہوتے جارہے تھے۔ جوں جوں نظم آگے بڑھتی گئی سردار کی بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا اور نظم کے ختم ہوتے ہی سردار نے حکم دیا کہ اس کا گھوڑا تیار کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ چشم زدن میں تعمیل ہوئی۔ لوگ حیران تھے کہ کیا بات ہے؟ لیکن جب سردار نے پاؤں رکاب میں رکھکر گھوڑے کو ایڑ لگائی تو لوگ ان کو پوچھ تک بھی نہ سکے کہ کہاں جارہا ہے۔ لیکن اب سب جان چکے تھے کہ بات کیا ہوئی۔ چنانچہ باقی لوگ بھی لشکر جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ سردار کی ہمرکابی میں صرف ان کا خدمت گار خاص جا سکا کیونکہ اس کو سواری کی ضرورت ہی نہ تھی اور وہ پیدل اس صبا رفتار گھوڑے سے بھی تیز بھاگ سکتا تھا۔

سردار کی بیوی نے حسبِ وعدہ اس خدمت گار غلام کو آزاد کردیا اور ملّا ابراہیم کو انعام کے طور پر ایک خوبصورت خدمت گار لڑکی اور اپنے گلے کا ایک

قیمتی ہار اور ایک بہترین اونٹ دے دیا۔ ویسے یہ نظم جب تک پوری کی پوری نہ لکھی جائے اس کی تمام خوبیاں اُجاگر نہیں ہوتیں۔ تنگیِ دامانِ کتاب مانع ہے۔ اس لئے اقتطاف پر اکتفا کرتا ہوں۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

میں صدقے جاؤں ! اے بادِ سمین تم تر در تر بادلوں کو لے کر چھن چھناتی بوندوں کے ساتھ اپنا خرام شروع کر دے۔
لعل، یاقوت اور موتیاں نچھاور کرتے ہوئے
آڑے ترچھے پہاڑیوں اور اونچے فلک بوس پہاڑوں کے درّے اور گھاٹیوں میں سے کھسکتے ہوئے۔
پُر گنج و نعمت والے بشکرد میں کھل کر برسا دے۔
پھر وہاں ان رحمتوں کو اور بھی تیز کر کے۔
وہاں کے قلعے، محل اور بزمہائی ناز کو گلریز کر دے۔
اس ششدر یعنی حیران و پریشان اونچے محل کو معطّر کر کے میرا سلام اس ماہِ انور تک پہنچا دے۔

یہاں شاعر اس ماہِ انور یعنی محبوبہ کا سراپا، اس کا لباس، اس کے زیورات، اس کی خوبصورتی کے بارے میں پرمعنی اور احساسات اور جذبات سے لبریز الفاظ میں بیان کرنے کے بعد سردار کے گھوڑے کی بشکرد جانے کے لئے بیقراریوں کو بیان کر کے کہتا ہے ؎

؎ کل آدھی رات کی نیلگوں تاریکی میں۔
اچانک کسی آواز نے مجھے نیند سے چونکا دیا۔
کیا دیکھتا ہوں کہ میرا گھوڑا بڑی بے قراری سے ہنہناتا اور اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش میں زور زور سے زمین

پر پاؤں مار رہا ہے۔
مگر اس کو لوہے کی زنجیر اور گل میخ نے مضبوطی سے روکے رکھا ہے
آہ! مجھے فوراً احساس ہوا کہ اس اصیل گھوڑے کو اپنا وطن اور مسکن بشکرد کی یاد نے بے قرار کیا ہوا ہے۔
جو اپنی گچھے دار موٹی دُم کو بے تابی سے اِدھر اُدھر مار رہا ہے۔

یعنی تاکہ سردار کو احساس ہو کہ یہ گھوڑا بھی اپنے مسکن کے لئے کس طرح بے قرار ہے اور تو اپنی محبوبہ اور چہیتی بیوی کو بھول کر یہاں شکار میں مشغول ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے آپ کو سردار تصور کر کے اپنی غلطی کے احساس کا اظہار کرتا ہے اور فوراً گھوڑے پر زین کس کر بڑے خوبصورت اور دلآویز الفاظ میں اپنے بشکرد کی طرف سفر کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتا ہے کہ راستے کے ہر میدان ہر پہاڑ، ہر موڑ اور ندی نالے تک کا ذکر کرتے ہوئے گھوڑے کی خوبی، اس کی صبا رفتاری کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اس کی ہر صفت گنواتا ہے اور منزلیں طے کرتے ہوئے "بشکرد" پہنچ جاتا ہے اور پھر وہاں کس طرح اس کا انتظار ہو رہا ہے اور کس طرح سواگت ہوتی ہے، کچھ اس طرح نظم کیا ہے کہ اس کو سنتے ہی سردار ایک سیکنڈ کے لئے بھی رک نہیں سکتا۔
پوری نظم اگر تفصیل و تشریح سے لکھی جائے تب شاید غیر بلوچ اس سے کسی حد تک محظوظ ہو سکیں۔ بہرحال یہاں نہ ہم پوری نظم پیش کر سکتے ہیں اور اس کی تشریح کی کوئی گنجائش ہے۔
ملا ابراہیم راسکی نے کئی ایک مذہبی یا مسلمان عرب بہادروں کی بہادری

یا کسی اور خوبی کے بارے میں داستان کی صورت میں کافی نظمیں لکھی ہیں جن میں ادھم" کی نظم مشہور ہے ۔ اس کے علاوہ اپنے سردار سید خان شیرانی کی منقبت میں نظمیں کہی ہیں ۔ ایک اور شاہکار ابراہیم کی وہ نظم ہے جو اس نے "ایرپشاں" کے قلعہ کی فتح کرنے کے بارے میں کہی ہے ۔

ابراہیم باھوٹ ایک اور بلوچ شاعر ابراہیم باھوٹ شیعہ کلگی ہیں ۔ اچھے شاعر تھے ۔ اس نے کراچی میں آکر سکونت اختیار کی تھی اور یہیں وفات پا گئے ۔ ابراہیم باھوٹ نے کئی ایک اچھے مرثیے بھی لکھے جن میں سے مشہور ترین وہی ہے جو جنگِ جہانی دوم کے دوران سندھ میں حُرّوں کے ہاتھوں عبدالعزیز عثمانی، مستی خان اور انور ہدایت اللہ کی موت پر لکھا تھا ۔ اس کے اِس مرثیہ کا نمونہ اِسی مجلد میں مرثیہ کے باب میں دیا ہوا ہے ۔

مُلّا بائیان مُلّا بائیان بلوچی کا ایک ایسا شاعر تھا جس کی اکثر نظمیں مذہبی یا پند و نصائح کی ہیں ۔

اس کی ایک نظم کے چند مصرعے اس کے عقیدے کی عکاسی کرتے ہیں ۔

ے آدمیے دوستو! میں اپنے خیالات کی رو میں ایک نظم
کہہ رہا ہوں
احوال باطنی کو وہ دنیا میں آشکار کر دیتا ہے
صحیح علامات اور نشانات کے مطابق چند حکایت بیان
کرتا ہوں
کیونکہ میں خداوند کی قدرتوں سے حیران ہوں
وہ جس کو بھی خلق کرتا ہے اس کا سبب اس کے ماں باپ

کو ٹھہراتا ہے۔

اور اُس سے پھر ایک بڑی آرزو رکھتا ہے

اے بھائی تحقیق جان لو کہ یہاں کسی کو ملک اور وطن نہیں۔

یہاں سے ہر شخص بادرواں کی طرح گزر جاتا ہے

انصاف سے متعلق نوشیروان بادشاہ نے نام پایا

اور جسمانی قوت و طاقت اور زور بازو رستم کے حصے تھے

حضرت یوسف کو انتہا درجہ کی خوبصورتی دی تھی

یونس نے بطنِ ماھی میں تنگ و تاریکی کی مصیبت جھیلی

پھر آگے چل کر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے -

ے اے بابیان ہمیشہ اپنے آپ سے بے غم نہ ہو

کیونکہ اگر کبھی تو اتنا خوش ہے جتنا کہ گل گلستان میں

تو دوسری بار تم غم کے سمندر میں غوطہ زن ہو گے

کبھی ایسے بھی ہوا کہ تم پرندوں کی طرح دام میں پھنس گئے -

مُلّا بہادر

مُلّا بہادر اچھے قادر کلام شاعر تھے۔ جیسے دوسرے دور کے ہم عمر شعراء کیا کرتے تھے۔ مُلّا بہادر نے بھی کسی دوسرے شاعر کو "پسّو" (جواب) دیتے ہوئے ذیل کی نظم کہی ہے جس کے کچھ مصرعے نمونتہً پیش ہیں جس میں اُس نے دوسرے شاعر پر طنز کیا ہے۔

ے آجا اے قاصد، ان مصرعوں کو لے کر جلدی اور تیر کی طرح سیدھے جا۔

دہاں جہاں ھوت اور میر براجمان ہیں، جو دانا اور ہنر
مند ہیں
جس قدر اُس کی تعریف کی ہے وہ اس سے دو چند فخر سے
اکڑ جاتا ہے
اور اشعار کو مدہوشانہ کہتا ہے جس کی تشنیع نے ہمیں
غصہ دلایا ہے
وہ اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اپنے
کو سردار اور امیر بھی کہتا ہے

بھادر راوِ مرزیؒ دوسرا بجادر راوِ مرزیؒ دہی مَند کا مشہور مرثیہ
گو شاعر ہے جس کا ایک "موتک" (مرثیہ)
اور ایک "زھیر بگ ابھی تک بے مثال ہیں جن سے ہم نے نمونہ کے طور پر
کچھ مقتطفات پیش کئے تھے۔

مُلا بھرام مشہور شاعر مُلا بہرام نے اکثر مذہبی یا مذہبی عقائد سے
متعلق اشعار کہے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

میں سب سے پہلے اللہ کا نام لیتا ہوں صد ہزار دفعہ شکر الحمد للہ کہتا ہوں
دن رات قل ھو اللہ پڑھتا ہوں اور یقین کیساتھ آمنت باللہ کا ورد کرتا ہوں
حٰم اور سورۂ طٰہٰ کا ذکر کرتا ہوں اس کے بعد نعتِ مصطفےٰ کہتا ہوں

اِس "سرنامگ" کے بعد وہ حضرت علی کی بہادری اور کفار سے
اس کی لڑائی کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے اس کی تعریفوں کا سلسلہ یوں
جاری رکھتا ہے۔
؎ وہ شیر پہلوان حیدر مرتضیٰ جس کی سواری دُلدل ہے

اور ہاتھ میں ذوالفقار ہے جس نے خیبر کا دروازہ اکھاڑ دیا....... الخ

بوھیر جلب مُلا بوھیر بن جلب جو بوھیر اوّل کے نام سے مشہور ہے بڑے اچھے شاعر تھے۔ ویسے شھلچہ کار مُلا فاضل کے ہم عصر تھے لیکن عمر میں شھلچہ سے کافی بڑے تھے۔ اس کا بیٹا عبدالنبی اوّل کو بھی ہم شھلچہ کار کا ہم عصر کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب شھلچہ کار بانکا جوان تھے تو ملا بوھیر اوّل کبیر السن تھے اور جب شھلچہ کار نے جوانی کی منزلیں طے کرلیں تو عبدالنبی اوّل بحیثیت ایک نوجوان شاعر کے اُن سے اقتباس نور کرتے رہے۔

یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ بلوچ اکثر اپنے باپ کا نام اپنے بیٹے کو دیدیتے تھے۔ آج تک لوگوں نے اس روایت کو کسی حد تک محفوظ رکھا ہے اسی روایت کی بنا پر مُلا بوھیر بن جلب کے خاندان میں چار بوھیر اور چار عبدالنبی پیدا ہوئے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے تین بوھیر اور تین عبدالنبی شاعر تھے۔ یعنی ایک ہی خاندان میں چھ شاعر پیدا ہوگئے۔ اس کی مثال ہمیں شیراز کے شاعر خاندان وصال سے ملتی ہے۔ اس خاندان میں اسی طرح پشت در پشت کئی ایک شاعر تھے اور سب کا تخلص اپنے خاندانی نام وصال تھا پھر دوسری مثال ہمیں پشتو کے شاعر خاندان میں ملتی ہے جہاں اس خاندان کی ابتدا مشہور شاعر خوشحال خان خٹک سے ہوتی ہے۔ خوشحال خان خٹک خود تو قادر الکلام شاعر تھے ہی لیکن اس کا بڑا بیٹا اشرف خان ھجری بھی بڑا ادیب و شاعر تھا۔ اور دوسرا لڑکا عبدالقادر خان بھی شاعر تھا اور بی بی حلیمہ بھی شاعرہ تھی جو خوشحال خان کی بیٹی تھی۔

پھر افضل خان ہے جو اشرف خان ھجری کا بیٹا اور خوشحال خان کا نواسہ

تھا۔ پھر اسی افضل خان کا بیٹا کاظم خان شیدا بھی شاعر تھا۔
چونکہ بلوچی اشعار کی تدوین کا کام ابھی تک مکمل نہیں ہوا اس لئے ان تینوں بوھیروں اور تینوں عبدالنبیوں کے اشعار آپس میں گھل مل گئے ہیں اور یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی نظم کس بوھیر اور کس عبدالنبی کی ہے۔ البتہ کچھ ایسے بھی ہیں جن کی شناخت ہو چکی ہے۔ اس خاندان کی چیستان گوئی بھی بہت مشہور ہے۔ نمونے کے طور پر دو چیستان پیش ہیں۔

مُلّا بوھیر بن حلب کی ایک چیستان ہے۔

؎ شیخ صاحب با تاج زرنگار　　اور جو غالیچہ کی طرح رنگ برنگ ہے
جو مالکی کی اونچی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے　　تعلیم کسی سے نہیں پاتا لیکن بن جاتا ہے مُلّا

اس کا جواب ہے "تیلی" تیلی کو بلوچی دوسرے ناموں کے علاوہ مُلّا بھی کہتے ہیں۔

عبدالنبی سوم کا ایک چیستان بھی ملاحظہ ہو۔

؎ دریا میں میں نے ایک نہنگ دیکھا ہے　کہ اس نے اپنے منہ میں
ایک گوہر پکڑا ہوا ہے
عجب چیز یہ ہے کہ اس کو پیٹ تو ہے نہیں مگر وہ دریا کو پی
جاتا ہے

اس کا جواب ہے "تیل اور بتّی ــــ لالٹین۔"

شہلّیچہ کارلآ فاضل، مُلّا عبدالنبی اوّل اور بہادر مراستانی اور نور محمد بمپشتی دادو بردی ہم عصر تھے۔ اس زمانے میں شعری مقابلے کا طریقہ عام تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک بہت ہی بڑا طوفانِ باد و باران ہوا۔ اس طوفان کے بارے میں شعری مقابلہ ہوا تو ان تینوں شعراء نے اس پر طبع آزمائی کی اور کامیابی سے بہترین نظمیں لکھی گئیں۔

یہ تینوں نظم ایک ہی بحر میں منظوم ہیں۔ (شاید یہ وہی طوفان ہے جو دشت (مکران) میں "شدری ءِ ھار" کے نام سے مشہور ہے۔

نمونۂ کلام

پیر زناد اگرچہ ان مندرجہ فوق تین گرامی شعراء سے بہت بعد کا شاعر تھا لیکن اس نے بھی ایک ایسے ہی طوفان کا کامیاب نقشہ منظوم کیا ہے۔ پیر زناد کا طوفان کراچی سندھ سے متعلق ہے جیسے کہ اس نے کراچی کی ندی اور نالے کے ساتھ دیگر نشیبی علاقوں کے بہہ جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ حمد و ثنا کے بعد کہتا ہے کہ

؎ صفر کا مہینہ روز شنبہ تھا کہ
خدا کی قدرت سے نہ جانے کہاں سے برستے بادل اٹھ آئے
اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر ہر طرف سے چھا گئے
نہ کوئی گرج تھی نہ چمک بس خاموشی سے موتی برسنے
لگے
پورے چار گھنٹے اس طرح برسے کہ ایک سیکنڈ کے
لئے کم نہ ہوئے

پھر کوھن کور، گدّ آپ اور لال بکّر ندیوں کا نام لے کر کہتا ہے۔

؎ ان کے بعد سیلاب نے آم اور دیگر میوہ جات کے
پھل سے لدے پھندے درختوں کو تنکے کی طرح
بہا دیا،
کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیا
بڑے بڑے بند توڑ ڈالے
گائے، بیل، بھینس اور جو کچھ بھی سامنے آیا بہہ گئے

اس کے بعد شہ کور اور اوڑنگی، گجڑو کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بانگوری، لالوکیٹ اور لدی بازار، گولیمار، گڑاور پشتیُ میتگ سب زیرِ آب ہوگئے۔ اور آخر میں بائیان نامی ایک شخص کا ذکر بھی کیا کہ جو اپنے تختے اور لکڑی کے بنے ہوئے گھر کے اوپر جا بیٹھا تھا تاکہ سیلاب کا پانی اس تک نہ پہنچ سکے لیکن سیلاب کے پانی میں اتنا زور تھا کہ بائیان کے گھر کو ہی صحیح سالم اکھاڑ کر بہالے گیا۔ کراچی کے بلوچ ابھی تک اس طوفان کو "بائیان ءِ ھار" (بائیان کا سیلاب) کہتے ہیں۔

ملاّ غلام حبیب کُنتگی پیشنؔ (ایرانی بلوچستان) کا رہنے والا تھا۔ پیشن پاک مکران کے مند تحصیل کی سرحد پر ہے۔ یہ ملاّ اسماعیل پلاّبادی (وفات ۱۹۷۰ء) کا ہم عصر تھا۔ ان دونوں کی ہمیشہ نوک جھونک رہی تھی اور ہمیشہ ایک دوسرے کے نام اشعار لکھ کر بھی دیتے تھے۔ اسی طرح کی ایک نظم کا کچھ حصہ نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو جو غلام حبیب نے ملاّ اسماعیل پلاّبادی کے نام لکھ کر بھیجا تھا۔

ے عجیب بات ہے کہ آج کل زاغ بھی بلبل کی نقل اتارنے لگا ہے۔

ایک تو حمزہ ہے اور دوسرا دہی نوآموز ملاّ
دونوں نے عجب اشتراکِ عمل سے کام لیا ہے
اور اپنے آپ کو سخن دروں کا ہم آورد سمجھتے ہیں۔
سیدھے ہاتھ لکیر کھینچنا تک تو نہیں آتا
مگر شاعری کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنے آپ کو جامی کی نظیر

سمجھتے ہیں
جو کبھی بھی قابلِ اعتبار نہیں ہے
تُم جیسے ملاؤں کو شاعری سے کیا نسبت ہے ؟
کیونکہ شاعری اتھاہ سمندر میں شناوری ہے
اور تم تو اپنے مُلّا بادی والے کاریز میں ڈوب کر مر جاؤ گے
پھر بھلا تم کو غواص بننے اور موتی نکالنے سے کیا نسبت
میں نے تمہاری پہلی نظم میں ہی تمہاری دانشوری دیکھی ہے
تم نے مولوی داد محمد کی تعریف کی میں اس کو نہنگ کی صفت
دے کر خان کی نظیر کہتا ہوں
لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ عقل و دانش خدا کی دین ہے
اور فربہی اور موٹاپن تو دانش پروری نہیں ہے
اے مُلّا تم اگر اطلس و دیبا اور کمخواب پہن لو
اگر تم تہران کے بادشاہ سے برادر نسبتی رکھو
اور اپنے سر پر سنہری تاج رکھ لو
اور اگر تمہیں رستم کا گُرز اور خنجر بندھا ہو
ضحاک، خسرو کی فوج بھی تمہاری ہو جائے
جمشید کا مُرکب اور فریدوں کا زرہ تم پہن لو ....
وغیرہ وغیرہ
اس کے باوجود تم پھر بھی ہمارے مقابلے میں ہیچ ہو
اس لئے تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ ٹمٹماتی ایک آگ
جلا کر

باجرہ کی روٹی پکا کر کلیٹر (ایک سبزی) کے ساگ کے ساتھ خاموشی
سے کھالے۔

اور اگر مزید دل چاہے تو ایک عدد لوجر (سارڈین) اوپر سے
کھالے

اس کے اوپر پانی پی کر ایک "ھاری" کی طرح بیٹھ جا
یا لاٹھی لے کر بھیڑ بکریاں چرالے .... الخ

قدیم طرز شاعری اور شعراء کے بعد ہم دور جدید کی طرف متوجہ ہوتے ہیں
اس دور کے آغاز سے لے کر آج تک کافی تعداد میں نئے شعراء وجود میں آئے ہیں
جن کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ ہم پوری فہرست تو یہاں لکھ نہیں سکتے لیکن
کچھ مشہور شعراء کے نام کا تذکرہ ضروری ہے۔ ذیل میں ہم کچھ جدید شعراء کا نام
ابجد کی ترتیب سے لکھتے ہیں۔

انور قمطانی ۔ انور صاحب خان ۔ اکبر بارکزئی ۔ آدم حقانی ۔ احمد جگر
احمد زہیر ۔ آزات جمالدینی ۔ اشرف سربازی ۔ اسماعیل ممتاز
بشیر بیدار ۔ کریم دشتی ۔ گل خان نصیر ۔ ملک محمد طوقی ۔ محمد حسین عنقا
صدیق آزات ۔ عطا شاد ۔ عبدالغنی پرواز ۔ غوث بخش صابر
ظفر علی ظفر

اس دورِ جدید کے شعراء کی تعداد سو سے اوپر ہے اور تقریباً بنیادی طور
پر تمام غزل گو ہیں البتہ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن پر
طبع آزمائی کی ہے۔ اور تقریباً سب کا کلام کسی نہ کسی بلوچی مجلّہ یا روزنامہ میں
شائع ہوتا رہا ہے۔ ان شعراء میں اکثر ادیب بھی ہیں۔ یعنی نثر نگاری میں بھی
انہی کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ دورِ جدید کے نثر نگار تو بہت ہی سارے

ہیں۔ البتہ چند چیدہ ادیبوں کا نام قابلِ ذکر ہے ۔

۱۔ عبدالقادر شہوانی ۲۔ ابراہیم نگوری ۳۔ صورت خان مری

۴۔ مٹھا خان مری ۵۔ شیر محمد مری ۶۔ تاج محمد تاج مرحوم

۷۔ نسیم دشتی ۸۔ ملک محمد پناہ ۹۔ عبداللہ جان جمالدینی

۱۰۔ نعمت اللہ گچکی ۱۱۔ محمد خان مری ۱۲۔ بشیر احمد بلوچ

۱۳۔ امان اللہ گچکی ۱۴۔ عبدالقیوم

اگرچہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۵ء تک کراچی ریڈیو اسٹیشن اور اس کے بعد ۱۹۵۶ء سے آج تک ریڈیو اسٹیشن سے بلوچی پروگرام نشر ہوتے رہے لیکن اس ادارے کے ذریعہ نثری ادب کا کوئی حصہ ایسا سننے میں نہ آیا جس کو واقعی بلوچی لٹریچر کہا جائے جو بلوچی زبان و ادب اور اس کے خیالات، انداز، مزاج اور تراکیب کی انفرادیت کو منوا سکے ۔ البتہ کراچی کے پروگراموں میں کچھ ایسے اِکے دُکے ادب پارے ضرور موجود تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ اس وقت میری دسترس سے دور ہیں اور مثال پیش کرنے سے قاصر ہوں ۔

دوسری چیز ادبی مجلات ہیں ۔ ماہنامہ اومان، ماہنامہ بلوچی، ھپتگی نوکیں دور، ماہنامہ اُلس، اور زمانہ بلوچی میں گزشتہ ربع صدی کے دوران ہر موضوع پر بلوچی نثر نگاری ہوتی رہی ۔

ان مجلات میں نشر شدہ مضامین، مقالات وغیرہ سے اگر اس کا ایک جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آجائے گی کہ ان میں مذہب، قوم، ملت، ملک، تاریخ، سیاست، شخصیات، روایات، افسانہ، زبان، ادب، شاعری، تنقید، تبصرہ، طنز و مزاح اور تقریباً ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہے ۔ علاوہ ازیں غیر بلوچی کئی زبانوں کے متعدد مضامین، قصے، افسانے اور مقالے بلوچی میں

ترجمہ کئے گئے ہیں ۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں بڑی حد تک کامیابی نصیب ہوئی ہے ۔ البتہ ان میں ہمیں وہ چیز کم ملتی ہے جس کو ہم بلوچی زبان و ادب کا شاہکار کہہ سکیں یا کم از کم بلوچی زبان کی خصوصی صفات کا حامل سمجھیں ۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگ سب کے سب غیر بلوچی زبان میں تحصیل کر چکے ہیں ۔ ہماری تاریخ میں ہمارا ذریعہ تعلیم ہمیشہ عربی، فارسی، اردو، سندھی اور آخر میں انگریزی رہا ہے ۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس زبان میں کوئی تعلیم حاصل کرتا ہے اسی زبان کی ہر شے اسے بھلی لگنے لگتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نثر نگار اس سلسلے میں فارسی، اردو اور انگریزی کی تقلید میں خیالات اور مزاج کے ساتھ ساتھ جملوں اور تراکیب تک کو ان زبانوں کے روپ میں ڈھالتے، ہچکچاتے تک نہیں ۔

باقی مضامین لکھتے وقت تو نفسِ مضمون سے متعلق کچھ ایسی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں کہ ان کی طرف زیادہ دھیان پڑتا ہے مگر افسانے، حکایات، سرگزشت رپورتاژ اور دوسری فلسفیانہ یا حکمت آموز ایسی تخلیقات میں تو زبان کا مزاج اور اس کی روایات برقرار رکھنا انتہائی ضروری ہوتی ہے ۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ ہر قلم کار بالعموم اس پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔ جیسے کہ ہر زبان میں ایسے لکھنے والے بہت ہی کم ملیں گے اور وہ اسی وجہ سے مشہور و معروف ہونگے ۔ بلوچی ایسی فصیح و بلیغ زبان پر اگر کوئی حاوی ہو جائے تو وہ معمولی سی چیز کو ادبی شاہکار بنا سکتا ہے ۔

گزشتہ ربع صدی میں جتنی ادبی چیزیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں سے چند ایک ایسی ہی خصوصیات کی حامل ہیں ۔ یہاں میں کچھ ایسے ہی ادبی ٹکڑے ترجمہ کرکے نمونے کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ بلوچی اشعار کے ترجمے کے ضمن میں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بلوچی ادبی نثر پر بھی صادق آتا ہے کیونکہ

ترجمہ کرنے سے بلوچی زبان کی وہ روح باقی نہیں رہتی جس کے بارے میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب تک کوئی بلوچی زبان ہی سے آشنائی پیدا نہ کرے۔ وہ اس کی ادبی لذتوں سے محروم ہی رہے گا۔

ماہنامہ "بلوچی" میں "بلوچ دوچ" کے زیرِ عنوان ایک مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کا لکھنے والا عبدالواحد آزات جمالدینی ہے۔ ویسے مضمون کا بنگپ یا سبجکٹ تو بلوچی سوزن کاری (کڑھائی) ہے لیکن اس کے ابتدائی دو ایک پیراگراف میں بلوچی ادب کی وہ جھلک ملتی ہے جس کو ہم ادب پارہ کہنا چاہتے ہیں۔ جیسے کہ پہلے کئی جگہ کیا جا چکا ہے کہ ترجمہ تو ادبی روح کا گلا گھونٹ دیتا ہے بہرحال ترجمہ حاضر ہے۔

"وہ بچپن کی باتیں کس طرح نقش بدل ہوتی ہیں۔ مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے۔ گرمیوں (بشّام) کی بارشوں کے پُرکیف دن تھے اور ابتداءً جو ہر شام بادل باقاعدگی سے ایک ہی طرف سے اُٹھتے، گرجتے برستے ہوئے گزر جاتے تھے۔ اب بتدریج ان کا وقت تبدیل ہوتے ہوتے نسیم سحر کے ہم رکاب تھے۔"

"ایسی ہی ایک صبح بادل برس کر چھٹ گئے اور نیلگوں دُھلا آسمان صاف ہو گیا تھا۔ گھر کے سامنے روز روز کی بارش کی وجہ سے ایک تالاب سا بن گیا تھا۔ گھر کے سامنے ماہ گل بیٹھی کپڑے پر سوزن کاری کر رہی تھی۔ نیلے آسمان میں بہت دور اونچائی میں ایک کوّے کے کائیں کی آواز آئی۔ ماہ گل نے سوئی کپڑے میں اُڑس کر چھوڑ دی اور اپنے دونوں ہاتھوں کی "شیپگ" جیسی صاف اور "گوشّ" جیسی سفید انگلیوں کو دونوں ہتھیلیوں کی پچھلی طرف سے ایک دوسرے میں ملا کر

اپنے دونوں ملے ہوئے گھٹنوں کے پار رکھ کر اپنی طرف ذرا کھینچ لیا اور
اس کی انگلیوں سے عجیب ہم آہنگ چٹخنے کی آواز نکلی۔ ماہ گل کی بڑی
بڑی آنکھیں اوپر اُٹھیں۔ اور اس نے اوپر کوّے کی طرف دیکھا۔ کوّا دور
آسمان میں پرندے کے ایک پر کی مانند نظر آرہا تھا۔ کوّے نے دوسری
بار کائیں کی آواز نکالی اور ماہ گل کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔
" جی جی، پیارے کوّے کوئی خوش خبری سُنادے۔" یہ کہتی ہوئی نجانے
کیوں ماہ گل کی بادامی موٹی سرخ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے
اپنی نگاہیں وہاں سے ہٹا کر سوئی کپڑے سے نکالی اور دوبارہ اپنے کام میں
مشغول ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کی موٹی موٹی بوندیں ڈھلک
ڈھلک کر اس کے گھٹنوں اور ان پر رکھے ہوئے کپڑوں کو بھگو رہی تھیں۔
اور پھر اس نے اپنی مترنم آواز میں ایک پُر سوز زھیریگ (فراقیہ گیت)
شروع کیا۔"

بلوچی زبان کے رمکار (نثر نگار) ادیبوں میں امان اللہ گچکی کا ایک منفرد
طریقہ ہے۔ ان کا طرز نگارش بہت دلکش ہے۔ علاوہ ازیں امان کی تحریر بلوچی
ادب میں اپنے صحیح روپ اور مزاج کے نمایاں کرنے کی کوشش کی غمازی کرتی ہے۔ وہ
سیدھی سادی باتوں کو بڑی دلآویز بلوچی ترتیب و ترکیب کے ساتھ رنگینی بخشتا ہے۔
امان اللہ کا مضمون "یاتانی ارس" (یادوں کے آنسو) اس نے لالہ غلام محمد شہوانی
مرحوم کے بارے میں نہایت دلکش پیرایہ میں لکھا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو وہ یوں
شروع کرتا ہے۔

" پھولوں کی موت کا موسم آگیا۔ صبح ایک ٹھنڈی ہوا دبے پاؤں
پہنچ جاتی ہے۔ جیسے ایک بے ماں یتیم بچّے کے رونے کی آواز اس کے

پروں کی آواز کے ساتھ ہوا اور ماحول میں موت کے کافور اور مشک کی سوندھی بُو ۔ یہ ہے پھولوں کی موت کا موسم اور جب پت جھڑ آپہنچا تو پھولوں کے ساتھ لالہ (غلام محمد) بھی مرگیا ۔ لیکن یہ دیر بہت کی بات ہے ظالم سمے نے اُس کی یاد پر بھی دنوں اور مہینوں کے گرد و غبار ڈال دیئے وہ مرگیا ہے ۔ میں جی رہا ہوں ۔ جی رہا ؟ کون جی رہا ہے اور کون مرگیا ہے ؟ کس کو خبر ــ ؟ (نوکیں دوز)

بلوچی زبان کے دو ادیبوں کے نام اس سلسلے میں خاص طور پر لینا چاہتا ہوں ۔ ایک صورت خان مری اور دوسرا شیر محمد مری ان دونوں نے جب کبھی بھی چاہا تو اپنے نوشتوں میں خالص بلوچی فکر و خیال اور مزاج کو اجاگر کیا ۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ دونوں حضرات اپنے علاقے کے اُس مخصوص لہجے (dialect) میں لکھتے ہیں جو باقی پچانوے فیصد بلوچستان کے لہجے سے مختلف ہے ۔ جیسے کہ نفس مضمون میں "مری" لہجے کے بارے میں بحث ہوئی ہے ۔ اس لہجے پر سندھی ، سرائیکی ، پنجابی کا اتنا اثر ہے کہ بلوچی زبان مسخ ہو کر رہ گئی ہے ۔ ان بیرونی زبانوں کے الفاظ نے اس علاقے کی زبان کا دو تہائی حصّہ اپنا لیا ہے اور باقی ایک تہائی حصّہ کے بلوچی الفاظ کی صورتیں اور لہجے بگاڑ دیئے ہیں جہاں بلوچی کے خالص اچھے اچھے الفاظ بھی اس بگڑی صورت اور بگڑے اِملا اور بگڑے تلفظ میں لکھے جارہے ہیں ۔ اگر صورت خان مری اور شیر محمد کے یہ مضامین عام بلوچی زبان میں ہوتے تو ان سے لوگ بہت بہرہ ور ہوسکتے اور ان کی اپنی صلاحیت بھی ادبی دنیا میں روشن اور اجاگر ہو جاتی ۔ صورت خان مری کے مضمون کے معنی گھیگریں سرءَ گُڈایت " (یعنی کون میر امتمرو سر قلم کرسکتا ہے) کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

" تپتے بیابانوں کا متمرو بلوچ اگر ایک طرف کارزار کے تلخ میدان

میں شیرِ غزآں بیشہ کی طرح دھاڑتے اور پنجہ مارتے ہوئے موسم گرما کے بادلوں کو بجلیوں کی طرح جلاتے جھلساتے اترتا ہے تو وہی سیاہ جگر بلوچ کڑکڑاتی سردیوں کی یخ بستہ آدھی راتوں کو تڑپتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی محبوبہ کے در پر پہنچنے کا بھی عادی ہے ۔" (آکس)

حاجی عبدالقیوم نے ویسے کئی ایک سبجکٹوں پر لکھنے کی کوشش کی لیکن ان کو صرف ایک موضوع پر کامیابی ہوئی ۔ کچھ مدت پہلے اُس نے اس خاص موضوع پر چند ایک ایسی چیزیں لکھیں جن میں گھریلو زندگی اور طبقاتی نظام اور مقامی افسروں کی فرعونیت کی عکاسی کی گئی ہے ۔ ویسے اور لوگوں نے بھی اس ضمن میں کوششیں کی ہیں لیکن بلوچی زبان کی روح اور اس کے مزاج کو برقرار رکھ کر قیوم نے اپنی نگارشات میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے ۔ یہاں میں "دشّن گپتی" کے زیرِ عنوان ایک مکالمہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں ۔ یہ مکالمے ایک بڑے گھر کی مالکن اور اس کی خادمہ کے درمیان ہوتا ہے اور پھر گھر کا مالک بھی پہنچ کر اپنا کردار بیان کرتا ہے ۔ دیکھئے !

" بی بی ! میں چلم میں پانی بھر کر لائی ہوں ، ذرا نلکے اور گگی تو دیکھ لے ۔"

" لگا دے اپنے منہ کو ! گویا میں جھوٹ بول رہی ہوں اور تُو سچ بولتی ہے ۔

" بی بی ! دوبارہ پانی بھر دوں ۔ ؟

(غصہ سے نقل اتارتے) دوبارہ پانی بھر دوں ؟ میں تیری آنکھیں نکال دوں گی ۔ موٹے ہونٹ والی ! بس ذرا ٹھہر بیٹا اس جان کے والد کو آنے دے ۔ اگر میں تجھے داغ نہ دوں تو میرا نام نہیں ۔ تو ہمیشہ مجھے جھٹلاتی ہے ۔ یہ تم سب خادماؤں کی عادت ہے ۔ ہو تم سب کام چور

اور جھٹلاتی ہو بیگمات کو۔ لیکن دیکھ لے میں تیری سات پیڑی تک کی بنیاد ختم کروں گی کرنا۔

پٹاں جاں کی ماں ! تُو نے سُن لیا ؟ کہاں ہے تُو ؟ دیکھا آج کل لوگ کتنے زبان دراز ہو گئے ہیں۔

میں یہاں اندر ہوں۔ یہ خادمہ تو ہمیں کب کچھ سُننے دے گی ! کون ہے وہ ؟ کون ہے ؟ تو تم نے اس کا سر قلم نہ کروایا ؟

میں نے سر تو نہیں کاٹا، لیکن اس کا منہ ضرور کالا کیا ! آئندہ اس کی سات پشت تک کو یاد رہے گا کہ نائب کون ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ تُو اندھا تو نہیں کہ نائب صاحب گزر رہے ہوں اور تم اُٹھ بھی نہیں جاتے۔ تو بیگم پتہ ہے اس نے کیا کہا ؟ اس نے کہا، سرکار بہت دُور تھے میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ اور میری آنکھیں "گور پات" پر جمی تھیں۔"

(اُلس۔ کوئٹہ)

نعمت اللہ گچکی بلوچی کے جدید ادب میں کامیاب ادیب اور افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اُن کے افسانے بہت ہی مختصر لیکن جامع اور مکمل ہوتے ہیں۔ آج تک نعمت کے جتنے افسانے میری نظر سے گزرے ہیں سب میں دوسری خوبیوں کے سوا بلوچی ادب و زبان و روح و مزاج بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور لکھنے والے بھی ہیں جو بلوچی لکھتے وقت صرف بلوچی ہی میں سوچتے ہیں اور بلوچی انداز میں لکھتے ہیں جن کے نوشتوں کو ہم بلوچی لٹریری قطعات کہہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں میر محمد بخش مری، عنبر پنجگوری کے نام بھی ہم لے سکتے ہیں۔

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس سلسلے میں کچھ اور مقتطفات پیش کرتا۔ بہر حال بلوچی زبان کا جدید نثری ادب بھی کسی حد تک اپنا راستہ سیدھا کر چکا ہے اور تقریباً

ایک نئے موڑ پر پہنچنے ہی والا ہے۔ اگر طباعت ونشر واشاعت کی سہولتیں میسر آجائیں تو بلوچی جدید نثری ادب بڑی ثابت قدمی سے نہایت قلیل مدت میں دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ہم ردیف ہو جائے گا۔

آخر میں تمام بلوچی ادبا و شعراء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ متحد اور متفق ہو کر خلوص کے ساتھ بلوچی زبان کی خدمت کریں۔

مرکزی حکومت سے ہمارا پُرزور مطالبہ ہے کہ وہ بلوچی زبان کو پاکستان کی دوسری صوبائی زبانوں کی طرح وقعت دے کر اس کے حقوق پائمال نہ ہونے دے۔ اور جس طرح کوئٹہ کے ایک محدود علاقہ کے لئے ایک مخصوص اور محدود انجمن "بلوچی اکیڈمی کوئٹہ" کو سالانہ گرانٹ دس بارہ سال سے جاری کیا گیا ہے۔ دوسرے صوبوں کے بڑے شہروں میں اسی قسم کی دوسری بلوچی ادبی جماعتوں کے لئے بھی یہ علمیات و امدادات جاری کرنی چاہئیں۔ اسی طرح ہم صوبائی حکومتوں سے اور خصوصاً سندھ اور پنجاب حکومتوں سے بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان صوبوں میں جہاں بلوچوں کی بھاری آبادی ہے بلوچی زبان کو اس کا جائز مقام دیا جائے اور اس زبان کی ترقی کے لئے صوبائی گرانٹ جاری کیا جائے۔ علاوہ ازیں کراچی اور حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن اور کراچی ٹیلی ویژن کے پروگرام میں مناسب جگہ دی جائے۔

قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ بلوچی زبان و ادب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہم درمیان میں بلوچی زبان سے متعلق چند ایک حقائق کے اظہار پر مجبور ہو گئے۔ اس کے ساتھ مجھے اس مضمون کی تشنگی کا اب بھی شدید احساس ہے جس کی کمی کسی اعادہ کے موقع پر دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔

سید ھاشمی

۷ ستمبر سنہ ۷۳ء

سید ہاشمی اکیڈمی۔ پوسٹ بکس ۱۶۴۱۶ لیاری کراچی